بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو میں منقبت نگاری

تحقیقی مقالہ

برائے پی ایچ۔ڈی

مقالہ نگار
احسن زیدی
گورنمنٹ اسلامیہ کالج فیصل آباد

نگران
ڈاکٹر وزیر آغا
۵۸ سول لائنز سرگودھا

بہ اجازت پنجاب یونیورسٹی مراسلہ ۸۱۳/جی۔ایم، مورخہ اکتیس جولائی ۱۹۷۹ء

فہرست

حـرف آغـاز

اردو مین مـذهبی شاعری کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ حمـد ، نعت ، منقبت ، مرثیہ، سـلام اسی مذہبی شاعری کی مختلف شاخین ہین۔ ہمارے پرانے شاعرون نے حمـد خدائے ذوالجـلال، نعت رسول مقبول اور منقبت ائمـہ اہل بیت و خلفائے راشـدین و مشائخ طریقت سے اپنے دواویـن کا آغاز کیا۔ بعض نے رسمی طور پر محض حصول ثواب و خیر و برکـت کے لئے ایسا کیا اور بعض نے ان ہستیون سے اپنی محبت اور عقـیدت کے اظہار کے لئے یہ پیرایہ اختیار کیا۔ نعـت اور مـرثیـہ پـر ہمارے اہل قـلم نے بہت کام کیا ہے ۔ تحقیقی مقالون کے علاوہ بھی کئی کتابین اور مضامـین تحریـر کئے ہین لیکـن اردو مین منقبـت نگاری کے موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ مقالہ اس کمی کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے ۔

اردو کے بیشتر شعرأ نے مناقب لکھے ہین۔ ان سب کا ذکر اس مقالے مین نہین کیا گیا کیونکـہ یہ مقالہ تذکرہ نہین ہے ۔ کوشش کی گئی ہے کہ منقبت نگاری کا کوئی اہم رجحان چھوٹ نہ جائے۔ ہر دور کے نمائندہ رجحانـات اور اسالیب کو سامنے رکھ کر منقبت نـگاری کا جائزہ لینا میرا مقصـد تھا۔ امیـد ہے کہ اس مقالے کا مطالعـہ کرتے ہوئے اس مقصـد کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

مجھے اس بات پر فخـر ہے کہ یہ مقالـہ ڈاکٹر وزیـر آغـا صاحب کی نگـرانی مین لکھا گـیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جس بلنـد سطح پر مجھے لے جانا چاہتے تھے شایـد مین وہان تک پہنچ نہین پایـا لیکـن مین نے ان کی ہـدایات کی روشـنی مین اپنا راستـہ متعـین کرنے کی کوشش ضـرور کی ہے ۔ مین ان کی رہنمائی، شفقـت اور محبـت کے لئے ان کا بے حـد ممنـون ہـون ۔

اپنے احباب مین سے مین ڈاکٹـر انـور محمـود خالـد ، ڈاکٹـر ریاض مجـید ، ڈاکٹر انورسدیـد

اور ممتاز عالم دین الحاج صائم چشتی کا خاص طور پر احسان مند ہوں جنہوں سے کتابوں کی فراہمی میں میری اعانت فرمائی ۔ ان کے تعاون کے بغیر تحقیق کا مرحلہ سر کرنا میرے لئے ممکن نہ ہوتا۔ میرے عزیز دوست غفور خان بھی میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔ ان کی ذات میرے لئے ہمیشہ قوت و توانائی کا سرچشمہ رہی ہے۔

احسن زیدی

۲۹ اکتوبر ۱۹۸۳ء

اجمالی خاکہ

باب اوّل۔ منقبت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم۔ حمد۔ نعت ۔ مدح اور منقبت کا فرق منقبت کی شخصیات ۔ اھل بیت اطہار ۔ خلفائے راشدین ۔ اولیائے کرام ۔ منقبت کے مآخذ قرآن اور حدیث ۔ منقبت کے مضامین ۔ بزرگان دین سے عقیدت کا اظہار ۔ حصول ثواب اور نجات اخروی۔ اعانت طلبی بالواسطہ رسول اکرمؐ سے اظہار محبت ۔ تحفظ ناموس بزرگان دین ۔ منقبت نگاری کے مجلسی اور دیگر ذیلی محرکات ۔ عرس سماع منقبتی مشاعرے ۔ اخبارات و رسائل کو قومی اور ملی ایڈیشن ۔ منقبت اور مختلف اصناف سخن ۔ سلام ۔ قصیدہ ۔ مرثیہ اور منقبت کا فرق ۔ منقبت کے لئے مختلف ہیئتوں کا استعمال ۔ مذھبی شاعری اور پروپیگنڈا ادب ۔

باب دوم۔ عربی شاعری، ظہور اسلام سے پہلے۔ عربی شاعری، ظہور اسلام کے بعد ۔ عربی کی پہلی منقبت ۔ حسان بن ثابت ۔ کعب بن زبیر ۔ ابوالاسود دوئلی۔ بنوامیہ کا دور، فرزوق کمیت اسلامی۔ ابونواس ۔ امام شافعی۔ عربی منقبت نگاری کا جائزہ ۔ فارسی میں منقبت نگاری ۔ فردوسی۔ ناصر خسرو ۔ منقبت نگاری کا نیا موضوع تصوف ۔ سنائی۔ خاقانی فریدالدین عطار۔ مولانا روم ۔ سعدی عراقی۔ حافظ شیرازی ۔ جامی۔ محتشم کاشی ۔ قاآنی۔ برصغیر کے فارسی گو شعراءؔ۔ امیر خسرو۔ عرفی۔ غنیمت کنجاھی۔ بیدل، غالب، فارسی منقبت نگاری کا جائزہ ۔

باب سوم۔ دکن کا سیاسی، معاشرتی اور مذھبی ماحول۔ اردو کا پہلا منقبت نگار نظامی۔ منقبت نگاری کے رجحانات ۔ خلفائے راشدین کی مدح ۔ اھل بیت کی تعریف ۔ بزرگان دین کی توصیف ۔ وجہی۔ نصرتی۔ محمود بحری ۔ شیخ باجن ۔ غواصی۔ ابن نشاطی۔ مشرتی علی عادل شاہ ۔ عبدل۔ امین ۔ غلام علی۔ ملک خوشنود ۔ شاہ برھان الدین۔ جانم شاہ امین اعلیٰ۔ فیروز ۔ شیخ عبدالقادر جیلانی اور خواجہ بندہ نواز کے مناقب ۔ قلی قطب شاہ اور ولی دکنی۔ محمد باقر آگاہ ۔ دکنی دور کی منقبت نگاری کا جائزہ۔

باب چہارم۔ (۱) شمالی ہند کا سیاسی، معاشرتی اور مذہبی ماحول ۔ سودا اور میر کا عہد۔

سودا ۔ میر۔ قائم چاندپوری ۔ میر حسن ۔ مصحفی ۔ جوشش عظیم آبادی۔ غالب۔

مومن ۔ بہادر شاہ ظفر ۔ داغ ۔ تنقیدی جائزہ

باب پنجم۔ نظیر اکبر آبادی

باب ششم۔ لکھنؤ کا سیاسی، معاشرتی اور مذہبی ماحول۔ ناسخ ۔ منیرشکوہ آبادی ۔ اردو مرثیہ

میں منقبت کے نقوش ۔ ضمیر ۔ انیس ۔ ادبیر۔ امیر مینائی ۔ عزیز لکھنوی ۔ دبستان

لکھنؤ کی منقبت نگاری کا جائزہ

باب ہفتم ۔ برصغیر کا سیاسی، معاشرتی اور مذہبی ماحول ۔ مولانا احمد رضا خان ۔ حسرت موہانی

علامہ اقبال ۔ جوش ملیح آبادی ۔ جمیل مظہری ۔ حفیظ جالندھری

عصر جدید کی منقبت نگاری کا جائزہ

بـــاب اوّل

تمہیدی مباحث

لغوی اور اصطلاحی مفہوم

منقبت عربی زبان کا لفظ ہے اس کا مادہ (ن ۔ ق ۔ ب) ہے مناقب اسکی جمع آتی ہے ۔ نقب کی مختلف صورتوں پر بحث کرتے ہوئے المنجد[نمبر1] کے مؤلف نے اسکی کئی معنوی پرتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔

۔ نقب نقباالحائط = دیوار میں سوراخ کرنا ۔

۔ نقب نقابہ علی القوم صار نقیبا علیہم = قوم کا سردار

۔ تنقب بہت تحقیق اور کرید کرنا ۔

۔ النقیب جمع نقبا شاھد القوم و ضمینہم و عریفہم و سید ہم سمی بذالک و لانہ ینقب عن امور ہم ۔

قوم کا گواہ ۔ قوم کا ضامن ۔ قوم کا عریف (نمبر دار) قوم کا سردار ۔ یہ نام اس کا اس لئے ہے کہ وہ ان کے امور میں نقب لگاتا ہے یعنی ان کے امور کی تحقیق اور کرید کرتا ہے ۔

۔ المنقب الرجل العالم با لا شیاءا لکثیر ا لبحث ۔ عنہا و التنقیب علیہا ۔

بہت زیادہ تحقیق و تجسس اور بحث کرنے والے عالم ۔

۔ المنقبہ ج مناقب = الفعل الکریم ۔

مناقب الانسان ما عرف بہ من الخصائل الحمیدہ والا خلاق جمیلہ ۔

انسان کے مناقب: وہ خصائل حمیدہ اور اخلاق حمیدہ ہیں جن سے وہ پہچانا جاتا ہے

لغات الحدیث میں اس لفظ کی وضاحتیں یوں ائی ہیں ۔

۔ نقب پھاڑنا ۔ سوراخ کرنا ۔ تفتیش کرنا ۔ جانا ۔ پیوند لگانا ۔

۔ نقابتہ نقیب بننا (یعنی نگران حال ۔ خبر رکھنے والا)

۔ نقب پھٹ جانا ۔ ننگے پاؤں ہونا ۔

تنقیب چلنا ۔ جائے پناہ کے لئے خوب ڈھونڈنا ۔ تلاش کرنا ۔

مناقبتہ اور نقاب = مناقب بیان کر کے دوسرے پر فخر کرنا ۔

نمبر1 مطبوعہ بیروت ص 829

انقابٌ   چلنا ، حاجب یا نقیب بننا ۔

منقبہ   تعریف اور فضیلت کا کام جیسے مثلبہ عیب اور مزمت کا کام مناقب اور مثالب جمع ہیں ۔

جمہرہ اللغتہ کے مؤلف ابن درید نے لغظی بحث کے بعد منقبت کا مفہوم یہ لکھا ہے ۔
نمبر1

المنقتہ ضد المثلبہ و الجمع مناقب وھی ما فیہ و فی ابا ئہ من خصال جمیلہ ۔

ترجمہ   منقبہ ضد ہے مثلبت کی اور اس کی جمع مناقب آتی ہے ۔ اور یہ کسی کے ذاتی اور اس کے آباء کے عمدہ فضائل سے عبارت ہے ۔

سید محمد مرتضیٰ الزبیدی نے تاج العروس میں منقبت کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

المنقبہ = کرم الفعل و جمعھا مناقب یقال انہ لکریم المناقب من النجدات وغیرھا و فلاں فی مناقب جمیلہ ای الخلاق حسنہ و فی الساس رجل ذو مناقب و ھی المآثر و المخابر ۔

ترجمہ = محمودہ اعمال اسکی جمع مناقب ہے کہا جاتا ہے کہ وہ شخص اپنے نمایاں خصائل وغیرہ کی وجہ سے کریم المناقب ہے اور فلاں شخص کے مناقب جمیل ہیں یعنی وہ صاحب اخلاق حسنہ ہے اور اساس میں ہے صاحب مناقب ذو یعنی ولیا مرد جو صاحب اوائل و آثار ہو

عربی کی ایک اور معروف لغت: لسان العرب نے اسی مفہوم کی نشاندہی کی ہے ۔

ان عربی لغت نویسوں کے نزدیک اعمال پسندیدہ اور اوصاف جمیلہ جن پرانسان فخر کر سکے منقبت کہلاتے ہیں ۔ اس میں اس کی ذاتی خوبیوں کے علاوہ اس کے آباء اجداد کے کمالات کے حوالے سے بھی اس کی تعریف ہو سکتی ہے ۔

نقب کا لفظ قرآن مجید میں تین جگہ استعمال ہوا ہے ۔

1 ۔ "اور ہم تم سے قبل بہت سی امتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جو قوت میں ان سے کہیں بڑھ کر تھے اور تمام شہروں کو چھانتے پھرتے تھے ۔ تو کیا انہیں کہیں بھاگنے کو جگہ ملی ۔ نمبر1

نمبر1 پارہ 26 س ق آیت 36 ۔ وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم اشدّ منھم بطشا ۔ فنقبوا فی البلاد ط ھل من محیص ۔

2 ۔ بنی اسرائیل کے بارہ گروہوں کے سرداروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "بے شک اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا ۔اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب (سردار) قائم کیئے"[نمبر1]۔

3 ۔ سد سکندری اور یاجوج ماجوج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "نہ تو وہ اس دیوار پر چڑھ ہی سکے اور نہ ہی اس میں سوراخ کر سکے"[نمبر2]۔

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نقبوا کا صیغہ استعمال فرما کر جستجو تلاش اور کاوش کا مفہوم ظاہر کیا دوسری آیت میں نقب کو نقیب یعنی سردار کے معنوں میں استعمال کیا اور تیسری آیت میں نقب کو نقباً کے صیغے میں نقب لگانے یعنی سوراخ کرنے کے مفہوم میں استعمال کیا ۔

حضرت ابن عباس "فنقبوا فی البلاد" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ وہ چکراتے پھرتے تھے اور ایک سے دوسرے سفر کی طرف لوٹتے تھے[نمبر3]۔

علامہ سیوطی اس آیت کی تفسیر میں امام ابن جریر اور ابن المنذر کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ نقب کا معنیٰ اثروا ہے یعنی تلاش کرتے تھے یا گھومتے تھے[نمبر4]۔

نمبر1 = پارہ 6 س المائدہ آیت 12 = لقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل و بعثنا منہم اثنی عشر نقیبا ۔

نمبر2 = پارہ 16 س الکہف آیت 97 ۔ فما استطاعوا ان یظہروہ ما استطاعوا لہ نقبا ۔

نمبر3 = فنقبوا فی البلاد ، فطافوا و تقلبوا فی الاسفار ۔

تفسیر ابن عباس مع الدر المنثور ج 5 ص 260

نمبر4 = اخرج ابن جلیل و ابن المنذر عن ابن عباس فی قولہ فنقبوا فی البلاد قال اثروا ۔

(تفسیر الدر المنثور ج 6 ص 109)

الطشی کے حوالے سے انہوں نے حضرت ابن عباس کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ جب نافع بن الازرق سے فنقبوا کے معانی پوچھے گئے تو انہوں نے کہا کہ لغت یمن میں اس کا معنیٰ ھربوا ہے یعنی وہ بھاگتے پھرتے تھے اور پھر جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا یہ لفظ لغت عرب میں متعارف ہے تو کہا کہ ہیں ۔میں نے عدی بن زید کا شعر سنا ہے ۔

ترجمہ ۔ وہ شہروں میں موت کے ڈر سے بھاگتے پھرتے تھے ۔

اور زمین میں چکراتے پھرتے تھے ۔[1]

علامہ سیوطی نے اس ضمن میں فریابی اور ابن جریر کے حوالے سے حضرت مجاہد کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ فنقبوا فی البلاد کا مطلب ضرابوا فی البلاد ہے یعنی زمین میں دوڑتے پھرتے تھے ۔

ماہر لغت عرب علامہ زمخشری نقبوا کے معنی حرقوا اور دوخوا بیان کرتے ہیں یعنی ملکمیں چکر لگاتے ہوئے اس کے حالات معلوم کیا کرتے تھے ۔"

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ نقبوا کا مطلب ہے گھومنا اور مجاہد نے کہا کہ نقبوا فی البلاد کا معنیٰ ہے کہ وہ زمین میں سوراخ کرتے تھے یعنی راستے بناتے تھے اور قتاوہ نے کہا کہ شہروں میں تجارت اور ہنر مندی کے ذریعے رزق تلاش کرتے تھے ۔اور کہا کہ شہروں میں نقب لگانے سے مراد شہروں کے چکر کاٹنا ہے ۔امراء القیس کا شعر ہے ۔

ترجمہ ۔ آفاق میں نقب لگا یہاں تک کہ تو مال غنیمت کے ساتھ لوٹنے پر خوش ہو جائے[2]

نواب صدیق حسن کہتے ہیں کہ تنقیب تنقیر کے معنوں میں ہے یعنی کسی کام میں چھان بین کرنا کریدنا اور تلاش کرنا مطلب یہ ہوا کہ وہ سکون کی طلب میں خطہ ہائے زمین میں دوڑتے پھرتے

---

[1] = تفسیر کشاف ج 4 ص 406

[2] = فنقبوا ! قال ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ اثروافیھا ، و قال مجاھد فنقبوافی البلاد ضربوا فی الارض ، و قال قتاوہ فساروا فی البلاد ای ساروفیھا یبتغون الارزاق و المتاجرو المقاسب و یقال لمن طوف فی البلاد نقب فیھا قال امرو القیس۔

لقد نقبت فی الافاق حتی رضیت من الغنیمۃ بالایاب

تھے ۔اور ایک طرف سے دوسری طرف کو لوٹتے اور چکراتے پھرتے تھے۔ اس لفظ کی اصل نقب ہے اور نقب راستے کو کہا جاتا ہے ۔مجاہد نے کہا کہ نقبوا سے مراد ضربوا اور طافوا ہے یعنی سفر کرتے تھے اور چکر کاٹتے رہتے تھے ۔نضر بن شمیل نے کہا کہ گردش کیا کرتے تھے ۔ المؤرج نے کہا کہ اس کے معنی شاہدوا یعنی گواہ کے ہیں ۔مگر پہلا معنی بہتر اور اولیٰ ہے ۔ نقب پہاڑنے یا ٹکڑے ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں ۔اور اس کا معنی پہاڑ کا راستہ ہے اور ایسے ہی منقب اور منقبت جیسا ابن سکیت نے کہا کہ نقب کی جمع نقوب ہے ۔اور نقب کے قاف مکسورہ مشددہ کو کو تہدیدی امر کے لئے پڑھا جاتا ہے یعنی وہ اطراف جوانب میں چکراتے پھرتے تھے مگر باوجود کثیر تنقیب و تفتیش اور تلاش و جستجو کے مسلمان نہ ہو سکے۔ نمبر1

علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ نقبوا فی البلاد کا مطلب ہے کہ وہ بھاگتے تھے اور دوڑتے ہوئے آتے جاتے تھے اور چکراتے پھرتے تھے اور اس کی اصل نقب ہے اور نقب راستے کو کہتے ہیں۔ نمبر2

علامہ خازن فرماتے ہیں فنقبوا فی البلاد یعنی گھومتے پھرتے تھے اور ایک سے دوسرے شہر کو لوٹتے تھے۔ نمبر3

قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں قاموس میں ہے کہ زمین میں نقب لگانے کا مطلب ہے کہ سوراخ کی طرح کا راستہ اور نقب میں کہتا ہوں کہ تشدید تکسیر کے واسطے ہے اور اس کے معانی ہیں کہ وہ شہروں میں تصرف کے لئے جاتے تھے اور فائدہ حاصل کرتے تھے ۔ اور اس وقت کا حرف سبیل

نمبر1 = التنقیب التنقیر عن الامر والبحث و الطلب ای ساروا وتقلبوا فیہا و طافوا ابتغاءا طلبا للھرب واصلہ من النقب و ھوا الطریق قال مجاھد ضربوا طافوا و قال النضر بن شمیل دوروا وقال المعرج شاھدوا والاولی اولی وقرائابن عباس وغیرہ نقبوا بفتح القاف مخففہ و النقب ھوا لخرق والطریق فی الجبل وکذا المنقب والمنقبہ کذا قال ابن سکیت وجمع النقب نقوب وقری بکسر القاف مشددہ اعی الامر للتھدید ای طوفو فیھا وسیروا فی جوانبھا ولماکانال تقدیر و لم یسلموا بکثیر تنقیبھم و تفتیشھم ۔ (تفسیر فتح البیان ج 5 ص87)

نمبر2 = معالم التنزیل ج 4 ص198 ۔ضربوا و ساروا تقلبوا وطافوا اصلہ من النقب وھوالطریق

نمبر3 = تفسیر الخازن ج 4 ص198

کے لئے ہے ۔ کہ وہ شہروں میں تصرف کرنے کیلئے ان سے زیادہ سخت تھے اور معنی یہ ہے کہ وہ زمین میں ہر جگہ پر چکر لگاتے پھرتے تھے ۔[نمبر 1]

علامہ سیوطی بعد بن حمید ابن جریر اور ابن منذر کے حوالے سے حضرت قتادہ کی روایت نقل فرماتے ہیں کہ ارشاد خداوندی اثنا عشر نقیبا کا مطلب ہے کہ ان میں سے بارہ گواہ مقرر کیئے ۔[نمبر 2]

نواب صدیق حسن فرماتے ہیں کہ النقاب اس رجل عظیم کو کہا جاتا ہے جو لوگوں میں اسی طریق پر ہو اسے نقیب قوم بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ان کے طریق پر ان کے امور کو پہچانتا ہے اور نقب پہاڑ کے راستے کو کہا جاتا ہے اور یہی ایک لفظ کی اصل ہے اور نقیب عریف کے اعلیٰ مقامات میں سے ہیے اور کہا کہ یہ لفظ تنقیب سے مشتق ہے ۔ اور تنقیب تفتیش کو کہتے ہیں ۔ اور اسی سے نقبوا فی البلاد ہے ۔ اور کہا کہ ان نقباء کو بھیجنے سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے احوال پر مطلع تھے[نمبر 2] اور حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ نقیب بمعنی ضمین ہے اور قتادہ نے کہا کہ قوم کے گواہ ہیں اور بعض نے کہا کہ نقیب کفیل و امین اور قوم کے احوال جاننے والے کو کہتے ہیں ۔ اور اس کا معنی متقارب بھی بیان کیا جاتا ہے ۔

علامہ ابن کثیر نے نقباء کا معنیٰ اپنے قبائل کو پہچاننے والا کیا ہے یعنی عرفاء علیٰ قبائلہم[نمبر 3] عرفاء

علامہ رازی فرماتے ہیں کہ زجاج نے کہا کہ نقیب فعیل ہے اور اس کی اصل نقب سے ہے اور نقب نقب کو کہتے ہیں ۔ یعنی وسیع سوراخ ، کہتے ہیں کہ فلاں شخص نقیب قوم ہے کیونکہ وہ ان کے احوال سے ایسے ہی واقف ہوتا ہے جیسے اسلام پر مطلع ہوتا ہے اور اس سے ہی مناقب ہے اور مناقب

نمبر 1 = فنقبوا فی البلاد وفی القاموس نقب فی الارض ای ذهب کانقب ونقب ، قلت ! التشدید للتکثیر والمعنی اذهبوا فی البلاد للتعرف فیها والتتبع وحینئذ الفاء للسببیة فان شدة بطشهم سبب للتصرف فی البلاد والمعنی جالوا فی الارض کل مجال

تفسیر مظہری ج 9 ص ۷۴

نمبر 2 = تفسیر فتح البیان ج 2 ص 33

نمبر 3 = تفسیر ابن کثیر جلد 2 ص 309 ۔

فضائل کو کہا جاتا ہے کیونکہ فضائل بغیر پوری تفتیش کے ظاہر نہیں ہوتے ۔ نقیب فعیل کے وزن پر ہے ۔ اور فعیل کو فاعل اور مفعول دونوں پر محمول کیا جاتا تو اگر نقیب فاعل کے صیغہ میں ہے تو یہ قوم کے احوال کا سراغ لگانے والا اور ان کی تفتیش کرنے والا ہوگا ۔ اور ابو مسلم نے کہا کہ یہاں نقیب فعیل بمعنی مفعول ہے اور اس کی مثال ایسے ہے جیسے مضروب کو ضریب اور مقتول کو قتیل کہا جاتا ہے نمبر 1 ۔ نقیباً کی تفسیر میں علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ نقیب اپنی قوم میں سے ان کی کفالت کرنے والے اور ان کے اس عہد کے ضامن تھے کہ وہ جو بھی حکم انہیں دیں گے وہ ویسے ہی کریں گے ۔ اور فرمایا کہ نقباء کا مطلب ہے کہ وہ اپنی قوم کیلئے اخبار و آثار کے سلسلے میں تلاش و تجسس کریں اور اس کے علم کو جانتے ہوں ۔ نمبر 2

علامہ نسفی فرماتے ہیں کہ نقیب اسے کہتے ہیں جو قوم کے احوال کا سراغ لگائے اور ان کی تفتیش کرنے والا ہو ان نقیبوں کو جب ارض کنعان بھیجا گیا جو ان لوگوں کی سراغ رسانی کرتے تھے ۔ مفتی احمد یار خان نقل کرتے ہیں کہ ان بارہ سرداروں کو قوم کنعانین کی سراغ رسانی کرنے اور ان کے حالات جاننے کیلئے چنا گیا تھا ۔ اسلئے انہیں نقیب کہا گیا ۔ نقب سے مراد کھلا سوراخ ہے اسی وجہ سے پہاڑ کے اس راستے کو بھی نقب کہتے ہیں ۔ جسے پہاڑ میں سوراخ کر کے بنایا گیا ہو ۔ ربّ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نقبوا فی البلاد = منقبت اور مناقب ان صفات کو کہتے ہیں جو چھان بین اور کرید کے بعد معلوم یا بیان کیا جائے ۔ اصطلاح میں لقب کے معنیٰ تفتیش و تجسس اور تلاش و جستجو کے ہیں ۔ نمبر 3 یعنی نقیب یا تو اسم مفعول ہے یا اسم فاعل یعنی حالات کی تلاش و تجسس میں رہنے والا ۔ اثنیٰ عشر نقیبا کی تفسیر میں مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ نقیب کے معنی نگرانی اور تفتیش کرنے والے

نمبر 1 قال الزجاج النقيب فعيل اصله من النقب وهو الثقب الواسع يقال فلان نقيب القوم لانه ينقب عن احوالهم كما ينقب عن الاسرار ومنه المناقب وهي الفضائل لانها لا تظهر الا بالتنقيب ، النقيب فعيل والفعيل يحتمل الفاعل والمفعول فان كان بمعنى الفاعل فهو الناقب عن احوال القوم المفتش عنها وقال ابو مسلم النقيب ههنا فعيل بمعنى مفعول ونظيره انه يقال للمضروب ضريب وللمقتول قتيل

(تفسیر کبیر ج 2 ص 563)

نمبر 2 يكون كفيلا على قومه بالوفاء وحكم على ما امروا به "النقباء" يتجسسون له الاخبار ويعلمون علمها

(معالم التنزیل ج 2 ص 21)

نمبر 3 تفسیر نعیمی (ج 6 ص 292)

کے ہیں ۔بائیبل انہیں صرف رئیسوں اور سرداروں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور قرآن ان کی حیثیت اخلاقی و دینی نگران کی قرار دیتا ہے ۔[1]

احادیث رسول مقبول میں نقب اپنے مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔حضور اکرم نے فرمایا ! مجھ کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ لوگوں کے دلوں کو کریدوں اور ان کے باطنوں کو پھاڑوں ۔[2]

سرور کائنات نے فرمایا !

جو شخص کوئی بات پوچھے پھر اس کاکھوج لگائے ۔[3]

ایک اور حدیث میں فرمایا !

عبادہ بن صامت انصار کے نقیبوں میں سے تھے[4] (حضور نے لیلۃ العقبہ میں انصار کی ہر شاخ کا ایک نقیب مقرر کیا تھا کہ وہ اپنے لوگوں کو سمجھا بجھا کر اسلام کی طرف لائیں ۔عبادہ بن صامت کو بھی ایک شاخ کا نقیب بنایا تھا ۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ

"مجھے چودہ وزیر ، نقیب اور نجیب عطا ہوئے ہیں[5] "

ان مفاہیم کے علاوہ تمام کتب حدیث میں منقبت کا لفظ فضائل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔مثلاً

1 ۔ باب المناقب الصحابہ 2 ۔ باب المناقب اہل بیت النبی ﷺ

3 ۔ باب المناقب العشرہ 4 ۔ مناقب المہاجرین و فضلہم ۔

عربی سے یہ لفظ فارسی میں منتقل ہوا ۔چنانچہ حبیب اللہ آموزگار نے اس کا معنیٰ یوں لکھا ہے ۔

نمبر1 = تفہیم القرآن ج 1 ص 451 ۔

نمبر2 = انی لم او مر ان انقب قلوب الناس ولا اشق بطونہم ۔ (بخاری کتاب المغازی ص624)

نمبر3 = من سال عن شئی فنقب عنہ ۔ بحوالہ لغات الحدیث ص127

نمبر4 = وکان عبادہ من النقباء ۔ سیرت ابن ہشام ج 1 ص276

نمبر5 = وانی اعطیت اربعۃ عشر وزیراً نقیباً نجیباً – المعجم المفہرس لالفاظ والاحادیث النبوی مطبوعہ بیروت ص 531 ۔

منقبت = اسم - مقام و درجہ پیشوائی قوم -

مناقب = (ج) منقبت - کار نیکو - خوبہائے پسندیدہ نمل -

یہ تقریباً وہی مفہوم ہوا جس میں یہ لفظ قرآن مجید کی آیت اثنی عشر نقیبا میں استعمال ہوا ہے -

صاحب غیاث اللغات نے اس کا معنی اوصاف حمیدہ لکھا ہے اور کشف اللغات نے ہنرہا مراد لیا ہے -

فرہنگ فارسی نے آنچہ مایہ ستائش دیگران و فخر و مباہات شخص یا شد نمل 2 لکھا ہے - لغات کشوری کے مطابق منقبت ہنر اور تعریف کو کہتے ہیں - لیکن اصطلاح میں اس سے مراد ثنائے اہل بیت نبی و اصحاب کبار ہے -

اردو میں یہ لفظ "تعریف - توصیف - ثناء خصوصاً اہل بیت اور صحابہ کی " کے معنوں میں آیا ہے نمل 3 - نسیم اللغات کے مؤلف نے اسے بزرگان دین کی مدح قرار دیا ہے اور اس میں اہل بیت اطہار، صحابہ کرام اور دیگر اولیائے عظام کی تخصیص نہیں کی -

اردو میں حمد - نعت - منقبت اور مدح تعریف و توصیف کیلئے آتے ہیں اور لغوی اعتبار سے ہم معنی ہیں - لیکن ان کے اصطلاحی معنی مختلف ہیں - اور ان کا استعمال ممدوح کے اعتبار سے ہوتا ہے - چنانچہ اگر ممدوح ذات خداوندی ہے تو یہ حمد ہے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات ہے تو یہ نعت ہے - اگر صحابہ کرام اہل بیت اور بزرگان دین ہیں تو اس کیلئے منقبت کا لفظ استعمال کرتے ہیں - اور اگر مطلقاً کوئی سربرآوردہ شخصیت ہے تو اس کیلئے مدح کا لفظ لاتے ہیں نمل 4 -

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں " اصطلاح میں اگر آنحضرت ؐ کے سوا کسی دوسرے بزرگ

نمل = فرہنگ آموزگار نمل 2 = مرتبہ ڈاکٹر محمد معین مطبوعہ تہران

نمل 3 = جامع اللغات -

نمل 4 = مضمون صحابہ کرام کی نعت گوئی ڈاکٹر محمد صغیر الدین مطبوعہ نعت نمبر صریر خامہ شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی -

Syed Anzar Abbas

یا صحابی یا امام کی تعریف کی جائے - تو اسے منقبت کہیں گے -"

30-05-19 Abbas

یہ درست ہے کہ بزرگان دین کے فضائل و مناقب نظم نثر دونوں میں بیان ہوئے ہیں - مگر ان بزرگوں کی منظوم مدح سرائی ہی کو اصطلاحی معنوں میں منقبت کہا جاتا ہے - چنانچہ اقسام شعر کے زیر عنوان چھپنے والے مضمون میں شمیم احمد نے منقبت کو شعر کی ایک الگ صنف قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں !

" ایسے اشعار جن میں صحابہ رسول علی الخصوص حضرت علی یا آئمہ کرام یا صوفیا ء کی تعریف کی گئی ہو منقبت کہلاتے ہیں - یہ کسی نظم کے حصے کے طور پر یا الگ سے نظم یا قصیدے کی شکل میں لکھے جا سکتے ہیں"۔ نمبر2

منقبت کی شخصیات -

اب تک منقبت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم پر جو بحث ہوئی ہے اسکی روشنی میں منقبت کا موضوع صرف وہ اعلیٰ دینی شخصیت بن سکتی ہے جس میں دو خوبیاں موجود ہوں -

(۱) وہ پیشوائی قوم کا فریضہ سر انجام دے سکتی ہو -

(۱۱) وہ پسندیدہ فضائل کی حامل ہو -

دینی شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے کار لائل رقم طراز ہے -

ایک خوش کن بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی صحبت بڑی نفع بخش ہوتی ہے - ہم جب بھی کسی دینی اور روحانی طور پر بڑے آدمی کو دیکھتے ہیں تو اس سے کچھ نہ کچھ حاصل کرتے ہیں - وہ ایک روشنی کا فوارہ ہے - جس کے قریب ہونا ایک خوشگوار تجربہ ہے - وہ روشنی جو دنیا کی تاریکی کو دور کر کے اسے منور کرتی ہے وہ ایک روشن قندیل نہیں ، چمکتا ہوا منبع نور ہے جو قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے - ------

کہا جاتا ہے کہ انسان کا مذہب اس کے بارے میں سب سے بڑی حقیقت ہے - لیکن مذہب سے مراد وہ باتیں نہیں ہیں جن کا وہ زبانی اقرار کرتا ہے - بلکہ وہ اعمال ہیں جو اس سے انجام جاتے ہیں-

---

نمبر1 = اردو کی نعتیہ شاعری ص ۲۱ نمبر2 = درس بلاغت ترقی اردو بیورو نئی دہلی

کسی بڑی روحانی شخصیت کے ساتھ وفاداری کا نام ایمان ہے۔ اور یہی وفاداری معاشرے کی روح ہے۔ کسی بڑی شخصیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی معاشرے کی بنیاد ہے۔ یہ لوگ کرنسی نوٹوں کی طرح ہوتے ہیں۔ جو دراصل سونا ہیں۔ عظیم شخصیات کے ساتھ عقیدت اور محبت کا تعلق اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک کہ کرہ ارض پر بنی نوع انسان موجود ہے۔ ۔

عام انسانوں کی حالت خشک لکڑی کے ڈھیر جیسی ہوتی ہے۔ جو اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کوئی بجلی آسمانوں سے آئے اور اسے روشن کرے۔ بڑی شخصیات کی حیثیت اس بجلی کی سی ہے جو اپنے گرد و پیش کو اپنی طرح شعلہ بداماں کر دیتی ہے۔ ۔ ۔ بڑے آدمیوں کی عظمت پر ایمان نہ لانا اپنے چھوٹے پن کی دلیل ہے۔ نمبر۱

بڑی دینی شخصیت وہ ہے جو صرف اپنی گفتگو سے مذہب اور روحانیت کے ساتھ وابستگی کا اظہار نہ کرے بلکہ اس کے اعمال و افعال بھی اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ انہی خصوصیات کو سامنے رکھتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر ابو الفتح محمد صغیر الدین نے اہل بیت اطہار صحابہ کرام اور بزرگان دین کو منقبت کا موضوع قرار دیا ہے۔ ان میں سے ہر فرد اعلیٰ شخصیت کا مالک ہے اور اخلاق جلیلہ سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ قوم کی رہبری کا فریضہ سر انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مذہب ان کے کالبد خاکی میں روح کا درجہ رکھتا ہے اور مذہبی اقدار کے ساتھ گہری وابستگی ان کا طرہ امتیاز اور شان تفاخر ہے۔

اب ان میں سے ہر جماعت کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) اہل بیت اطہار۔

اہل بیت اطہار منقبت نگاری کا نہایت اہم موضوع ہیں۔ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں ان کے فضائل کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے

"آپ کہہ دیجئے کہ میں اس پر (تبلیغ اسلام پر) اجر کا سوال نہیں کرتا سوائے محبت ذوی القربیٰ کے نمبر2"۔

نمبر۱ = SARTOR RESARTUS & ON HEROES & HEROWORSHIP P. 239/240

نمبر2 = قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ۔ الشوریٰ آیت 23

حضرت عباس سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے دریافت فرمایا یا رسول اللہ آپ کے قرابت دار کون ہیں ۔ جن کی محبت ہم پر فرض کی گئی ہے ۔ فرمایا !

علی ۔ فاطمہ اور ان کے دونوں بیٹے ۔

صحیح مسلم میں حضرت سعد بن وقاص سے روایت ہے کہ جب آیہ مباہلہ نازل ہوئی تو جناب رسالت مآب نے علی ۔ زہرا ۔ حسن اور حسین کو بلا کر فرمایا کہ خدا وندا ! یہ میرے اہل بیت ہیں اور پھر آیہ تطہیر تلاوت فرمائی ۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے ۔ !

" ایک دن صبح رسول خدا اپنے گھر سے نکلے ۔ اس وقت ردا چنبری بالوں والی آپ کے کندھے پر تھی ۔ کہ اتنے میں حسن بن علی آئے آنحضرت نے انہیں اپنی چادر میں داخل کر لیا ۔ حسین آئے انہیں بھی اس ردا میں داخل کر لیا ۔ پھر فاطمہ آئیں تو اس ردا میں جگہ ملی پھر علی آئے تو انہیں بھی اس چادر میں داخل کر لیا ۔ پھر فرمایا !

"بہ تحقیق اے اہل بیت رسول ۔ خدا ارادہ کر چکا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور رکھے اور تم کو ایسا طاہر کردے جیسا کہ طہارت کا حق ہے[1]"

یہ حدیث مؤطا امام مالک اور مسند احمد بن حنبل میں بھی بیان ہوئی ہے اور اسی بنا پر اہل بیت رسول کو آل ردا ، یا آل عبا کہا جاتا ہے ۔ جناب امیر المومنین کے سوانح میں ہے کہ آپ نے روزہ رکھا افطاری کا وقت آیا تو کسی مسکین نے صدا دی ۔ آپ نے کھانا اس کے حوالے کر دیا اور خود فاقے سے رہے اس کے بعد دو دن ایسا ہی ہوا ۔ اہل بیت فاقے سے رہے اور کھانا سائلوں کو دے دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔

" اور وہ کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت میں مسکین ، یتیم اور اسیر کو[2] "

نمبر[1] س احزاب

نمبر[2] س الدھر

حضرت عائیشہ سے روایت ہے کہ پیغمبر کے وصال کے روز تک آل محمد نے جو کی دو روٹیاں مسلسل پیٹ بھر کر نہیں کھائیں - آنحضرت نے مکہ سے ہجرت کی تو جناب امیر المومنین کو اپنے بستر پر لٹا دیا - مشرکین رات کے اندھیرے میں تلواریں سونت کر اندر گھس آئے - چادر ہٹا کر دیکھا تو آپ کو بڑے سکون سے محو خواب پایا - اس پر جناب علی کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی !

"ایک ایسا شخص ہے وہ محض خدا کی رضا مندی حاصل کرنے کیلئے اپنی جان فروخت کرتا ہے نمبر1"

اہل بیت کیلئے فضائل و مناقب کتب حدیث میں بھی جا بجا ملتے ہیں - چند ایک احادیث درج ذیل ہیں -

جب انصار اور مہاجرین کے درمیان عقد موخات باندھا گیا تو آنحضرت نے جناب علی کو اپنا بھائی بنا لیا اور فرمایا !

"علی میرا بھائی ہے - علی مجھ سے ہے میں علی سے ہوں نمبر2"

"اے علی تم مجھ سے ہو ، میں تم سے ہوں نمبر3"

"اے علی تو دنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے نمبر4"

"اے علی تو مجھ سے ایسے ہی ہے جیسے کہ موسیٰ کیلئے ہارون نمبر5"

"میں ایک شہر ہوں علم کا اور علی اس کا دروازہ ہیں ، پس جو شخص علم حاصل کرنا چاہے اسے چاہیئے کہ اس کے دروازے پر آئے نمبر6"

"اگر تم کتاب اللہ اور میرے اہل بیت سے تمسک رکھو گے تو قیامت تک گمراہ نہ ہو گے نمبر7"

غزوہ خیبر کے موقع پر فرمایا " میں یہ علم اس شخص کو دوں گا جس کے ہاتھوں پر خدا قلعہ خیبر کی فتح دے گا - وہ شخص خدا اور رسول کو دوست رکھتا ہے اور خدا اور رسول اسے دوست رکھتے ہیں"

نمبر1 س البقرہ
نمبر2 احمد بن حنبل" ابن الاثیر"
نمبر3 بخاری شریف
نمبر4 ترمذی شریف
نمبر5 بخاری شریف و مسلم شریف
نمبر6 ترمذی شریف
نمبر7 صحیح مسلم شریف ، ترمذی شریف احمد بن حنبل

جب کبھی فاطمہ زہرا تشریف لاتیں ۔آنحضرت سرو قد کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کرتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے ۔ایک دن فرمایا "فاطمہ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے جس نے اسے غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا "[1] جناب رسول اکرم نے ایک دن حسن ابن علی کو اپنے سینے سے لپٹا کر فرمایا !

" خداوند میں اسے دوست رکھتا ہوں اور پھر اس شخص کو دوست رکھتا ہوں جو اسے دوست رکھے [2] "

" اے اللہ دوست رکھ دوست رکھ اس کو جس نے حسین کو دوست رکھا "[3]

ایک دن آپ نے جناب امیر کے ایک دانشمندانہ فیصلہ کا ذکر سنا تو فرمایا !

" خدا کا شکر ہے جس نے ہم اہل بیت کو حکمت سکھائی "

رسول اللہ نے فرمایا ! " مجھ پر نامکمل درود نہ بھیجو جب صحابہ نے پوچھا نامکمل درود کیسا ہوتا ہے ، فرمایا تم لوگ کہتے ہو ۔اللھم صلی علیٰ محمد ۔اور اس پر بس کرتے ہو ۔یوں کہا کرو !

" اللھم صلی علیٰ محمد و علیٰ آل محمد "[4]

حضرت عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے کہ مجھے کعب بن عجرہ ملے اور کہنے لگے کیا میں تمہیں کوئی ایسا ہدیہ نہ پیش کروں جو رسول اللہ سے پہنچا ہے ۔ میں نے کہا ! ہاں ۔انہوں نے کہا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ۔ انّ اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی یا ایّھا الذین آمنوا صلوا علیہ و سلموا تسلیما ۔ تو ہم نے حضور سے دریافت کیا یا رسول اللہ ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ آپ پر کس طرح سلام کریں ۔مگر ہمیں درود کیسے بھیجنا چاہیئے ۔ آپ نے فرمایا !

کہو " اللھم صلی علیٰ محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم انک حمید مجید و بارک علیٰ محمد و علی آل محمد کما بارکت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم انک حمید مجید "

ان آیات و احادیث سے حب آل رسول کے واجب ہونے ۔ان کے فقر و استغنا ۔علم و فضل

نمبر۲ بخاری شریف
نمبر۳ ابن ماجہ

حکمت دانش۔ شجاعت و بہادری اور ولایت و معرفت کے جو مضمون پیدا ہوئے ۔ وہی منقبت گو شعراء کے بھی موضوع بن گئے ۔چنانچہ انہوں نے انہیں آیات و احادیث کے حوالے سے اہل بیت کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے "۔

صحابہ کرام ۔

صحابہ کرام آنحضرت کے جان نثاروں کی وہ جماعت ہے جو حضور کی صحبت سے فیضیاب ہوئی اور جنہوں نے دامے ۔ درمے ۔ سخنے ہی نہیں بلکہ اپنی جان کی بازی لگا کر نخل اسلام کی آبیاری کی ۔خدا تعالیٰ اور رسول اکرم کے نزدیک ان کا مرتبہ بہت بلند ہے قرآن و حدیث میں ان کی تعریف و توصیف یوں ہوئی ہے ۔

" وہ مہاجرین و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت لی نیز وہ جو بعد میں راستبازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے ۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ۔اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔[نمبر 1] "

" جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جد و جہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں اور ان کے لئے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔[نمبر 2] "

" محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہے وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں ۔تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے "۔

سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں ۔ یہ ہے ان کی صفت۔ تورات اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے ۔جس نے پہلے کونپل نکالی ۔ پھر اس کو تقویت دی ۔ پھر وہ گدرائی پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی ۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے ۔ تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں ۔اس گروہ کے لوگ

نمبر 1 س توبہ ۹۹
نمبر 2 س الانفال ۷۴

11789

جو ایمان لائے ہیں - اور جنہوں نے نیک عمل کیئے ہیں - اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے - نمبر 1 "

حضرت مصعب بن عمیر نے جنگ احد میں جام شہادت نوش فرمایا جنگ ختم ہوئی تو محبوب خدا سرہالیں تشریف لائے - اسلام کے اس بہادر سپاہی کی نعش کے قریب کھڑے ہوگئے اس کے لئے دعا فرمائی اور پھر یہ آیت تلاوت کی !

" اہل ایمان میں سے ایسے جوانمرد ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا - ان جوانمردوں سے کچھ تو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعض اس (سعادت سعید) کا انتظار کر رہے ہیں (جنگ کے مہیب خطرات کے باوجود) ان کے رویئے میں ذرا تبدیلی نہیں ہوئی نمبر 2"

اور پھر فرمایا ! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں قیامت تک شہید ہیں - پس ان کے پاس جاؤ - ان کے مزارات کی زیارت کرو - اس ذات پاک کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے - قیامت تک جو انہیں سلام کرے گا وہ جواب دیں گے - نمبر 3

رسول کریمؐ نے فرمایا میرے صحابہ کو برا بھلا نہ کہا کرو - اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو ان کے ایک مد کے برابر بھی نہیں ہو سکتا - نمبر 4

رسول کریم نے فرمایا ! میرے صحابہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو - میرے صحابہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو - میرے بعد ان کو طعن و تشنیع کا ہدف نہ بنا لینا جو شخص ان سے محبت کرتا ہے وہ میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کرتا ہے - اور جو شخص ان سے بغض رکھتا ہے میرے بارے میں اس کے دل میں جو بغض ہے اس کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے - جس نے میرے صحابہ کو اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی - جس نے مجھے اذیت پہنچائی اس نے اللہ کو اذیت پہنچائی

نمبر 1 = س الفتح آیت 29

نمبر 2 = س الاحزاب آیت 23 - نمبر 3 = قرطبی عن بیقھی بحوالہ ضیاء القرآن

نمبر 4 = صحیح مسلم

اور جس نے اللہ کو اذیت پہنچائی تو اللہ اس کو اپنی گرفت میں لے لے گا نمبر۱ "

حضرت عمر نے کہا رسول اللہ نے فرمایا ! میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں ۔ ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو گے راہ پاؤ گے نمبر۲

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا میری امت کا بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے ۔ پھر وہ لوگ جو ان سے ملتے ہیں (یعنی صحابہ کرام) پھر وہ جو ان سے ملتے ہیں (تابعین کرام)نمبر۳ ۔

حضرت ابوبکر صدیق ۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق منقبت نگاری کی روایت کا نقطہ آغاز ہیں ۔ ان کے بارے میں قرآن مجید میں آتا ہے کہ !

" دو میں کا دوسرا ۔ جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل کیا اور اس کی مدد کی ایسے لشکروں سے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا سر نیچا کر دیا ۔نمبر۴

سرور دو عالم نے جب مدینے کی طرف ہجرت فرمائی تو حضرت ابوبکر صدیق آپ کے ہمراہ تھے ۔ مکہ سے نکلے تو راستے میں غار ثور میں قیام فرمایا ۔ اہل مکہ تلاش کرتے کرتے اس غار کے دہانے تک پہنچ گئے ۔ ابوبکر صدیق خطرے کو محسوس کر کے پریشان ہوگئے ۔ حضور نے فرمایا کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے ۔ مندرجہ بالا آیات اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں ۔ یہیں سے یار غار کی ترکیب وضع ہوئی ۔

رسول اللہ نے فرمایا ! جس چیز کو اللہ تعالی نے میرے سینے میں ڈالا میں نے اس چیز کو ابوبکر کے سینے میں ڈال دیا ۔نمبر۵

ایک روز سرور دو عالم نے حضرت حسان سے پوچھا کہ اے حسان " کیا تم نے شان صدیق ط

نمبر۱ = ترمذی شریف

نمبر۲ = ریاض النضرہ فی مناقب عشرہ : محب طبری ج ۱ ص ۱۸

نمبر۳ = مسلم شریف

نمبر۴ = س التوبہ آیت 40

نمبر۵ = اردو ترجمہ مکتوبات ربانی دفتر سوم ترجمہ عالم الدین مکتوب ۱۲۲

میں بھی کچھ اشعار کہے ہیں انہوں نے عرض کی ! ہاں یا رسول اللہ ۔ حضور نے فرمایا !
میں سننا چاہتا ہوں ۔حسان نے عرض کی !

آپ دو میں سے دوسرے تھے اس با برکت غار میں اور دشمن نے اس کے گرد چکر لگایا جب وہ پہاڑ پر چڑھا ۔ابو بکر اللہ تعالیٰ کے رسول کے محبوب تھے اور لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ حضور ساری مخلوق میں سے کسی کو آپ کا ہم پلہ نہیں سمجھتے ۔

حسان کے یہ شعر سن کر حضور نے تبسّم فرمایا اور فرمایا کہ اے حسان تم نے سچ کہا ۔ ابو بکر ایسے ہی ہیں ۔ نمبر1

روایت ہے ابو ہریرہ سے کہ رسول اللہ نے فرمایا کسی کا احسان ہم پر ایسا نہیں جس کا بدلہ ہم نے نہ دیا ہو سوائے ابو بکر کے ۔ان کا احسان جو ہم پر ہے اس کا بدلہ ان کو اللہ قیامت میں دے گا ۔اور اتنا مجھ کو کسی کے مال نے نہ دیا جتنا نفع پایا میں نے ابو بکر کے مال سے ۔ اور اگر میں دوست بناتا کسی کو تو دوست بناتا ابو بکر کو ۔آگاہ رہو کہ تمہارا صاحب اللہ کا دوست ہے ۔ نمبر2

حضور نے حضرت ابو بکر سے فرمایا تو میرا غار کا ساتھی ہے اور تو حوض کوثر پر بھی میرا ساتھی ہو گا ۔ نمبر3

سرور دو عالم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تم لوگوں کی طرف بھیجا مگر تم نے مجھے جھوٹا سمجھا ابو بکر نے سچا سمجھ کر اپنے مال اور جان سے میری خدمت کی ۔ نمبر4

حضرت عمر فاروق ۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے !

اے اللہ کے رسول تجھے اللہ تعالیٰ اور اتباع کرنے والے مومن کافی ہیں
ابن عباس نے فرمایا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کا سبب حضرت عمر فاروق کا اسلام ہے ۔ نمبر5

رسول اللہ نے فرمایا کہ اللہ نے جاری کر دیا حق کو عمر کی زبان اور دل پر ۔ نمبر6

رسول اللہ نے دعا کی کہ اے اللہ ابو جہل اور عمر بن خطاب دونوں میں سے جو پیارا ہو اس کے ساتھ اسلام کو قوی کر ۔ان دونوں میں سے عمر اللہ کو پیارے نکلے ۔ نمبر7

نمبر1 ابن عساکر — نمبر2 ترمذی شریف — نمبر3 ترمذی شریف — نمبر4 بخاری شریف — نمبر5 ترجمہ مکتوبات امام ربانی صفحہ نمبر ۹۶ ص ۲۹۰ دفتر سوم
نمبر6 ترمذی شریف — نمبر7 ترمذی شریف

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ نے ! کیا خوب شخص ہے ابو بکر ۔ کیا خوب شخص ہے عمر ۔ اور کیا خوب شخص ہے ابو عبیدہ بن جراح نمبر۱ ۔

حضرت عثمان ۔

حضور نے فرمایا کہ جس آدمی نے رومہ کنواں کھدوایا وہ جنتی ہے ۔ (اور یہ کنواں حضرت عثمان نے کھدوایا تھا ۔) اور جس شخص نے جیش عسرہ کے لئے سامان مہیا کیا وہ بھی جنتی ہے ۔ (اور یہ سامان حضرت عثمان نے فراہم کیا تھا) نمبر۲ ۔

بیعت رضوان کے وقت حضور نے حضرت عثمان کو اہل مکہ سے گفتگو کے لئے بھیجا تھا ۔ وہ بیعت کے وقت موجود نہ تھے ۔ آپ نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھا کر فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے ۔ اور پھر بائیں ہاتھ پر مارتے ہوئے فرمایا یہ بیعت عثمان ہوئی نمبر۳ ۔

حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ آنحضرت کے ساتھ میں مدینے کے ایک باغ میں حاضر تھا ۔ کہ کسی نے آکر دروازے پر آواز دی ۔ آپ نے مجھ کو دروازہ کھولنے اور جنت کی خوشخبری سنانے کا حکم دیا ۔ دیکھا تو ابو بکر تھے ۔ چنانچہ ان کو بلایا اور جنت کی خوشخبری دے دی ۔ یہ سن کر حضرت ابو بکر نے خدا کا شکر ادا کیا ۔ اور کچھ دیر بعد کسی دوسرے شخص نے دستک دینی شروع کی ۔ آپ نے فرمایا دروازہ کھول دو اور جنت کی خوشخبری بھی سنا دو ۔ اب جو دروازہ کھولا تو حضرت عمر تھے ۔ میں نے انہیں بھی حکم حضور سے مطلع کر دیا یہ سن کر وہ بھی شکر خدا بجا لائے ۔ پھر تیسرے شخص نے دروازہ کھلوانا چاہا آپ نے پھر فرمایا دروازہ کھول کر اس کو بھی جنت کی بشارت ان حادثات پر جو اس کے اوپر آنے والے ہیں دے دو ۔ دروازہ کھولا تو حضرت عثمان کھڑے تھے ۔ میں ان کو بھی حضور کے حکم سے مطلع کر دیا ۔ یہ سن کر انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ میرا تو اللہ ہی مالک اور مددگار ہے نمبر۴ ۔

حضرت عثمان داماد رسول تھے ۔ حضور کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے آپ کے نکاح میں تھیں ۔ اسی لئے آپ کو ذو النورین کہا جاتا ہے ۔

نمبر۱ = ترمذی شریف نمبر۲ = بخاری شریف نمبر۳ = بخاری شریف
نمبر۴ = بخاری شریف

حضرت علی کا ذکر اہل بیت کے ساتھ ہو چکا ہے۔

اولیائے عظام۔

ولی کا لغوی معنی دوست یا مدد گار کے ہیں لیکن اصطلاح میں ولی اس شخص کو کہا جائیگا جو معرفت خداوندی رکھتا ہو۔ طاعات خداوندی پر قائم رہے ، عصیان اور معصیت سے کنارہ کش رہے۔ اور لذات شہورینہ سے پرہیز کرتا رہے۔ نمبر[1]

مولانا عبدالرحمٰن جامی لکھتے ہیں کہ ولی وہ شخص ہے جو اللہ کی عبادت اور اسکی اطاعت کو اپنے ذمے لے لے۔ پس اس کی عبادت اور بندگی تسلسل کے ساتھ اس پر حاوی رہے کہ اس کے درمیان گناہ نہ آئے۔ اور اس کی اطاعت کے دوران معصیات خلل نہ ڈالیں۔ اور یہ دونوں صفتیں ولی میں ضروری ہیں۔ جب یہ دونوں صفتیں اس میں موجود ہونگی تب حقیقت میں وہ ولی ہو گا۔ اور ہر حال میں خوشی میں اور تنگی میں ہمیشہ اللہ کو یاد رکھنا اور اس پر نظر رکھنا اس کا کام ہو گا۔ نمبر[2]

قرآن مجید میں ہے !

سن تو اللہ کے دوستوں پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ہمیشہ پرہیزگاری کرتے رہے ان کے لئے دنیا کی زندگی میں خوشخبری ہے اور آخرت میں بھی۔ نمبر[3]

ایک اور آیت میں ہے !

اس کے اولیاء تو صرف پرہیزگار ہی ہیں۔ نمبر[4]

ایک اور آیت ہے !

تحقیق وہ لوگ کہ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب خدا ہے اور پھر اس پر قائم رہے ان پر فرشتے اترتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کہ مت ڈرو اور مت غم کھاؤ اور خوشخبری ہو اس جنت کی کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ نمبر[5]

نمبر 1 تکمیل الایمان از شیخ عبدالحق محدث دہلوی ترجمہ پیر اقبال احمد ص ۱۸۷

نمبر 2 نفحات الانس ترجمہ محمد ادریس الغازی ص 51

نمبر 3 س یونس آیت 62   نمبر 4 س الانفال آیت 34

نمبر 5 س سجدہ آیت 30 تا 32

ہم تمہارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں اور تمہارے لئے ہے اس میں جو تمہارے نفس چاہیں اور تمہارے لئے اس میں ہے جو کچھ تم مانگو یہ مہمانی ہے غفور اور رحیم کی طرف سے۔[نمبر 1]

اولیائے کرام کا ذکر کرتے ہوئے مجدد الف ثانی فرماتے ہیں!

"درحقیقت اہل اللہ کا وجود ہی کرامت ہے اور خلق کو حق تعالیٰ کی طرف دعوت کرنا اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے اور مردہ دلوں کو زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے آیت عظمیٰ ہے۔ یہی لوگ اہل زمین کا امن اور غنیمت روزگار ہیں۔ بہم یرزقون اور بہم یمطرون (انہی کے طفیل لوگوں کو رزق ملتا ہے اور انہی کے طفیل بارش اترتی ہے) انہیں کی شان میں وارد ہے ان کا کلام دوا اور ان کی نظر شفا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہم نشین ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کا ہم نشین بد بخت نہیں رہتا اور ان کا دوست رحمت حق سے نا امید نہیں ہوتا۔[نمبر 2]

اولیائے عظام وہ مبارک ہستیاں ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایات نازل ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کو خاص توفیق عطا ہوتی ہے۔ جس کی بدولت وہ محیر العقول کارنامے سر انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں حضرت مریم کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

"جب کبھی زکریا علیہ السلام اس (مریم) کے پاس اسکی نماز پڑھنے کی جگہ جاتے تو اس کے پاس رزق پاتے پھر زکریا نے مریم سے پوچھا کہ یہ رزق تیرے پاس کہاں سے آیا اللہ تعالیٰ کے پاس سے آیا ہے۔ بے شک اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔[نمبر 3]

قرآن مجید میں ایک اور ولی کا ذکر یوں آیا ہے!

"تو جس کے پاس علم کتاب تھا اس نے سلیمان سے عرض کی کہ میں آپ کے پلک جھپکانے سے پہلے اس تخت کو آپ کے سامنے لا سکتا ہوں۔ پھر جب سلیمان نے اس تخت کو اپنے پاس دیکھا تو فرمایا یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔ اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ اپنی ہی بھلائی کیلئے شکر کرتا ہے۔ اور جو کوئی ناشکری کرے تو بے شک میرا رب سب

نمبر 1 = پارہ نمبر 24 س السجدہ آیت 30 - 32 نمبر 3 = س آل عمران آیت 36۔

نمبر 2 = اردو ترجمہ مکتوبات امام ربانی دفتر دوم مترجم قاضی عالم الدین مکتوب 92

سے بے پرواہ ہے۔"[نمل]

منقبت نگاری کی قسمیں۔

اہل بیت اطہار، صحابہ کرام اور بزرگان دین کے ذکر و توصیف میں لکھے گئے اثاثہ مناقب پر اگر گہری نظر ڈالی جائے اور اس صنف کا اس کے تخلیقی پس منظر اور محرکات کے حوالے سے تجزیہ کیا جائے تو اسکی دو واضع قسمیں دکھائی دیتی ہیں۔

1۔ رسمی منقبت۔

یہ وہ منقبت ہے جو محض ایک شعری روایت کے مطابق تبرکاً اور رسماً لکھی جاتی ہے۔ شعراء نے اپنے دواوین (مقیاسوں) کی ترتیب اور مثنوی یا منظوم داستان کا آغاز کرتے ہوئے حمد و نعت کے بعد اہل بیت، خلفائے راشدین اور اپنے اپنے پیر و مرشد اور خاص طور پر شیخ عبدالقادر جیلانی کی توصیف میں چند اشعار ضرور لکھے ہیں۔ بعض شعراء نے صرف اہل بیت کے ذکر کو کافی سمجھا ہے۔ بعض نے اپنے عقیدے اور مسلک کو سامنے رکھتے ہوئے صرف خلفائے راشدین کی تعریف کی ہے۔ اور بعض شعراء کے ہاں مذکورہ بالا تینوں صورتیں موجود ہیں۔ مدح اہل بیت اور صحابہ کرام کی روایت کو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم شعراء نے بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس التزام کے محرکات دراصل وہی ہیں جو حمد و نعت کے ہیں یعنی حصول ثواب اور برکت طلبی۔

منقبت گوئی کا اساسی محرک اہل بیت، صحابہ کرام اور بزرگان دین کی محبت و عقیدت ہے اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا منقبتی کلام خلوص صداقت سے عاری ہے مگر اس جذبے کا اظہار محض عقیدہ کی بنا پر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اردو کے موجودہ سرمایہ منقبت کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ رسمی انداز میں لکھے جانے والے مناقب کی تعداد بھی کچھ کم نہیں لیکن چونکہ ان کے لکھنے والوں نے انہیں محض حصول ثواب اور خیر و برکت کی طلب کیلئے حمد و نعت کے ساتھ بطور تبرک لکھا ہے۔ لہٰذا ان کی حیثیت محض رسمی ہے اور ان کے اندر وہ کیف نہیں ہے جو حقیقی منقبت کی روح (میں) ہے۔ لہٰذا

نمل۔ سورۃ النمل آیت 40

مقصدی منقبت -

منقبت کی دوسری قسم مقصدی منقبت ہے یہ وہ قسم ہے جو منقبتی شاعری کے معیاری سرمائے پر مشتمل ہے اور جس کے لکھنے والوں نے اسے نہ صرف ادبی صنف سخن کے طور پر قبولیت عام بخشی بلکہ شاعری کے فنی لوازمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے پورے جذبہ و انہماک سے اسے ایک ادبی اور فنی معیار عطا کرنے کی بھرپور کوشش کی -

مقصدی منقبت میں بھی حصول ثواب کا تصور کار فرما ہوتا ہے مگر رسماً یا عقیدتاً نہیں ہوتا یہاں ممدوح کے اوصاف حمیدہ - روحانی تصرفات اور ذاتی یا اجتماعی مسائل کے حل کے سلسلہ میں اعانت طلبی کا رجحان گہرا اور تفصیلی ہوتا ہے - منقبت میں ان بزرگوں کے حوالے سے حضور اکرم کے ساتھ اظہار محبت و شیفتگی بھی ہوتا ہے - جو بین السطور دیکھا جا سکتا ہے - عصر جدید میں ممدوح کی عظمت کردار کو واضع کر کے قوم کو عمل پر ابھارنے کا انداز نمایاں ہوا ہے - اس سلسلہ میں جوش کی نظم "حسین اور انقلاب" کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے -

منقبت کے مضامین -

۱ - اظہار عقیدت -

ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں میں جو اصناف شاعری مقبول ہوئیں - ان میں نعت و منقبت سر فہرست ہیں - نعت رسول اللہ مذہبی شاعری کے مقدمات میں شامل ہے - جس کا تعلق دینی اساس صدق ، اخلاص اور محبت رسول سے ہے - اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی شاعری کی ابتداء میں نعت کو اولیت حاصل ہے تو یہ زیادہ صحیح ہے - سرور کائنات کے ساتھ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو جو گہری محبت اور والہانہ شیفتگی ہے اس کے سبب آپ کے اہل بیت ، اصحاب اور اولیاء بھی محترم ٹھہرے اور شعراء نے انہیں خراج عقیدت پیش کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا - اس طرح نعت کے ساتھ منقبت بھی صنف سخن کے طور پر رائج ہوئی - سیّد عالم خدائے بزرگ و برتر کے نور کی اولین جھلک ہیں اور اہل بیت رسول اور اولیائے کرام ذات نبی سے مستنیر ہیں - اس تصور نے بھی عقیدت مندی کے جذبات کو گہرائی عطا کی اور منقبت نگاروں نے اس سلسلہ میں بڑے آبدار شعر نکالے - عقیدت مندی کے اظہار کیلئے ایک خاص لہجے کے علاوہ ایک خاص زبان بھی درکار ہوتی ہے - جس کے الفاظ

پاکیزہ ہوں ۔ لطیف و شیریں ہوں ۔استعارات و تشبیہات عامیانہ نہ ہوں ۔ان میں ایک خاص شان دل آویزی و دل فریبی ہو۔ اور عقیدت و محبت کلے اظہار لطافت اور پاکیزگی سے کیا گیا ہو چنانچہ منقبت نگاروں نے ایسی ہی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا جس کی وجہ سے منقبت کی فضا پاکیزہ اور پرنور ہو جاتی ہے ۔

2۔ بزرگان دین کی زندگی کی جھلکیاں ۔

منقبت نگاروں نے صحابہ کرام آئمہ عظام اور بزرگان ذوی الاحترام سے اظہار عقیدت کے علاوہ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔ایسے اشعار اخلاقی درستی کیلئے مشعل راہ کا کام دیتے ہیں ۔ نیز یہ کہ اس قسم کی نظمیں مذہب سے لگاؤ اور محبت پیدا کرنے میں بڑی ممد ثابت ہوتی ہیں ۔ ہادیاں امم اور داعیان حق کسی ایک گروہ یا قبیلہ کی ہدائت کیلئے نہیں آتے بلکہ تمام بنی نوع انسان کو صراط مستقیم دکھانے کیلئے آتے ہیں ۔اس لئے ان کا پیغام عالمگیر ہوتا ہے اور ہر مذہب و ملت کا فرد ان کے پیغام اور سیرت پاک سے فیضان حاصل کر سکتا ہے ۔چنانچہ نعتیہ اور منقبتی شاعری میں صرف مسلمان شاعروں نے ہی گلہائے عقیدت پیش نہیں کئے بلکہ غیر مسلم شاعروں نے بھی آئمہ اہل بیت اور دوسرے بزرگان دین سے اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے ۔

3۔ نجات اخروی ۔

جو مدحیہ قصائد کسی دنیوی بادشاہ یا امیر کی شان میں لکھے جاتے ہیں وہ اس بادشاہ یا امیر کے انتقال کے بعد داستان پارینہ بن جاتے ہیں ۔نیز یہ کہ شاعر کے سامنے مادی منفعت ہوتی ہے ۔اور وہ اپنے ممدوح کو خوش کرنے کیلئے انتہائی مبالغے سے کام لیتا ہے ۔ اور ایک کمزور امیر کو رستم کی طرح بہادر حاتم کی طرح سخی اور قیصر روم سے زیادہ پر شکوہ بنا دیتا ہے ۔ امیر اس جھوٹی تعریف کو سنتا ہے اس کا نفس موٹا ہوتا ہے اور وہ شاعر کا دامن نوازشات سے بھر دیتا ہے لیکن دین کی برگزیدہ ہستیاں کسی شاعر کی جھولی مال و دولت سے نہیں بھرتیں ۔ اس لئے ان کا ذکر، ذکر خیر سمجھ کر کیا جاتا ہے ۔ایسا ذکر جو مادی منفعت کے بجائے نجات اخروی کا سامان فراہم کرتا ہے ۔اس احساس کے پس منظر میں یہ تصور کار فرما ہے کہ انسانوں میں سے سب سے افضل ذکر

حضور سرور کائنات کا ہے ۔اور اس کے بعد صحابہ کرام ، اہل بیت اور اولیاء کا تذکرہ باعث برکت ہے ۔اسی لئے یہ نظمیں داخلی شاعری کا عمدہ نمونہ اور صداقت جذبات کا اعلیٰ مرقع پیش کرتی ہیں ۔مدحیہ قصائد میں بے جا مداحی اور غلو کی وجہ سے معاشرے میں جو غلط روش پیدا کی ان کی تلافی ان نظموں نے کر دی ہے ۔ مدحیہ نظموں کی یہ وہ قسم ہے جو کبھی زوال پذیر نہیں ہوگی اور نہ کبھی اس کی افادیت میں کمی آئے گی ۔ اس قسم کے قصائد کے بارے میں سید امداد امام اثر لکھتے ہیں !

" قصیدہ کی اصل غائت یہ ہے کہ شاعر کے پیرائے میں مسائل اخلاقی و معاشرت و تمدن و معاش و معاد وغیرہ کی تعلیم دینی و دنیوی بنی آدم کو نصیب ہو ۔یا حمد خداوند نعت محمد مصطفیٰ اور منقبت علی المرتضیٰ و آئمہ با صفا سے شاعر کو ثواب عقبیٰ حاصل ہو اور سامعین کو ذکر خدا اور رسول و آئمہ سے توفیق عبادت پیدا ہو [نمبر]"

4 ۔ استعانت طلبی ۔

جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے ۔ اسی کی ذات تکالیف و مصائب میں اپنے بندوں پر کرم فرماتی ہے ۔وہی عبادت کے لائق ہے ۔اور اسی سے مدد مانگنی چاہیئے ۔تمام کائنات کو اسی نے پیدا کیا ہے ۔اس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا ۔وہی ہے جس نے آدم کو پیدا کیا ۔اور اسے علم اشیاء عطا فرما کر فرشتوں پر اسے فضیلت بخشی وہ جسے چاہتا ہے جتنا چاہتا ہے دیتا ہے ۔ اس نے اپنے نیک بندوں کو بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے اس کی بے گراں عنائیتوں نے اپنے ولیوں کو صاحب تصرف و کرامت بنایا ہے ۔ان بزرگوں سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے ۔ گمراہوں کو ہدائت ملتی ہے ۔وہ رسول کے نائب ہیں ۔اور ان کے معارف و علوم کے وارث ہیں ۔وہ نور بصیرت سے کائنات کے اسرار کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔اور ان پر غیب کے حجابات کھل جاتے ہیں ۔وہ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں سے ہر اس شخص کی اعانت کرتے

نمبر = کاشف الحقائق جلد دوم ص 196

ہمیں جو ان کو پکا رتا ہے اسی تصور نے منقبت نگاری میں اعانت طلبی کے مضامین کو شامل کیا ہے -

غوث اعظم سے جو مانگو گے ملے گا حسرت

بس کہو حاضر دربار ہوں شیئاً للہ

" حسرت موہانی "

بزرگوں سے لوگوں کو کیا فیض ملتا ہے - اس کی بیشمار مثالیں ملتی ہیں -

شاہ ولی اللہ نے اپنے والد بزرگوار کے حوالے سے لکھا ہے !

" اکبر آباد میں مرزا محمد زاہد کے درس سے واپسی کے دوران راستہ میں ایک لمبے کوچے سے میرا گزر ہوا - اس وقت میں شیخ سعدی کے یہ اشعار پڑھ رہا تھا - اور خوب ذوق وشوق حاصل تھا -

جز یاد دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است

جز سر عشق ہر چہ بخوانی بطالت است

سعدی بشو تو لوح دل از نقش غیر حق

علمے کہ راہ حق ننماید جہالت است

چوتھا مصرعہ میرے ذہن سے نکل گیا اس سبب سے میرے دل میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا - اچانک ایک فقیر منش دراز زلف یلح چہرہ مرد پیر ظاہر ہوا اور کہا !

علمے کہ راہ حق ننماید جہالت است

میں نے کہا جزاک اللہ خیر الجزاء آپ نے میرے دل سے بہت بڑی بے چینی اور اضطراب کو دور فرمایا - پھر میں نے ان کی خدمت میں پان پیش کیا - مسکرائے اور فرمایا ! یہ یاد دلانے کی اجرت ہے - میں نے عرض کیا نہیں یہ شکرانہ ہے - فرمایا میں نہیں کھاتا - پھر فرمایا مجھے جلدی جانا ہے - میں نے کہا ! میں بھی جلد چلوں گا - فرمایا ! میں بہت جلد جانا چاہتا ہوں اور قدم اٹھا کر کوچے کے آخر میں رکھا - مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ روح مجسم ہے - میں پکار اٹھا مجھے اپنے نام سے تو آگاہ کیجئے تاکہ فاتحہ پڑھ سکوں - فرمایا - سعدی یہی فقیر ہے [نمط] "

نمط = انفاس العارفین ص 80

شاہ ولی اللہ ایک اور جگہہ لکھتے ہیں ۔

" شیخ عبدالباقی لکھنوی ایک ایسا مرد تھا کہ جس نے وحدت الوجود کی بہت سے کتابیں دیکھی ہوئی تھیں ۔ قصور فہم کی وجہ سے طاعات اور اعتقاد اسلامیہ میں ایک طرح کا تساہل کرتا تھا ۔ اس کی وفات کے بعد حضرت والا (والد بزرگوار) اس کی قبر پر تھوڑی دیر بیٹھے اور فرمایا اس تساہل کی وجہ سے وہ ماخوز ہے لیکن میں نے اس کی شفاعت کر دی ہے[1] "۔

حدیث شریف میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ نے کہ میرے رحم دل امتیوں سے حاجتیں مانگو ان سے فضل طلب کرو ۔ ان سے بھلائی چاہو رزق پاؤ گے ۔ مرادوں کو پہنچوگے ۔ ان کے دامن میں آرام سے رہو گے ان کی پناہ میں چین کرو گے ۔ ان میں میری رحمت ہے[2] "۔

صرف زندگی ہی میں نہیں انتقال کے بعد بھی اولیاء کے تعرفات جاری رہتے ہیں ۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب تفسیر عزیزی میں اکابر اولیاء کا حال بعد انتقال لکھتے ہیں !

" اولیاء اللہ بعد انتقال دنیا میں تصرف فرماتے ہیں ۔ اور ان کے استغراق کا کمال اور مدارج کی رفعت ان کو اس سمت توجہ دینے کی مانع نہیں ہے اویسیان اپنے کمالات باطنی کا اظہار فرماتے ہیں ۔ اور حاجت مند لوگ اپنی مشکلات کا حل اور حاجت روائی انہی سے طلب کرتے ہیں ۔ اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں[3] "۔

<u>اعانت از مزارات اولیاء</u>

اعانت از مزارات اولیاء کے سلسلہ میں شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں !

" ترکستان میں ایک مقلہ نامی مرد تھا ۔ جس نے اس راہ (راہ طریقت) کا ذوق پیدا کیا تھا ۔ بخارا میں آیا ۔ اور خواجہ نقشبند کے مزار پر اس انتظار میں بیٹھا کہ اسے کسی ولی للہ کی اطلاع ملے ۔ آخر کار خواجہ نقشبند نے خواب میں انہیں فرمایا کہ تیرا پیر ہندوستان میں دہلی شہر کے اندر ہے اور حضرت والا (والا گرامی شاہ ولی اللہ) کی شکل اسے دکھائی اس کے دل میں خیال گزرا کہ دہلی بہت بڑا شہر ہے اس بزرگ کو وہاں تلاش کرنا بڑا مشکل کام ہوگا ۔ خواجہ کو

نمبر 1 = انفاس العارفین ص 84 نمبر 2 = الامن والعلی از مولانا احمد رضا خان ص 70

نمبر 3 = بحوالہ الامن والعلیٰ از مولانا احمد رضا خان ص 54 ۔

ان کے اس خیال کی خبر ہو گئی فرمایا جس روز تم دہلی پہنچو گے اسی روز انہیں وعظ کرتے ہوئے پاؤ گے بہر شوق اسی کشاں کشاں دہلی لے آیا - حضرت والا معلوم حلیے کے مطابق ملے - نماز کے بعد جو وعظ فرمایا اس سے بھی اس کی تائید ہوئی - جمعہ سے فراغت کے بعد گھر آیا - پگڑی اتار کر پاؤں میں رکھ دی - حضرت نے بیعت و تلقین سے مشرف فرمایا"[1] -

اولیاء کرام کی بعد از وصال فیوض و برکات اور کرامات و تصرفات بھی ان کی شخصیت کا جزو بن گئیں - اور منقبت نگاروں نے انکی سیرت اور مذہبی خدمات کے ساتھ ان کے روحانی تصرفات کو بھی اپنا موضوع بنایا - چنانچہ داغ دہلوی کہتا ہے !

مزار اولیاء سے فیض حاصل کر کہ اے نادان

ہمیشہ زندہ رہتے ہیں کہیں یہ مرنے والے ہیں

مرزا مظہر جان جاناں کہتے ہیں کہ !

اولیائے کرام کے مزارات کی زیارت سے جمعیت کا فیض طلب کرو اور مشائخ کرام کی ارواح طیبہ کو فاتحہ اور درود کا تحفہ پہنچا کر بارگاہ الہی میں وسیلہ بناؤ - کیونکہ ظاہر و باطن کی سعادت اس سے حاصل ہوتی ہے"[2]

سرور کائنات اور اولیاء سے توسل اختیار کرنا بھی اعانت طلبی کا ہی ایک رخ ہے - مولانا اشرف علی تھانوی سنن ابن ماجہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک شخص نابینا آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور معروض ہوا کہ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالی مجھ کو عافیت دے - آپ نے فرمایا اگر تو چاہے اس کو ملتوی رکھوں - اور یہ زیادہ بہتر ہے - اگر تو چاہے تو دعا کروں اس نے عرض کی دعا ہی کیجئے آپ نے اس کو حکم دیا کہ وضو کرے - اور اچھی طرح وضو کرے اور دو رکعت پڑھے اور یہ دعا کرے !

اے اللہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں اور آپ ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں - بوسیلہ محمد نبی رحمت کے - اے محمد میں آپ کے وسیلے سے اپنی اس حاجت کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا ہوں - کہ پوری ہو جائے - اے اللہ آپ کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما"[3]

نمبر1 = انفاس العارفین ص 95   نمبر2 = تذکرہ مشائخ نقشبند علامہ نور بخش توکلی ص 302

نمبر3 = نشر الطیب ص 300

مولانا تھانوی اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے توسل صراحتہً ثابت ہوا ہے ۔ اور چونکہ آپ کا اس کے لئے دعا فرمانا کہیں منقول نہیں اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح توسل کی دعا جائز ہے ۔ اسی طرح توسل دعا میں کسی کی ذات کا بھی جائز ہے اور حاصل توسل فی الدعا یہ ہے کہ اے اللہ فلاں بندہ آپ کا مورد رحمت ہے اور مورد رحمت سے محبت اور اعتقاد رکھنا بھی موجب جلب رحمت ہے اور ہم اس سے محبت اور اعتقاد رکھتے ہیں پس ہم پر بھی رحمت فرما اور توسل بالاعمال میں بھی تھوڑے تغیر کے ساتھ یہی مراد ہے کہ یہ اعمال آپ کے نزدیک موجب رحمت ہیں اور ان کا فاعل بھی مرحوم ہوتا ہے اور ہم نے یہ اعمال کئے ہیں ۔ پس ہم پر بھی رحمت فرما "۔ نمبر1

حضرت عمر کے زمانے میں شدید قحط پڑا ۔ انہوں نے خدا کے حضور بارش کے لئے بڑی زاری کی اور حضرت عباس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا کہ اے اللہ ہم تیرے آگے تیرے نبی کے چچا کو شفیع بناتے ہیں کہ ہم سے قحط کو دور کر دے اور ہمیں بارش سے سیراب کر دے ۔ لوگ ہٹنے نہ پائے تھے کہ بارش سے سیراب کر دیئے گئے اور آسمان چند روز تک ان پر برستا رہا ۔ نمبر2

مولانا تھانوی رکھتے ہیں کہ اس حدیث سے غیر نبی کے ساتھ توسل بھی جائز نکلا ۔ جب کہ اس کو نبی سے کوئی تعلق ہو ۔ قرابت حسیہ کا یا قرابت معنویہ کا "۔ نمبر3

رسول اکرم سے بالواسطہ اظہار محبت ۔

اہل بیت رسول ، صحابہ کرام اور اولیائے عظام کی تعریف و توصیف کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کو نبی اکرم کے ساتھ گہری وابستگی ہے ۔ وہ قرآن پاک کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ سنت نبوی کو بھی اپنے لئے مشعل راہ سمجھتے ہیں ۔ اسی لئے انہیں رسول اکرم کے نائب ہونے کا منصب حاصل ہے ۔ مسلمانوں کو آنحضرت کی ذات اقدس سے بے پناہ محبت ہے یہی محبت اور شیفتگی مسلمانوں کے ایمان کا پیمانہ ہے ۔ بزرگان دین کا حضور کے ساتھ وابستہ عقیدت رکھنا ہی ان کے محترم ہونے کا سبب ہے ۔ اس لئے منقبت نگاری بالواسطہ آنحضرت ہی سے محبت کا اظہار ہے ۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا جو شخص میرے صحابہ سے

نمبر1 = نشر الطیب ص 301 نمبر2 = صحیح بخاری نمبر3 نشر الطیب ص 302

محبت کرتا ہے وہ میری وجہ سے کرتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ میرے بارے میں اس کے دل میں جو بغض ہے اس کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے ۔

یہ وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے دین کو پھیلانے میں اور اس کے روحانی پہلوؤں کی ترویج کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں ۔ لہٰذا ان سے عقیدت و محبت کا اظہار بھی بالواسطہ آنحضرتؐ ہی سے عقیدت و محبت کا اظہار ہے ۔

حضرت حسان بن ثابت نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی منقبت میں کہا !

" وہ اپنی ترتیب کے لحاظ سے دوسرے ہیں ان کے خصائص محمود ہیں وہ تمام مخلوق میں سب سے پہلے ہیں جنھوں نے رسول اللہ کی تصدیق کی "۔

فرزوق نے حضرت امام زین العابدینؓ کے بارے میں کہا !

" یہ خیر العباد کا فرزند ہے ، یہ نقی ۔ تقی طاہر اور سیّد ہے ۔ یہ ابن فاطمہ ہے ۔ اگر تو ناواقف ہے ۔ ان کے نانا خاتم المرسلین ہیں ۔"

کمیت اسدی نے اہل بیت کی تعریف میں لکھا !

" مرے لئے تو آل محمدؐ ہی مقتدیٰ ہیں ، اور ہی مرے لئے مرجع حق ہیں ۔"

امام شافعی نے آل عبا کی منقبت میں کہا ۔

" اگر میرا گناہ حب آل محمدؐ ہے تو میں اس گناہ سے کبھی توبہ نہیں کروں گا "۔

فردوسی کا شعر ہے !

منم بندہ اہل بیت نبی
تا یسندہ خاک پائے وصی

ناصر خسرو ۔ قرآن بود و شمشیر پاکیزہ حیدر
دو بنیاد دین متین محمد

امیر خسرو مثنوی مطلع الانوار میں خواجہ نظام الدین اولیاء کی منقبت لکھتے ہوئے کہتے ہیں !

سکۂ کارش بفروع و اصول
تابع قال اللہ و قال الرسول

مومن نے حضرت عمر فاروق کے قصیدہ مدحہ میں کہا !

معاندو ، جو کہا خاتم رسالت نے

کہ میرے بعد نبوت کسے تھا عمر قابل

یہی خلافت را شدکی اسکو بس ہے دلیل

یہی امامت ہر حق کی اس کو بس ہے سجل

علامہ اقبال نے حضرت صدیق اکبر کے بارے میں کہا !

پروانے کو چراغ بلبل کو پھول بس

صدیق کیلئے ہے خدا کا رسول بس

جمرہ اللغت نے منقبت کی جو تعریف کی ہے اسکی رو سے منقبت گوئی میں حضور کا ذکرجمیل منقبت کا ایک لازمی جزو ہے ۔ سیّد دوعالم کے ساتھ ہی گہرا رابطہ والہانہ شیفتگی عقیدت ومحبت کی رفعت ان بزرگوں کی تعریف و توصیف کا سبب بنی ۔اور منقبت نگاروں نے اسی حوالے سے ان کی تحسین کی ۔اور اپنی دعاؤں میں ان کا توسل اختیار کیا ہے ۔

تحفّظ ناموس بزرگان دین ۔

اپنی دینی اور روحانی مصروفیات اور حضور سے رشتہ نیاز مندی کی بدولت جب بزرگان دین دشمنوں کے طعن و تشنیع کا ہدف بنے تو منقبت نگاروں نے اپنے قلم سے ان کے ناموس کا تحفظ بھی کیا ۔حسان بن ثابت نے حضرت ابوبکر صدیق کو اپنی نظم کا موضوع اس وقت بنایا جب دشمنان اسلام نے ان کے خلاف زبان طعن دراز کی فرزوق نے اپنا مشہور عالم قصیدہ یمیہ اس وقت تحریر کیا جب ہشام نے حضرت امام زین العابدین کے بارے میں توہین آمیز رویہ اختیار کیا ۔بنو امیہ کے دور میں جب اہل بیت کی عزت ظالموں کی زبان اور ان کے ہاتھ سے غیر محفوظ ہوگئی تو کمیت اسدی جیسے محبان اہل بیت نے "ہاشمیات" کے نام سے بنو ہاشم کی حمایت میں زور دار قصائد لکھے ۔ جب آل عبا کی محبت رفض کا مترادف تصور ہونے لگی تو امام شافعی جیسے فقہیوں نے بھی اپنے اشعار میں ان کی پر زور تردید کی ۔ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بزرگان دین اپنے

کی عزت کی حفاظت اور ان کی دینی خدمات کا اعتراف بھی منقبت نگاری کا ایک اہم محرک رہا ہے۔

منقبت نگاری کے مجلسی اور دیگر محرکات ۔

1 ۔ عرس ۔

منقبت نگاری کے محرکات میں جن تقریبات کو اساسی حیثیت حاصل ہے ان میں عرس کو اولیت حاصل ہے ۔ اس کا لغوی مفہوم " مہمانی و طعام عروسی و نکاح " ہے "مجازاً بمعنی مجلس طعام فاتحہ بزرگان کہ بروز وفات بعد از سالی کند چرا کہ رحلت از غمکدہ دنیا بمنزلہ شادی عروسی است"[1] مجازی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی لکھتے ہیں !

" بزرگوں کے دنیا چھوڑنے کو وصال کہتے ہیں ۔ وصال کے معنی ملن کے ہیں ۔ بزرگوں کا انتقال کرنا عام لوگوں کی موت جیسا نہیں ہوتا ۔ یہ حضرات اللہ کے لئے زندہ رہتے ہیں اور اللہ ہی کے لئے جان دیتے ہیں ان کو ہمیشہ کی زندگی ملتی ہے اور موت کا دن ان کے لئے گویا اپنے محبوب اور مطلوب اور مالک خدا سے ملنے کا دن ہوتا ہے ۔ اسی وجہ سے ان کی سالانہ برسی کو عرس کہتے ہیں ۔ عرس کے معنی شادی کی دعوت یا قافلے کے پڑاؤ کے ہوتے ہیں ۔ جس طرح شادی کے دن دولہا دلہن ملتے ہیں اور دھوم دھام کی دعوت ہوتی ہے یا قافلہ ایک منزل سے دوسری منزل پر پہنچ کر پڑاؤ کرتا ہے اسی طرح بزرگ بھی دنیا کی منزل سے کامیاب گزر کر آخرت کی منزل کو پہنچتے ہیں ۔ اور ان کے خدا کو ملنے کی خوشی میں شادی کی سی دھوم دھام کی جاتی ہے"[2]

بزرگوں کی برسی پر عرس کی محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں ۔ ان محفلوں میں علمائے دین، دین کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ اور یوں یہ محفلیں تبلیغ دین کے سلسلہ میں اہم خدمات سر انجام دیتی ہیں ۔ علاوہ ازیں اولیاء اللہ کی اخلاقی تعلیمات اور فیوض و برکات کا تذکرہ ہوتا ہے ۔ اور صاحب عرس کی عظمت و فضیلت پر تقریریں ہوتی ہیں ۔ شعراء اس موقعہ پر اشعار کے ذریعے اپنی عقیدت اور نیاز مندی کا اظہار کرتے ہیں ۔ اور اپنے ممدوح کے حالات زندگی اور روحانی کمالات کو سامنے لاتے ہیں ۔ بر صغیر پاک و ہند میں تصوف کے مختلف سلاسل سے وابستہ صوفیاء مشائخ اور بزرگان دین کے اعراس کا ایک پھیلا ہوا سلسلہ ہے ۔ سال میں بمشکل کوئی ایسا ہفتہ ہوگا ۔ جس

1۔ فرہنگ آنند راج

2۔ تذکرہ نظامی ص ۶۰

میں کسی قطب ۔غوث ۔ولی یا بزرگ کا عرس نہ منایا جا رہا ہو ۔ تقویم دارالاحسان 1399ھ ،

979ء کے مطابق سال میں اعراس المیلاد المبارک کی تعداد 150 کے قریب بنتی ہے ۔ ان

میں میلاد النبی کے علاوہ خلفائے راشدین ، صحابہ کرام ۔صوفیاء مشائخ ۔بزرگان دین اور

دوسری دینی ۔مذہبی اور ملی شخصیات کے اعراس المیلاد کی نشاندہی کی گئی ہے "نمبر 2

سماع ۔ عرس کے ساتھ محفل سماع کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے ۔ سماع کے لغوی معنی سننے

کے ہیں مگر اصطلاح تصوف میں اس کے معنی "قوال کا اپنی فطری آواز سے موزوں اشعار پڑھنا "ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ سماع کے انداز بدلتے گئے اور آواز کے ساتھ ساز بھی شامل ہو گئے ۔سماع

کو صوفیاء نے چند تحفظات کے ساتھ مباح قرار دیا ہے ۔ اور اسے تزکیہ نفس اور صفائی باطن

کا اہم ذریعہ خیال کیا ہے ۔ نیز طبیعت کے انقباض کو دور کرنے اور انشراح صدر کے علاوہ رقت اور

گداز کے لئے بھی ضروری تصور کیا ہے ۔اس ضمن میں حضرت جنید بغدادی کا یہ قول بھی توجہ

طلب ہے کہ " اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ نماز نفل سماع سے بہتر ہے تو بھی میں نوافل میں

مشغول نہ ہوں اور سماع سنوں " سیّد نور الحسن مودودی اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں

کہ ا ۔ حضرت جنید نے یہ اس لئے فرمایا کہ نغمہ کو روح کے ساتھ یوم الست سے ایک خاص تعلق ہے

دوسرے سماع میں جو یکسوئی حاصل ہوتی ہے وہ عام طور پر نوافل میں میسر نہیں آتی اور کل دارو مدار

سکون قلب پر ہے "۔ انہوں نے اس سلسلہ میں حضرت شیخ المشائخ خواجہ مودود چشتی قدس سرہ

کے اس جواب کا بھی ذکر کیا ہے جو انہوں نے امام شمس الائمہ گرگانی کے سوال (کہ فقہی مسئلہ سے

قطع نظر سلوک میں سماع بہتر ہے یا نفلی نماز) کا جواب یہ دیا کہ اگر کوئی شخص دوگانہ نماز نفل

بہ تمام شرائط اور ارکان مقرب یا اخلاص تمام ادا کرے تو اللہ کے نزدیک اس کے قبول ہونے میں احتمال

ہے ۔مگر سماع کا جذبہ ۔جذبات حق میں سے ہے ۔اور عین مقبول ہے "۔ سماع کی ان محفلوں

میں نعت رسول مقبول کے علاوہ صاحب عرس بزرگ کے مناقب بھی پیش کئے جاتے ہیں ۔ اس طرح

نمبر ا = فرہنگ آنند راج

نمبر 2 = اردو ، نعت [illegible] ۔ غیر مطبوعہ مقالہ ڈاکٹر ریاض مجید ۔ پنجاب یونیورسٹی مدیر ی

منقبت نگاری کو تحریک ملتی ہے ۔اس کا ذوق و شوق بڑھتا ہے ۔چنانچہ کئی ایسے مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ جو ایسے موقعوں پر پیش کئے جاتے ہیں ۔ سماع میں پڑھا جانے والا کلام عارفانہ نوعیت کا ہوتا ہے اور اس میں حمد ۔نعت اور بزرگان دین کی منقبت شامل ہوتی ہے ۔ سلوک کی ایک منزل فنافی الشیخ کی منزل ہے ۔جس سے آگے فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کی منزلیں آتی ہیں فنا فی الشیخ کی منزل پر فائز ہونے کے لئے ایک طریقہ مدح شیخ کی سماعت بھی ہے ۔

منقبتی مشاعرے ۔

مشاعرے شاعری کے فروغ کا اہم ذریعہ ہیں ۔اردو میں مشاعرے کی روایت بہت پرانی ہے ۔ مذہب کے حوالے سے جو مشاعرے منعقد ہوتے ہیں ۔ ان میں نعتیہ مشاعرے سر فہرست ہیں ۔گذشتہ چند برسوں میں ان مشاعروں کو خصوصی فروغ حاصل ہوا ہے ۔اور مختلف ادبی تنظیموں کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی ایسے مشاعروں کا اہتمام کیا گیا ہے ۔ منقبتی مشاعروں کا آغاز لکھنؤ سے ہوا ۔لکھنؤ میں یکم محرم سے آٹھ ربیع الاول تک زمانہ عزا مقرر ہوا تھا ۔ ان سوا دو مہینوں میں تمام شہر سوگوار رہتا تھا ۔ چنانچہ جذبات کی تطہیر کیلئے حضرت ناصر الملت کے شریعت کدہ چہاردہ معصومین میں سے ہر ایک کی ولادت کے موقع پر محافل میلاد منعقد ہوتی تھیں۔ جن میں مشاعرے کا خصوصی اہتمام ہوتا تھا ۔جن میں ولادت معصومین کے علاوہ ان کے فضائل و مناقب کا تذکرہ بھی ہوتا تھا ۔ حال ہی میں بعض شہروں میں[نمل] خلفائے راشدین کے ناموں سے منسوب مشاعروں کا اہتمام گیا گیا جن میں ملک کے مقتدر شعراء نے شرکت کی اور جن کو سامعین نے بڑے جذب شوق سے سنا ۔

اخبارات و رسائل ۔

دینی تعلیمات کو پھیلانے اور فکر و نظر کو مضبوط مذہبی بنیاد فراہم کرنے میں دینی رسائل نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے ۔ان رسائل میں بزرگان دین کے احوال و آثار کے علاوہ ان کے

نمل = کراچی ۔ملتان ۔جھنگ ۔وغیرہ ۔

بارے میں منظوم نذرانہ عقیدت بھی شامل ہوتا ہے۔ بعض رسائل نے خصوصی نمبر بھی شائع کئے ہیں۔ گذشتہ چند سالوں میں قومی اخبارات نے ملی اور اسلامی ایڈیشنوں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ ان اشاعتوں میں اہل بیت اور دیگر بزرگان دین کے مناقب بھی شائع ہوتے ہیں۔

منقبت اور سلام۔

شبلی نے سلام کے آغاز پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اردو شاعری کی اصل بنیاد غزل پر قائم ہوئی۔ اقسام سخن میں سے اسی کو سب سے زیادہ فروغ ہوا۔ عام مرثیہ گویوں نے اپنے مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ اختیار کیا۔ لیکن غزل کی لے اس قدر کانوں میں رچ چکی تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا پڑتا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے غزل کی طرح سلام ایجاد کیا۔ سلام کی بحر وہی ہوتی ہے جو غزل کی ہوتی ہے۔ غزل کی طرح مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے۔ سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرح شگفتہ اور نئی۔ بندش سادہ اور صاف۔ مضمون درد انگیز اور پرتاثیر ہو۔ "[نمبر 1]

سلام پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صفدر حسین رقم طراز ہیں!

"اردو شعر و ادب میں سلام ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں غزل کی عروضی ہیئت میں رسول اکرم آئمہ کرام، اہل بیت اطہار اور خاصان خدا کی سیرت اور ان کے کارناموں کی تشریح و تعبیر کی جاتی ہے۔ خصوصاً کربلا کے ہیرو حضرت امام حسین اور ان کے اعزہ و انصار کا تذکرہ پیش نظر ہوتا ہے ان مقربان خدا نے چونکہ حق و صداقت اور دین کی حمایت میں عظیم قربانیاں پیش کی تھیں اس لئے ایسے موضوع بھی شاعر کے دائرہ فکر میں آجاتے ہیں۔ جن سے اعلیٰ اقدار حیات اور محاسن انسانی کی ترویج و اشاعت کا کام لیا جا سکتا ہے۔ گویا سلام کے احاطہ خیال میں مسائل حیات کائنات پر بھی تبصرہ کی گنجائش ہوتی ہے۔ تاکہ منشائے الٰہی، اسوہ رسولؐ اور فکر اہل بیت کی وضاحت کر کے عمل خیر کی ترغیب دی جا سکے[نمبر 2]"

نمبر 1 = موازنہ انیس و دبیر سرتاج بک ڈپو لاہور ص 212 نمبر 2 = رزم نگاران کربلا سنگمیل پبلیکیشنز لاہور ص 167

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلام وہ نظم ہے جو غزل کی عروضی ہیئت میں لکھی جاتی ہے اور جس میں رسول اکرم ، آئمہ عظام اور دیگر اہل بیت کا تذکرہ ہوتا ہے اس کے علاوہ اخلاقی اور تمدنی امور بھی اندراج جاتے ہیں اور حیات و کائنات کے مسائل پر بھی اظہار خیال کی گنجائش ہوتی ہے ۔ سلام گوئی کا لطف یہ ہے کہ شوخی کلام اور رنگینی بیان کے باوجود غزل سے الگ نظر آئے۔

اوّل اوّل "سلام" کا مقصد حضور اکرم اور دیگر بزرگان دین کی روحوں پر درود و سلام بھجنا ہوتا تھا ۔اور اس کے لئے ضروری نہیں تھا کہ شاعر غزل کی عروضی ہیئت استعمال کرے ۔متقدمین کے ہاں مثلث مربع یا مخمس میں بھی سلام موجود ہیں ۔زمانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کا ادبی شعور بھی ترقی کرتا گیا اور مرثیہ گو شاعروں نے مجلس عزا کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت سلام کی ہیئت اور نفس مضمون میں بھی تبدیلیاں کر دیں ۔ چنانچہ غزل کا عروضی سانچہ اس کے لئے مناسب خیال کیا گیا ۔اور موضوع کو پھیلا کر واقعہ کربلا اور تذکرہ اہل بیت اس میں شامل کر دیئے گئے ۔

میر حسن ۔مصحفی ۔قائم چاند پوری وغیرہ نے مذہبی شاعری کی طرف خصوصی توجہ دی اور رباعیات ۔ سلام ۔قصائد اور مرثیے لکھ کر مذہبی شاعری کو اپنے عہد کے ادبی معیار کے قریب کر دیا ۔چنانچہ جب میر ضمیر ، میر خلیق اور مرزا فصیح وغیرہ کا دور آیا تو انہوں نے ہزارہا سلام لکھ کر اس صنف ادب کو اپنی رنگین بیانیوں سے مالا مال کر دیا ۔ اب مجلس عزا کا دستور یہ بن گیا کہ مرثیہ نگار منبر پر بیٹھ کر چند رباعیات پڑھتا پھر سلام کے اشعار سے سامعین کے ذوق سماعت کو ابھارتا اور جب وہ پوری طرح شاعر کی طرف متوجہ ہو جائے تو اصل نظم یعنی مرثیہ پڑھا جاتا ۔ اس لحاظ سے ہم سلام کو مرثیہ کا ابتدائیہ (Prologue)نمل[1] کہہ سکتے ہیں ۔ بہرحال سلام میں شاعر حمد نعت اور منقبت کے مضامین بھی شامل کر سکتا ہے ۔ اور تزکیہ نفس کے لئے دنیا کی بے ثباتی ، فقر و فاقہ ، حلم و حیاء حق و صداقت اور ایثار و قربانی کا درس بھی دیا جا سکتا ہے لیکن شعراء زیادہ تر ذکر اہل بیت ہی کو اس کا موضوع بناتے ہیں ۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ سلام کا آغاز دینی شخصیات اور خاص طور پر حضور اکرم پر درود بھیجنے سے ہوا ۔ لیکن مرثیہ گو شاعروں نے اسے ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا اور اسے مرثیے کے

نمل[1] = یہ ٹریجڈی کا وہ حصہ ہوتا ہے جو پہلے گیت سے بھی پہلے ہوتا ہے (بوطیقا ترجمہ عزیز احمد ص 57)

ابتدائیہ کے طور پر پڑھا جانے لگا - لیکن وہ شعراء جنہیں مرثیہ گوئی سے جذباتی وابستگی نہیں تھی - انہوں نے سلام کا اصل انداز قائم رکھا اور حضور اکرم کے فضائل حمیدہ کے ساتھ ساتھ آپ پر درود و سلام کے لئے اس صنف سخن کو مخصوص کر لیا چناچنہ شمیم احمد کا کہنا ہے !

" وہ نظمیں جن میں حضور سرور کائنات کی تعریف کی جاتی ہے اور جن میں لفظ سلام استعمال ہوتا ہے وہ بھی سلام کہلاتی ہیں[نمبر ۱]"۔

ایسے سلاموں میں مولانا احمد رضا خاں کا سلام !

مصطفیٰ جان رحمت پر لاکھوں سلام

خاص طور پر قبل ذکر ہے اس سلام میں 169 اشعار ہیں اور اس کے اشعار عام طور پر محفل میلاد کے اختتام پر پڑھے جاتے ہیں - طوالت کے سبب سارا سلام پڑھنا ممکن نہیں ہوتا - اس لئے صرف چند اشعار پر بھی اکتفا کی جاتی ہے - اسی طرح اکبر میرٹھی کا یہ سلام بھی زبان زد خاص و عام ہے -

یا نبی سلام علیک — یا رسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک — صلوٰت اللہ علیک

جدید دور میں حفیظ جالندھری اور ماہر القادری کے سلاموں کو بھی خصوصی شہرت حاصل ہوئی ہے -

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی
سلام اے فخر موجودات، فخر نوع انسانی

(حفیظ)

اس سلام میں حضور کے اوصاف کے ذکر جمیل کے ساتھ شاعر کا جذبہ محبت بھی کارفرما نظر آتا ہے اور الفاظ و تراکیب کا حسن انتخاب موسیقی کا سماں باندھتا ہے - کلام میں جذب و مستی

نمبر ۱ = درس بلاغت = ترقی اردو بیورو نئی دہلی ص 155

اور کیف و سرور کی فضا سننے والے کو مسحور کر دیتی ہے ۔

سلام اس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی

سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

(ماہر)

یہاں شاعر یکے بعد دیگرے حضور کے اسوہ حسنہ کے مختلف پہلوؤں کو واضع کرتا ہے ۔ اور آپ کی سیرت کا ایسا نقشہ پیش کرتا ہے جس میں دنیا کے لئے بصیرت اور ہدایت کا سامان موجود ہے۔

منقبت اور سلام میں نمایا فرق ہیئت اور موضوع کا ہے ۔ سلام کے لئے ایک ہیئت معین ہے ۔ یہ غزل کی فارم میں لکھا جاتا ہے ۔ منقبت کے لئے کوئی فارم مخصوص نہیں ہے ۔ اس لئے غزل ۔ قصیدہ ۔ رباعی اور مخمس وغیرہ کوئی پیمانہ استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ سلام کا موضوع بزرگان دین کے علاوہ دنیا کی ہیچ مقداری ۔ فقر و فاقہ ۔ صبر و برداشت وغیرہ ہوتا ہے ۔ حضور کی ذات گرامی بھی اس کا موضوع بن سکتی ہے ۔ منقبت میں براہ راست حضور کی مدح و ستائش نہیں ہوتی ۔ البتہ کسی بزرگ کے حوالے سے کہ انہیں یہ مقام اتباع رسول کی وجہ سے حاصل ہوا ہے ۔ آنحضرت کا ذکر بھی آ سکتا ہے ۔ سلام مجلس عزا اور محفل میلاد میں پڑھا جاتا ہے ۔ مناقب پڑھنے کے لئے عرس یا محفل سماع یا آئمہ میں سے کسی کے یوم ولادت کا اہتمام کیا جاتا ہے ۔

منقبت اور قصیدہ ۔

قصیدہ قدیم اصناف سخن میں ایک مقبول اور با عظمت صنف تھی ۔ بلکہ عربوں کے نزدیک تو شاعرانہ کمال کا انحصار ہی قصیدہ نگاری پر تھا ۔ قصیدہ کی رفیع الشان عمارت تشبیہ ۔ گریز ۔ مدح ۔ حسن طلب اور دعا سے مل کر تشکیل پاتی ہے ۔ قصیدہ کے مضامین کا ذکر کرتے ہوئے سید جلال الدین احمد لکھتے ہیں !

" مختلف شاعرانہ مضامین کے لئے قصیدہ سب سے بڑا میدان ہے ۔ ہر قسم کے مضامین صرف قصیدے کے ذریعے ادا کئے جا سکتے ہیں ۔ مثلاً کوئی دوست جدا ہو رہا ہو کوئی موثر منظر نظر سے گزرا ۔ کسی نے کوئی ناموری کا کام کیا ۔ کسی نے اپنی غفلت کی وجہ سے اپنے فرائض کو ترک

کر دیا ۔غرض کہ اس قسم کے تمام مضامین قصیدے میں عمدگی سے ادا ہو سکتے ہیں ۔اور فی الحقیقہ اسی غرض و غایت کے لئے اس صنف کا ایجاد ہوا ہے ۔عرب کے قصائد انہیں مضامین سے مملو ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد جذبات سے لبریز ہیں[نمبر1] ۔

ابتداء میں قصیدہ کی یہی صورت تھی ۔ عرب اسبے جا مداحی اور مبالغہ سے گریز کرتے تھے ۔جو بعد میں فارسی شاعری میں قصیدے کا بنیادی وصف بنا ۔ خلوص و صداقت اس کے اصلی جوہر تھے ۔چنانچہ ایک رئیس نے ایک عرب شاعر سے کہا کہ میری مدح لکھو ۔اس نے کہا ! "افعل حتی اقول." کچھ کرکے دکھاؤ تو لکھوں ۔

بلحاظ موضوع قصیدہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ایک مدحیہ جس میں کسی ممدوح کی تعریف ہو ۔دوسرے ہجویہ ۔جس میں کسی کی ہجو ہو ۔تیسرے وصفیہ جسمیں اخلاق و پند و نصائح وغیرہ ہوں یا نفس کو مخاطب کرکے بے ثباتی عالم کا نقشہ دکھایا جائے اور چوتھے بیانیہ مثلاً شہر آشوب وغیرہ ۔رفتہ رفتہ شعرائے باکمال نے اپنی مضمون آفرینی اور وقت پسند طبیعتوں سے ایسے قصیدے کہے کہ اس صنف کو چار چاند لگ گئے اور اس کے الفاظ میں شان و شوکت ۔بندش میں حستی ۔خیالات میں رفعت ۔مضامین میں جوش۔ کلام میں جزالت بیان میں تسلسل اور طرز ادا میں جدت پیدا ہو گئی[نمبر2] ۔ استعارات و تشبیہات اور ضائع بدائع کے استعمال نے اس کے حسن میں اور نکھار پیدا کر دیا ۔

قصیدے میں زیادہ تر درباری اور مذہبی مداحی ہوتی ہے ۔اس لئے اکثر نقادوں نے قصیدے کو محض مدح سے تعبیر کیا ہے ۔لیکن قصیدہ محض مداحی نہیں ہے ۔اس نقطے کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں !

" قصیدہ مدح گستری تک محدود نہیں اس میں بہت سے اور مضامین بھی ہوتے ہیں ۔اور شاعری کے ایسے محرکات بھی اسمیں کار فرما ہوتے ہیں ۔جو حقیقی شاعری میں شامل ہیں ۔۔۔ قصیدے کی تشبیب میں غنائی شاعری کی کئی صورتیں ہوتی ہیں ۔ وصف کے عمدہ سے عمدہ نمونے ملتے

نمـ1 = تاریخ قصائد اردو ص 12 نمـ2 = مباحث ص 97، 596 مطبوعہ مجلس ترقی ادب ، لاہور ۔

ہیں ۔بعض اوقات مکالمے کے ذریعے تمثیل کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے ۔اسطرح مدح میں وصف نگاری جزئیات نگاری اور بیانیہ نگاری کی صورتیں نکل آتی ہیں ۔اور آخر میں یہ کہ قصیدہ نگاروں نے نظامیہ تفصیل اور مسلسل مطالب کے لئے اس صنف کو خوب خوب استعمال کیا ہے ۔

غرض قصیدہ ایک مرکب صنف ہے جس میں سریکل ۔ بیانیہ ۔تمثیلیہ اور صنفیہ شاعری کے نمونے ملے جلے موجود ہیں۔ نمبر1"

قصیدہ ایک مخصوص ہئیت رکھتا ہے ۔اس میں جو کچھ لکھا جائیگا وہی قصیدہ کہلانے کا مستحق ہے ۔سودا کا قصیدہ " تضحیکِ روزگار" موضوع کے اعتبار سے قصیدہ نہیں ہے ۔ یہ صرف اس لئے قصیدہ ہے کہ وہ قصیدہ کی مخصوص ہئیت میں لکھا گیا ہے اور میر تقی میر نے آصف الدولہ کا " شکار نامہ" لکھا ۔یہ مثنوی کی طرز پر ہے ۔ اس لئے اس کو قصیدہ نہیں کہتے ۔حالانکہ اس میں درباری مداحی مکمل طور پر موجود ہے ۔ اس کے علاوہ غزل ، قطعہ اور رباعی وغیرہ میں بھی مدح کے مضامین باندھے جاتے ہیں ۔

مدحیہ قصائد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

1 ۔ وہ قصائد جن میں کسی بادشاہ یا امیر کی تحسین پیش نظر ہوتی ہے ۔

2 ۔ وہ قصائد جن میں شاعر کسی مذہبی شخصیت سے اظہار عقیدت کرتا ہے ۔

قصیدے مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہوں یا دینوی ان میں تمام آوردہ ہوتی ہے اور وجہ صاف ہے ۔شاعر ارادتاً کسی بادشاہ کی تعریف یا کسی بزرگ کی مدح پر کمر کستا ہے اور اس تعریف اور مدح میں مبالغہ کے انتہائی مدارج طے کرتا ہے ۔

قصیدہ میں شاعر زور طبیعت کے اظہار کے لئے نامانوس اور اجنبی قوافی استعمال میں لاتا ہے۔ نمبر2

نمبر1 = مباحث = ص97 ، 596 مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور

نمبر2 = ارسطو کے قول کے مطابق خاص اور غیر مانوس الفاظ کسی نظم کا امتیازی وصف ہوتے ہیں ۔ لیکن وہ ایسے الفاظ کے استعمال میں احتیاط کا مشورہ دیتا ہے ۔وہ کہتا ہے کہ اگر غیر مانوس لفظوں کا بے محل استعمال ہو یا استعاروں کی بھرمار ہو تو ایسی زبان لفظوں کا ملغوبہ بن کر رہ جائے گی ۔ شاعرانہ زبان نہیں ہوگی ۔

علمیت کی نمود و نمائش کے لئے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحوں سے اپنے ایوان کو سجاتا ہے ۔ رعب و دبدبہ کی خاطر عربی اور فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ و تراکیب لاتا ہے ۔ اور اس طرح ایک ایسی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔ جس میں شان و شوکت تو ہوتی ہے لیکن تاثیر غائب ہو جاتی ہے ۔

اس فضا کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں !

" قصیدہ ایک مصنوعی فضا کی پیداوار ہونے کے باعث ایک مصنوعی اسلوب کا علمبردار اور مطالب کے اظہار میں مبالغہ آرائی اور خوشامد پسندی کا داعی تھا ۔ چنانچہ سودا اور میر کے قصائد سے لے کر جرأت ۔ مومن اور غالب تک قصیدہ نگاری نے اپنی مخصوص روش سے بہت کم انحراف کیا ہے ۔ اور شاعر نے حسب قاعدہ مطلع ، تشبیب ، گریز ، مدح اور دعا کے مراحل کو عبور کیا ہے ۔ اور ہر ہر قدم پر قدما کے طریق کار کو ملحوظ رکھا ہے ۔ بے شک الفاظ کے در و بست ، محاورے ، تشبیہہ اور استعارے کے استعمال میں ان میں سے ہر شاعر نے ایک حد تک جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے ۔ نیز ان میں ہر ایک نے اپنے مخصوص لہجے میں بات کی ہے ۔ تاہم قصیدہ کے مخصوص شکوہ اور بلند آہنگی نے تہذیب ذات کے عمل کو وجود میں نہیں آنے دیا ۔ ہر قصیدہ گو کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے مبلغ علم کا اظہار کرے بلکہ زبان پر اپنی گرفت کا ثبوت بھی دے ۔ نیز مبالغہ آرائی میں ان بلندیوں پر پرواز کرے جن تک دوسرے قصیدہ نگاروں کا تخیل نہ پہنچ سکا ہو مقصد کے اعتبار سے دیکھیں تو اس ساری تخلیقی تگ و دو کا مدعا حاکم وقت کی خوشنودی حاصل کرنا اور یوں شاعر کے گزر اوقات کے لئے ایک آسان وسیلہ بہم پہنچاتا ہے [نمل] ۔ "

قصیدے کی نشوونما میں درباری زندگی نے اہم کردار ادا کیا ۔ شعراء کسی نہ کسی دربار سے وابستہ ہوتے تھے اور امراء و سلاطین کی خوشامد ان کے لئے حصول زر کا ذریعہ تھی ۔ جب برصغیر میں مسلمان سیاسی زوال سے دوچار ہوئے اور انگریزی اقتدار کے سائے پھیلنے لگے تو دربار ختم کر دیئے گئے اور اس طرح قصیدہ نویسی کے تنزل کا آغاز ہوا ۔

نملـ = اردو شاعری کا مزاج ص317

قصیدہ کے بطور صنف سخن زوال پذیر ہونے کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں !

" اگر قصیدہ نویسی کسی داخلی دباؤ اور ضرورت کے تابع ہوتی تو یقیناً بدلے حالات و واقعات کے باوجود زندہ رہتی اور اگر یہ زندہ نہیں رہ سکی تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ایک وقتی چیز تھی وقت گزر گیا اور اسکی افادیت ختم ہو گئی تو شعراء ترک کرنے پر مجبور ہو گئے " نمبر۱ نیاز فتح پوری نے قصیدہ گوئی ختم ہونے کے کچھ اور اسباب بھی بیان کئے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں !

" یہ فن بالکل ختم ہو گیا ہے ۔ کیونکہ قصیدہ کہنے کے لئے جس فضل و کمال اور وسعت مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس سے ہمارے شعراء کو بہرہ یاب ہونے کا موقع نہیں ملتا ۔ کیونکہ اس کے لئے علم قدیمہ اور عربی وفارسی ادب کا جاننا بہت ضروری ہے "

نیاز فتح پوری نے شاعروں کی سہل پسندی کو قصیدے کے زوال کا سبب بنایا ہے ۔ ایک اعلیٰ پائے کا قصیدہ لکھنے کے لئے جس وقت نظری ۔ اور جان سوزی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ آج کا شاعر اس سے عاری ہے ۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ امراء اور سلاطین کی غلط بخشیاں جو قصائد کے محرکات کا کام دیتی تھیں امتداد زمانہ کے ساتھ دفن ہو گئیں ۔ اگر علم و فضل بازار حیات میں زر خالص کی حیثیت رکھتا ہو تو اس کے حصول کے لئے اگر جان جوکھوں کا کام بھی کرنا پڑے تو انسان کر گزرتا ہے ۔ لیکن اگر صورت حال یہ ہے کہ علم و حکمت زر کم عیار بن گیا ہے ۔ اور اس کی سرپرستی کرنے والے تاریخ کے اوراق میں مدفون ہو گئے ہیں ۔ لہٰذا قصیدہ نویسی کا کوئی بھی محرک موجود نہیں رہا ۔

عہد ماضی میں ذرائع ابلاغ کی وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں ۔ جو آجکل موجود ہیں ۔ اس وقت نہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والے اخبارات و رسائل تھے ۔ نہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن تھے جو آن کی آن میں انسانی آواز کو اکناف عالم میں پھیلا دیتے ہیں ۔

یہ ان با کمال شاعروں کے قصائد ہی تھے جو ملک کے گوشے گوشے میں بادشاہوں اور امیروں

نمبر۱ = اردو شاعری کا مزاج ص 317 نمبر2 = مومن کے قصائد ۔ جریر خاں مہ قصیدہ نمبر ص 293 ۔

کی شہرت کے چراغ روشن کرتے تھے ۔ اور لوگوں کے دلوں میں ان کی تکریم بڑھاتے تھے ۔ بعض نقادوں کے نزدیک قصیدہ ایک معتوب صنف سخن ہے مگر پروپیگنڈا کے نقطۂ نظر سے جو حکمرانی کی نہایت اہم ضرورت ہے اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اس سلسلہ میں شبلی لکھتے ہیں

" یورپ میں سینکڑوں ہزاروں اشخاص نام و نمود کے منبر پر نمایاں ہوئے ہیں اور صرف یہ بات ان کے حوصلوں اور ارادوں کو روز بروز بڑھاتی اور تیز کرتی ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں اخبارات اور تصنیفات کے ذریعے فوراً تمام عالم میں اس کی آواز پھیل جاتی ہے ۔ قوموں کا بننا ۔ ابھرنا ۔ ان کے جذبات کا تازہ اور مشتعل ہوئے رہنا اس بات پر موقوف ہے کہ ان کے اوصاف کی صحیح داد دی جائے ۔ ان کے کارنامے نمایاں کئے جائیں ان کا ہر کام تاریخی صفحات پر چمکایا جائے ۔ قصیدہ درحقیقت اسی کام کو انجام دینے کا آسرا تھا نمبر[1] "

مذہبی قصائد یا مناقب بھی بزرگان دین کے اعمال و افعال اور فیوض و برکات کا تذکرہ ہیں یہ قصائد پھیل کر دینی اقدار کے فروغ کا باعث بنتے ہیں اور عوام الناس کو اعمال حسنہ کی طرف راغب کرتے ہیں اسلئے نیکی اور خیر کو معاشرے کے جسم میں داخل کرنے کے لئے ان کی افادیت اور اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا ۔ دنیاوی قصائد کے محرکات ختم ہونے کے باوجود ایسے مذہبی قصائد کی تحریک موجود رہتی ہے ۔ کیونکہ دنیا دینی شخصیات سے کبھی خالی نہیں ہوتی ۔ ان کے فیوض و برکات سے انسان ہمیشہ کسب فیض کرتا رہتا ہے ۔ ثواب اور نجات اخروی کا خیال اس کے دل میں ہمیشہ موجزن رہتا ہے ۔ لہٰذا دینی قصائد اور مناقب لکھے جاتے رہیں گے ۔

قصیدہ گوئی چونکہ قدرت زبان اور وسعت مطالعہ و مشاہدہ کا تقاضا کرتی ہے اس لئے اسکی بدولت زبان میں وسعت پیدا ہوئی ۔ سینکڑوں نئے الفاظ ۔ نئی ترکیبیں اور محاورے وجود میں آئے مختلف علوم و فنون کا وافر ذخیرہ داخل زبان ہوا جس سے زبان کا دامن وسیع اور معیار بلند ہوا ۔ اور زبان میں پرزور اور متین خیالات کے ادا کرنے کا وسیع ذخیرہ مہیا ہو گیا ۔ اگر ہم قومی اور ملکی مضامین لکھنا چاہیں تو قصائد کی زبان ان خیالات کے ادا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے نمبر[2] ۔

نمبر 1 = شعر العجم حصہ پنجم مطبع معارف اعظم گڑھ ص 21 ، 22
نمبر 2 = ایضاً ص 29

قصیدہ اور منقبت دونوں کی غائت کسی ممدوح کی تعریف و توصیف ہے ۔اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی راہیں کہاں سے جدا ہوتی ہیں ۔قصیدے میں کسی سلطان یا امیر کی تعریف ہوتی ہے اور اس سے قصیدہ گو کا مقصد دنیاوی مفاد حاصل کرنا ہوتا ہے ۔ اس لئے حسن طلب قصیدے کا ایک اہم جزو ہے اور شاعر اپنی پوری صلاحیتیں طلب کے انداز کو خوبصورت بنانے میں صرف کر دیتا ہے ۔تاکہ ممدوح خوش ہو اور شاعر کا دامن گوہر مراد سے بھر دے ۔ قصیدہ ممدوح کی زندگی کے دنیاوی پہلو کو سامنے لاتا ہے ۔شاعر اس کے عدل و انصاف ، شجاعت اور بہادری اور جود وعطا وغیرہ کی تعریف کرتے ہوئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے ۔وہ اپنے ممدوح کی ان خوبیوں کو اچھالتا ہے اور سامنے لاتا ہے جو فی الحقیقت اس میں نہیں ہوتیں ۔ اسے کمزور سے کمزور بادشاہ بھی رستم سے زیادہ بہادر ، حاتم طائی سے زیادہ فیاض کیخسرو اور کیقباد سے زیادہ جاہ و حشم رکھنے والا نظر آتا ہے اس طرح قصیدے کی عمارت غلو اور مبالغے کی بنیاد پر اٹھائی جاتی ہے۔

منقبت میں شاعر اصحابہ کرام ، اہل بیت اطہار اور اولیائے عظام کی مدح سرائی کرتا ہے اور اس میں نجات اخروی کا سامان تلاش کرتا ہے ۔ قصیدے کا تعلق دنیا داری سے ہے جبکہ منقبت انسان کے مذہب اور ایمان سے علاقہ رکھتی ہے ۔منقبت ممدوح کے روحانی اوصاف کو سامنے لاتی ہے اور بعض اوقات کہیں کہیں مادی اوصاف بھی ابھرتے ہیں ۔ لیکن ان میں بھی روحانیت کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوتی ہیں ۔منقبت نگار منقبت کی بنیاد سچائی اور صداقت پر استوار کرتا ہے ۔ اور غلو سے گریز کرتا ہے ۔ وہ صرف ان صفات کا ذکر کرتا ہے ۔ جن سے ممدوح کی ذات حقیقتاً متصف ہوتی ہے ۔ وہ ان کی عبادت اور ریاضت کا ذکر کرتا ہے ۔اتباع رسول کو سامنے لاتا ہے ۔ان کے روحانی تصرفات کو موضوع بناتا ہے ۔اور اس طرح دینی اقدار کے فروغ کا سبب بنتا ہے ۔

اکثر منقبت نگار شعراء نے قصیدے کی ہیئت استعمال کی ہے اور تشبیب میں عاشقانہ مضامین باندھے ہیں ۔ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں !

"اس قسم کی عاشقانہ اور رندانہ تشبیبیں صرف امراء سلاطین کی مدح میں لکھی جا سکتی ہیں ۔مقدس لوگوں کی شان میں جو قصائد لکھے جاتے ہیں ان میں اس قسم کی تشبیبوں کا لکھنا گستاخی و بد تمیزی ہے ۔چنانچہ رضی ہیشا پوری نے ایک بزرگ کی مدح جن کو وہ فدائیگان شریعت

اور پناہ ملت کہتا ہے ۔ شراب و کباب کی تمہید کے ساتھ لکھی ہے اور اس پر العجم فی معائر اشعار العجم میں یہ تنقید کی گئی ہے ۔

"کسے را کہ خدائیگان شریعت و پناہ ملت خوانند نسیب مدح رو بہ شراب و مستی و صبوح لائق نباشد نمبر1"۔

قصیدے کے علاوہ منقبت ، غزل ، مثنوی ، قطعہ اوررباعی وغیرہ مختلف اصناف سخن میں لکھی جا سکتی ہے ۔ منقبت کا مضمون ہر صنف سخن کے پیکر میں ڈھل سکتا ہے ۔ لیکن قصیدے کے لئے ایک ہیئت مخصوص ہے اس کے دائرے سے باہر نکل آئے تو قصیدہ قصیدہ نہیں رہتا ۔

منقبت اور مرثیہ ۔

مرثیہ اور منقبت مذہبی شاعری سے پھوٹنے والی دو شاخیں ہیں ۔ لیکن دونوں مختلف ذہنی اور سماجی ماحول کی پیداوار ہیں ۔ اور دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں ۔ منقبت جس صورت حال میں تخلیق ہوتی ہے اس کا تفصیلی ذکر پہلے ہو چکا ہے ۔ اور اس کے مقصد اور غائت پر بھی سیر حاصل گفتگو ہو چکی ہے ۔ مرثیہ رثا سے مشتق ہے جس کے لفظی معنی مرنے والے کی تعریف و توصیف ہے ۔ انگریزی زبان میں اس صنف کیلئے (ELEGY) کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ دی ڈکشنری آف انگلش لینگوئج میں اس کا مفہوم یہ لکھا ہے ۔

" نغمہ ماتم = ایسی شعری تخلیق جو مرنے والے یا مرنے والوں کے کارناموں کے ذکر، ان کی توصیف اور ان کی موت پر اظہار غم سے عبارت ہو نمبر2"۔

انسائیکلو پیڈیا بریٹینکا میں اس کے یہ معانی درج ہیں ۔

" ELEGY " بین اور اظہار غم کی ایک مختصر نظم ہے جس کی وجہ تخلیق کسی محبوب یا قابل احترام ہستی کی موت ہو نمبر2"۔

لیکن اردو کی اصطلاح میں یہ وہ نظم ہے جس میں میدان کربلا میں اہل بیت کے مصائب اور

نمبر1 = قصیدے پر ایک نظر ۔ صریر خامہ قصیدہ نمبر سندھ یونیورسٹی ص 70

نمبر2 = مطبوعہ لنڈن 1934 ص 350 نمبر3 = جلد 8 ص 344

ان کی شہادت کا ذکر ہوتا ہے - ایران میں اس میں اس طرح کے مرثیے صفویوں کے دور میں لکھے گئے تھے - اس دور میں مرثیوں کی ترقی حکمرانوں کے مخصوص مذہبی عقائد کی مرہون منت تھی - اور محتشم کاشی اس دور کا عظیم مرثیہ گو شاعر تھا - اردو شاعری میں جو مرثیے لکھنوی دور میں تخلیق ہوئے فنی لحاظ سے منفرد ہیں - اور ان کی کوئی مثال عربی یا فارسی ادب میں نہیں ملتی -

مرثیے میں پہلی چیز چہرہ ہے - اس میں کبھی تو مناظر فطرت کی عکاسی ہوتی ہے - کہیں کوئی تاریخی واقعہ بیان ہوتا نظر آتا ہے - کبھی شاعرانہ تعلی ہوتی ہے - پھر جس کا مرثیہ ہے - اس کی مدح ہوتی ہے - اجمال کے ساتھ اس کے سوانح حیات کا ذکر بھی ہوتا ہے - پھر اصل مضمون کی طرف گریز ، جہاد کیلئے رخصت طلبی اور روانگی - میدان جنگ میں رجز خوانی اور مبارز طلبی ، گھوڑے اور تلوار کی تعریف ، لڑائی ، مرکزی کردار کا تہور ، فوج مخالف کی بزدلی ، مرکزی کردار کا لڑتے لڑتے شہید ہوجانا ، امام علیہ السلام کا اظہار الم وغیرہ -

یہ مرثیہ کی ہیئت ترکیبی ہے اور اسی ہئیت نے اردو مرثیہ کو وہ انفرادیت عطا کر رکھی ہے جو کسی اور زبان میں لکھے جانے والے مرثیہ کو حاصل نہیں ہے - مرثیہ مجلس میں پڑھنے کیلئے لکھا جاتا ہے - جس طرح ڈرامے کیلئے اسٹیج ضروری ہے اسی طرح مرثیہ کیلئے مجلس کا انعقاد لازمی ٹھہرتا ہے - ان مجالس میں مرثیہ نگار شہدائے کربلا کے مصائب کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کرتا ہے - اور سامعین اسے سن کر اشکبار ہوتے ہیں - اور یوں بین و بکار مرثیے کا بنیادی مقصد قرار پاتا ہے -

سیّد عابد علی عابد رقم طراز ہیں -

" مرثیے کی غائت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مرثیہ نگاروں نے بہت سی ضعیف روائیتیں مرثیوں میں داخل کر دی ہیں - یہ روائیتیں آہ و بکا کی فضا پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں - اس لئے مرثیہ نگار کیلئے بجملہ سامان تخلیق ہیں [نمبر۱] "-

میرانیس اپنے مرثیوں کی اصل قدر دانی اشکباری اور آہ وزاری ہی کو تصور کرتے ہیں -

---

نمبر۱ = اصول انتقاد ادبیات ص 250 -

ہر چشم سے اشکوں کی روانی ہو جائے
مقبول میری مرثیہ خوانی ہوجائے
فضل باری سے ہوں وہ آنسو جاری
ساون کی گھٹا شرم سے پانی ہو جائے

چنانچہ مرثیہ گو شاعر مرثیہ کی اثر آفرینی کیلئے اس کی فنی ساخت میں ان ہی جزئیات پر زور دینا ضروری خیال کرتا ہے - جو رلانے کی کیفیت کو گہرا کر سکیں یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مرثیے کا سب سے زیادہ درد ناک حصہ بین ہے - بلکہ بین ہی اصل مرثیہ ہے -

مرثیہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے قصیدہ ، مثنوی اور ڈرامہ کی بعض خصوصیات اپنے اندر رکھتا ہے - چنانچہ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں !

" تعریف کے ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شعرائے قصیدہ میں مبالغہ آرائی کے رجحان کو بطور خاص اپنایا ہے - اور گھوڑے ، تلوار ، جنگ اور دوسری باتوں کے بیان میں تخیل سے مدد لی ہے - البتہ مرثیہ اور قصیدہ کے رزمیہ عناصر میں فرق ہے - کہ قصیدہ کی مبالغہ آرائی کے پس پشت مطلب براری کے جذبہ کا فرما ہے - جبکہ مرثیہ کے پس پشت خوش اعتقادی اور مذہبی جوش موجزن ہے - جہاں تک مرثیے میں داستان کا تعلق ہے - شعراء نے واقعات کربلا کو ڈرامائی انداز میں پیش کر کے کرداروں کو ابھارا اور ان کے جذباتی رد عمل کو اجاگر کیا ہے - مثنوی کا وصف ہے کہ وہ اپنے زمانے کی معاشرت کے نقوش کو محفوظ کرتی اور مختلف کرداروں میں شاعر کے اپنے احساسات و جذبات کو منتقل کر کے پیش کرتی ہے - ان مرثیوں میں بھی موجود ہے -[نمبر ۱]"

منقبت اور مرثیہ اپنے اپنے مخصوص پس منظر اور اثر آفرینی میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں - منقبت میں ممدوح کی مدح و ستائش اور اس کی دینی خدمات اور روحانی تصرفات کا تذکرہ ہوتا ہے - اور یہ کسی بھی ہیئت میں لکھی جا سکتی ہے - جبکہ مرثیہ کی ایک مخصوص ہیئت مروج ہے - اور یہ عام طور پر اسی میں لکھا جاتا ہے - منقبت داخلی صنف شاعری ہے - شاعر کسی

نمبر ۱ = اردو شاعری کا مزاج ص 320

دینی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے ۔ اور اپنے تاثرات کو جنی میں اس کا خونِ جگر بھی شامل ہوتا ہے
شعر کی صورت میں ڈھال کر منقبت تخلیق کرتا ہے ۔ یہاں عقیدت و محبت کی حرارت بھی ہے اور
سچی لگن کا ذائقہ بھی خود سپردگی کی کیفیت بھی ہے اور عاجزی اور نیاز مندی کا والہانہ اظہار
بھی ۔ ایک مقدس فضا ہے جس میں شاعر سر تا پا ڈوبا ہوا ہے اس کی نگاہ ممدوح کی مقناطیسی
شخصیت پر مرکوز ہے ۔ اور ذرا ادھر ادھر نہیں بھٹکتی ۔

مرثیہ میں یہ کیفیت نہیں ہے ۔ مرثیہ داخلی اور خارجی شاعری کا خوبصورت امتزاج ہے ۔
ڈاکٹر مظفر حسن ملک لکھتے ہیں !

" مرثیہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی فوت شدہ آدمی کے اوصاف بیان کر کے
اس کا ماتم کیا جائے یہ ماتم توام اور حکومتوں کا بھی ہوتا ہے ۔ اور اعزہ و احباب کا بھی ۔ اس لحاظ
سے اس کا تعلق داخلی شاعری سے ہے لیکن اردو میں اصطلاحی مرثیے سے مراد وہ نظمیں ہیں جن
میں شہدائے کربلا اور ان کے متعلقین کے مصائب بیان کر کے ماتم کا ساماں پیدا کیا جائے ۔ ان نظموں
میں داستان طرازی ، جذبات نگاری اور کردار نگاری کی بھی کوشش کی جاتی ہے ۔ اس لئے اس صنف
سخن کا تعلق ایک اور المیہ سے بھی کسی حد تک ہو جاتا ہے " نمبر[1]

مرثیہ نگاروں نے حضرت امام حسین اور ان کے ساتھیوں میں شجاعت ، صبر ، وفا ، بردباری
زہد و تقویٰ ، تسلیم و رضا ، حق گوئی و بے باکی جیسی صفات کو ابھارا ہے ۔ منقبت میں بھی اہل
بیت کی انہی صفات کا تذکرہ ہوتا ہے ۔ مگر جب دوسرے بزرگان دین منقبت کا موضوع بنتے ہیں تو
ان کی صفات کا دائرہ کچھ محدود ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ انہیں اس قسم کی صورت حال کا سامنا نہیں
کرنا پڑا ۔ جس طرح کی صورت حال اہل بیت کے سامنے تھی ۔ لہٰذا منقبت نگار صرف ان کے زہد و
تقویٰ ۔ اتباع رسول ، روحانی تصرفات اور دیگر فیوض و برکات کا ذکر کرتے ہیں ۔ مرثیہ اپنے دکنی
دور اور شمالی ہند کے ابتدائی دور میں ایک مخصوص مذہبی طبقے کے لئے لکھا جاتا رہا ہے ۔ اس
لئے اس میں عام لوگوں کے لئے کوئی اپیل نہیں ہوتی تھی ۔ جبکہ منقبت کا دامن اس سے بہت وسیع ہے

نمبر[1] = اردو مرثیے میں مرزا دبیر کا مقام ۔ مقبول اکیڈمی لاہور ص 11

اور اس کا حلقہ اثر ہر اس شخص تک پھیلا ہوا ہے ۔ جس کیلئے مذہب میں کوئی دلکشی موجود ہے اور جو روحانیت پر یقین و اعتقاد رکھتا ہے ۔

مولانا امداد امام اثر اور مولانا شبلی کے زمانے سے اردو نقادوں کا خیال تھا کہ انیس کے مرثیے ایپک کا اعلیٰ نمونہ ہیں ۔ ایپک کے فن پر سب سے پہلے ارسطو نے اپنی کتاب "بوطیقا" میں بحث کی ہے ۔ اس کے خیالات کو اجمالاً یوں بیان کیا جا سکتا ہے ۔ کہ ایپک ایک بیانیہ نظم ہے ۔ جس میں شروع سے لیکر آخر تک ایک ہی بحر استعمال ہوتی ہے ۔ جس کی بنیاد عمل واحد پر ہے ۔ جو فی نفسہ مکمل ہوتا ہے ۔ اس میں آغاز ، عروج اور انجام ہوتا ہے تاکہ تخلیق اپنا لطف پیدا کر سکے ۔ نظم کا طول اتنا موزوں اور مناسب ہوتا ہے کہ ذہن انسانی آسانی کے ساتھ پوری نظم کا ادراک کر سکتا ہے ۔ ایپک میں حیرت اور استعجاب کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے ۔ خواہ اس کے لئے شاعر ناممکن اور خلاف قیاس واقعات ہی کیوں نہ شامل کر لے ۔ البتہ خلاف قیاس واقعات سلیقے سے نظم کرنے چاہیئں تاکہ قرین قیاس ناممکنات (مثلاً دیوتا پریاں بھوت وغیرہ) کو خلاف قیاس امکانات (وہ واقعات جن کا پیش آنا ممکن تو ہو لیکن ان میں بھونڈا پن ہو اور فن شاعری کے نقطہ نظر سے ناقص ہوں) پر ترجیح دے ۔ اس میں کہانی کے درمیان ضمنی واقعات بھی ہوں ۔ ان سے نظم کا تاثر بڑھتا ہے ۔ اور سننے والوں کیلئے تنوع کا سامان پیدا ہوتا ہے ۔ کیونکہ اگر مسلسل یک رنگی ہو تو اس سے طبیعت بہت جلد گھبرا جاتی ہے ۔ ایپک کو اگر اثر انگیز ہونا ہے ۔ تو اسے زبان کی خوبصورتی سے بھی آراستہ ہونا چاہیئے ۔

رزمیہ کی ایک مختصر تعریف یہ کی گئی ہے !

" یہ ایک طویل بیانیہ نظم ہے ۔ جس میں عموماً ایک خاص ہیرو کے شجاعانہ معرکوں کی تفصیلات بیان ہوتی ہیں ۔ اکثر یہ معرکے شدید قومی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں" [نمل]

رزمیہ کی ان تعریفوں کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ کیا مرثیہ اس معیار پر پورا اترتا ہے ۔ موضوع کی عالمگیر اہمیت ، مرکزی کردار کی عظمت اور زبان و بیان کا شکوہ رزمیہ کی بنیادی صفات ٹھہرتی ہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرثیہ کا موضوع عظیم ہے ۔ اس کا ہیرو امام حسین عظمت کردار کا جوہر رکھتا ہے ۔ واقعہ کربلا ایک ایسا سانحہ ہے جو قوا کی سیرت ، اس کی تاریخ کے ادب ، اس کی

نمل = کیسلز انسائیکلوپیڈیا

سیاست اور اس کی ثقافت میں ایک زندہ جاوید محرک کی حیثیت رکھتا ہے - اور مرثیہ اس سانحہ کی یاد ہے - اس کے تاثرات کی باز آفرینی ہے - یہاں ایثار و قربانی ہے حق کیلئے سرفروشی کا جذبہ ہے - صداقت کیلئے سب کچھ قربان کر دینے کی تڑپ ہے - دوستوں سے محبت اور دشمنوں سے حسن سلوک کی روشن مثالیں ہیں - یہاں خیر و شر کا تصادم ہے - انسانیت اور بہیمیت کا مقابلہ ہے - صبر و استقلال کے سامنے وحشیانہ قوتوں کی صف آرائی ہے - اور ناقابل بیان مصائب کے مجسم ہیں - ہیرو اور ان کے رفقاء کی بلندی کردار کے نمونے ہیں - جہاں تک زبان کا تعلق ہے - تو مرثیوں کی زبان اور روزمرہ میں سلاست ہے - لہجے میں وقار ہے - یہاں صنائع بدائع کو سلیقے سے برتنے کا ہنر ہے - عربی اور فارسی کی علمی ثقافت کے ساتھ بھاشا کا سلونا پن بھی ہے - یہ وہ زبان ہے جو شگفتہ اور شاداب بھی ہے - لیکن اپنے اندر شان و شکوہ بھی رکھتی ہے -

مظفر علی سید مرثیے اور ایپک میں مشترکہ عناصر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں -

" ایپک کے موضوع میں جو عظمت اور عالمگیر اہمیت ہونی چاہیئے وہ واقعہ کربلا میں موجود ہے اس میں انسانی کارنامے پر یقین کا پہلو بھی ہے - اور انسانی عظمت اور بلندی اخلاق کا مظاہرہ بھی - غرض وہ تمام خصوصیات ہیں جو سی - ایم - باورا کے خیال میں ایپک میں ہونی چاہیئیں - نمبر۱

اس میں کوئی شک نہیں کہ مرثیے میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو سی - ایم - باورا کے مطابق رزمیہ میں ہونی چاہیئیں - لیکن رزمیہ کے کچھ اور تقاضے بھی ہیں - یہ ایک طویل نظم ہے - جس میں ایک مکمل تصویر قاری کے سامنے آتی ہے - مرثیہ ایک مکمل نظم نہیں ہے - مرثیہ نگار پورے

نمبر۱ = مضمون انیس کی مرثیہ نگاری مطبوعہ سویرا ۱۰ - ۱۱ ادبیات

An epic poem is by common consent a narrative of length and deals with events which have a certain grandeur and importance and comes from a life action especi[ally] of violent action such as war. It gives a special pleasure because its events and persons enhance our belief in the worth [of] human achievements and in the dignity and nobility of man

From Virgil to Milton C.H.B[owra]

واقعے کا بہ یک وقت تصور نہیں کرتا ۔ وہ ایک واقعہ کو لیتا ہے ۔ یا ایک کردار کو یا ایک موقع کو اور اس کے لئے وہ ایک مخصوص عنوان جما لیتا ہے ۔ مرثیہ میں نہ تو واقعات کی مکمل تصویر ملتی ہے ۔ نہ طویل داستانوں کا تسلسل ہے ۔ ہر مرثیہ بظاہر دوسرے سے الگ اور اپنی جگہ مکمل ہے ۔ اس میں غزل کے اشعار کی سی بے ترتیبی ، انتشار ، ناتمامی اور تشنگی ہے ۔"

چنانچہ میر انیس کے ایک مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے !

اے رخش کلک رزم کا میدان دکھا مجھے
برہم ہجوم فوج بد ایمان دکھا مجھے
دست ستم گروں کے گریزاں دکھا مجھے
اوراق جزو کفر پریشاں دکھا مجھے
لکھ جائے دفتروں میں وغا فرد فرد کی   فصلیں جدا جدا ہوں کتاب نبرد کی

مرثیہ مجلس عزا میں پڑھا جاتا ہے ۔ اس لئے مرثیہ نگار مرثیہ کی طوالت مناسب حد تک رکھتا ہے ۔ ادھر وقت کی تنگی کا احساس بھی اس طول کلامی سے روکنے کیلئے کافی ہے ۔ مرثیہ گو شاعر کی نظر میں ہر مجلس کے مخصوص مقاصد ہوتے ہیں ۔ اس لئے انہوں نے ایک مربوط رزمیہ لکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی ۔ ہمیں یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے ۔ کہ پڑھنے والے کی قوت گویائی اور سننے والے کی قوت سماعت انتہائی طویل مرثیے کی تاب نہ لا سکتی تھی ۔ اس پابندی نے مرثیہ گو شاعروں کو کبھی یہ سوچنے کا موقع نہیں دیا کہ وہ واقعہ کربلا کو حسن ترتیب کے ساتھ ایک ہی نظم میں بیان کریں اور اس طرح ایک ایپک تخلیق کریں ۔ اردو مرثیوں کی اس کمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر طاہر فاروقی کہتے ہیں !

" انیس و دبیر کے مراثی میں حسن ترتیب کے ساتھ اگر واقعات کربلا اور ان کے ماقبل اور مابعد کے حالات کو ایک مسلسل مدون کتاب کی شکل میں لا یا جائے تو کوئی سبب نہیں کہ ان کو دنیا کی رزمیہ کتابوں میں بہت آگے جگہ نہ ملے"[2] اس ازالے کے لئے ڈاکٹر صفدر حسین نے

نمبر1 = معیار ادب = ڈاکٹر شوکت سبزواری مکتبہ اسلوب کراچی ص 142

نمبر2 = رسالہ نقوش لاہور جون 1960ء ص 23

کارنامہ انیس کے نام سے ایک طویل رزمیہ ترتیب دیا ہے ۔ لیکن یہ رزمیہ میر انیس کا کارنامہ نہیں مرتب کی ہنر مندی کا ثبوت ہے ۔

مرثیہ کا ایک اہم حصہ بین ہے ۔ یہ بھی مرثیے کو رزمیہ ہونے سے روکتا ہے ۔ رزمیہ میں المیہ کے عناصر بھی موجود ہوتے ہیں ۔ لیکن درد ناکی کی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو مرثیہ میں ہوتی ہے ۔ مرثیہ کا مقصد ہی رونا رلانا ہے ۔ یہ محرم میں منبر پر بیٹھ کر مجلس میں پڑھنے کیلئے لکھا جاتا ہے ۔ اور اس کے سامعین میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے ۔ جو اس عقیدے کے حامل ہوتے ہیں ۔ کہ جس نے غم حسین میں آنسو بہائے وہ جنت میں داخل ہوا ۔ میر انیس جب سامعین کو رونے کی ترغیب دیتے ہیں ۔ تو "ایک باکمال رزمیہ نگار کی کرسی سے نیچے اتر کر صرف مجلس کے ایک ماتمی بن جاتے ہیں[نمبر1] "۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بہت سے مشترک صفات رکھنے کے باوجود مرثیہ ایپک نہیں بن سکتا ۔ بقول پروفیسر احتشام حسین !

" اگرچہ مرثیہ ایپک نہیں ہے ۔ لیکن اردو زبان کی کوئی دوسری نظم ایپک سے اسقدر مشابہت نہیں رکھتی ہے[نمبر2] "

منقبت کا ایپک کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے ۔

منقبت کے لئے مختلف ہیئتوں کا استعمال

محسن کاکوروی اپنے معروف نعتیہ قصیدہ میں لکھتے ہیں !

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ میرا شعر ، نہ قطعہ ، نہ قصیدہ ، نہ غزل

یہ شعر لکھتے ہوئے شاعر کے ذہن میں یہ بات موجود تھی ۔ کہ نعت کا اپنا کوئی عروضی پیمانہ نہیں ہوتا ۔ اور یہ غزل ، قصیدہ اور قطعہ وغیرہ کی شکل میں لکھی جا سکتی ہے ۔ یہ بات

نمبر1 = ڈاکٹر محمد عقیل ۔ کتاب میر انیس ایک مطالعہ مرتبہ ڈاکٹر احراز نقوی ص 459

نمبر2 = انیس ایک مطالعہ ۔ مرتبہ ڈاکٹر احراز نقوی ص 96

منقبت کے بارے میں بھی درست ہے ۔

مختلف ہیئتیں قاری پر مختلف رد عمل ظاہر کرتی ہیں ۔ ہیئت سے مراد شعر کا ظاہری پیکری اور اس کی اندرونی فضا دونوں ہیں ۔ قصیدہ شکوہ الفاظ سے ۔ غزل گرمئ جذبات سے ۔ مثنوی اپنے قصے اور بیانیہ انداز سے ۔ اور رباعی اپنے فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین اور ترنم ریزی سے سننے والے کو متاثر کرتی ہے ۔

منقبت لکھتے ہوئے شاعروں نے مختلف ہیئتوں کا پیمانہ استعمال کیا ہے ۔ کسی نے اظہار عقیدت کو قصیدہ کا رنگ دیا ۔ کسی نے قطعہ کا ۔ کسی نے اپنی داخلی کیفیات کو غزل کے آبگینے میں ڈالا ۔ اور کسی نے رباعی کے روپ میں ۔ کسی نے مثنوی کا رواں دواں انداز اپنایا اور کسی نے مخمس یا مسدس کا ۔ غرض لیلائے منقبت کے مختلف روپ ہیں ۔ اور ہر روپ میں ایک اپنا حسن اور نکھار ہے ۔ اصناف شعر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔ یعنی عروضی اور موضوعی ۔ عروضی اصناف وہ ہیں جن کا اپنا ایک خاص عروضی ڈھانچہ ہے ۔ مثلاً قصیدہ ۔ غزل ۔ رباعی وغیرہ اور موضوعی اصناف میں حمد نعت اور منقبت خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان اصناف کی اپنی کوئی عروضی پہچان نہیں ہے ۔ ان کا مابہ الامتیاز ان کا موضوع ہے ۔ یہ کسی بھی عروضی پیکر میں ڈھل سکتی ہیں ۔ ان کی حیثیت اس خانہ بدوش کی سی ہے ۔ جس کا اپنا نہ کوئی ٹھکانا ہے اور جو جہاں چاہتا ہے پڑاؤ ڈال لیتا ہے اس لحاظ سے انہیں خانہ بدوش اصناف سخن کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

عہد ماضی میں منقبت نگاروں نے زیادہ تر قصیدے کی ہیئت استعمال کی ہے ۔ اس دور میں قصیدہ بڑی مقبول صنف سخن بھی اسے شاعر کی قادر الکلامی اور زور بیان کا امتحان تصور کیا جاتا تھا ۔ اور موضوع کے اعتبار سے دربار میں رسائی حاصل کرنے یا مذہبی عقیدت کے اظہار کے لئے یہ بڑا عمدہ ذریعہ تھا ۔ چنانچہ عربی فارسی اور اردو میں بزرگان دین کی مدح کے لئے یہی پیمانہ استعمال کیا گیا ہے ۔ اور شاعروں نے اسی میں اپنے کمال فن کی داد دی ۔

مذہبی شاعری اور پروپیگنڈا ادب ۔

مذہبی ادب ان تخلیقات سے عبارت ہے جو مذہبی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ منقبت مذہبی ادب کی ایک شاخ ہے ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ شاعر اپنے ممدوح کے اوصاف کا ذکر اس طرح کرے اور اس کی عظمت کو اس انداز سے اجاگر کرے کہ قاری اس کی شخصیت سے متاثر ہو ۔ اس کے دل میں مذہب کی قدر و قیمت بڑھے اور خیالات کی طہارت اور پاکیزگی میں اضافہ ہو ۔

ٹی ۔ ایس ایلیٹ مذہب اور ادب کے موضوع پر اپنے مضمون میں لکھتا ہے !

" دیکھنا یہ ہے کہ شعر و ادب سے محبت رکھنے والے مذہبی شاعری کے متعلق کیا نقطہ نظر رکھتے ہیں ۔ میری مراد ان لوگوں سے ہے جو براہ راست شاعری سے لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ اور اس کا استحسان کر سکتے ہیں ۔ نہ کہ ان لوگوں سے جو شاعری کی اس خصوصی شاخ کے کلام کو مذہبی شاعری کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ تو آپ واضح طور پر اس کو محدود کر رہے ہیں ۔ کیونکہ شاعری کے دلدادگان کی اکثریت مذہبی شاعری کو ادنیٰ شاعری کی ایک قسم سمجھتی ہے ۔ مذہبی شاعر سے مراد وہ شاعر نہیں ہے جو اپنا سارا کلام مذہبی رنگ میں بیان کرتا ہے ۔ بلکہ وہ ایسا شاعر ہے جو اپنے موضوع کے محدود حصے کا ذکر کر رہا ہے ۔ اور ان جذبات کو نظر انداز کر دیتا ہے جنہیں لوگ اعلیٰ جذبات سے تعبیر کرتے ہیں اور اس طرح ان سے اپنی لاعلمی کا اعتراف کرتا ہے "۔[1]

ایلیٹ کے اقتباس سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ جو شاعری مذہبی اساس رکھتی ہے اسے عظیم ادب میں کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اس میں اعلیٰ انسانی جذبات کی ترجمانی نہیں ہوتی لیکن ادبی دنیا کے کئی عظیم شاہکار مذہبی اساس رکھتے ہیں ۔ مثلاً رامائن ۔ ایلیڈ ۔ فردوس گم گشتہ وغیرہ انہیں محض اس وجہ سے عظیم ادب کے دائرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے تار و پود میں مذہب کا خون رواں ہے ۔ البتہ ایسے پروپیگنڈا یا تبلیغی نوعیت کے ادب کو عظیم ادب کے ایوان سے خارج کیا جا سکتا ہے جس میں لکھنے والا براہ راست پروپیگنڈا یا تبلیغی سرگرمیوں میں ملوث ہو ۔

حمد ، نعت اور منقبت وغیرہ مذہبی شاعری کی مختلف صورتیں ہیں ۔ یہ داخلی شاعری کے عہدہ کا نمونہ ہیں ۔ یہاں شاعر اپنے ممدوح کی چند نمایاں صفات سے متاثر ہو کر (جنہیں وہ سچے دل

1. Selected Essays P. 390

سے درست خیال کرتا ہے) ان کے اعتراف کا بر ملا اظہار کرتا ہے ۔ لہٰذا ان نظموں میں شاعر کی ذات کو الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ یہاں خلوص دل ، گہری عقیدت اور سچی تڑپ کا مزہ ملتا ہے۔ ان نظموں میں مدح کی بنیاد شاعر کے اندرونی مہیجات اور وجدانی کیفیات پر ہے ۔ محض چند نظریات کے پروپیگنڈے پر نہیں ہے ۔ یہاں شاعر دامن شعر کو چھوڑ کر مبلغ کا روپ نہیں دھارتا ۔ وہ اخلاقی اور مذہبی اقدار کے حق میں تقریر نہیں کرتا ، وہ جذبات ابھارتا ہے ۔ نصیحت نہیں کرتا ۔ لیکن اس کے ساتھ اگر وہ اشاروں کنایوں میں تبلیغ بھی کرتا ہے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اس طرح سے ادب کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے ۔

مذہب ایک بہت بڑی قوت ہے ۔ جو معاشرے کو متحد رکھتی ہے ۔ یہ ایک منزل ہے جو بکھرے ہوئے عناصر کو یکجا کرتی ہے ۔ اور انہیں فکری ہم آہنگی عطا کرتی ہے ۔ فریڈرک شلجل (   ) کے حوالے سے سکاٹ جیمز لکھتا ہے ۔

" فریڈرک شبل نے کہا کہ ادب کسی قوم کی ذہنی زندگی کا ہمہ گیر جوہر ہے ۔ اس نے اس بات سے انکار کیا کہ زندگی اور ادب کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ اور کہا کہ دونوں کا تعلق ایک ہی عالم سے ہے ۔ اس نے چند حدود کا ذکر بھی کیا جو انسانی برادری کو متحد رکھتی ہیں ۔ اور ان کی تحریکات کی رہنمائی کرتی ہیں ۔ زر اور تجارت کی قوت ، ریاست کی قوت ، مذہب کی قوت اور فکر اور سوچ کی قوت ۔ "[1]

ادب جب معاشرتی رجحانات و میلانات کا علمبردار ہے تو معاشرے کو رشتہ اتحاد میں پرونے والی ایک اہم قوت سے کس طرح اغماض برت سکتا ہے ۔ ادب میں موضوع کے ساتھ ساتھ اس کا ٹریٹمنٹ بھی اہم ہوتا ہے ۔ لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ ادیب نے موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے ادبی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے یا نہیں ۔ اور ادب میں وہ شاعرانہ حسن و صداقت موجود ہے جو کسی ادب پارے کو عام پروپیگنڈا ادب سے الگ کرتا ہے ۔

حمد ، نعت ، مرثیہ وغیرہ اصناف سخن جو مذہب کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں ۔ پروپیگنڈا ادب کی ذیل میں نہیں آتیں ۔ یہاں شاعر نظریات کی تبلیغ نہیں کر رہا بلکہ اظہار محبت کر رہا ہے ۔ ذات حقیقی سے یا چند عظیم تاریخی شخصیات سے جو حسن اتفاق سے اس کی مذہبی

۱ . Making of literature بحوالہ اردو مرثیے میں دبیر کا مقام: مسلم حسن ملک ص 203

رہنما بنی ہیں - شاعری میں خلوص اور صداقت کی بڑی اہمیت ہے - ان نظموں میں اس کی کمی نہیں - یہاں اعلی انسانی جذبات کے اظہار کی پوری گنجائش موجود ہے - اس لئے انہیں ادنیٰ شاعری کے نمونے کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا -

آنحضرت کی ذات گرامی کے بارے میں جو نعتیہ اشعار لکھے گئے ہیں - مسلمانوں کے مذہبی ادب میں اس کی روایت بڑی مضبوط ہے - شاعروں نے ان اشعار میں اپنے قلب و جگر کا خون شامل کرکے ایسی شاعری کی تخلیق کی ہے - جو مذہبی ہونے کے باوجود اپنے اندر شعر کی سا ری خوبیاں رکھتی ہے - منقبت نگار شاعروں نے بھی نعتیہ شاعری کی روایت کو سامنے رکھا ہے - انہوں نے اصحاب رسول ، اہل بیت رسول اور تابعین رسول (اولیائے کرام) کو موضوع بناتے وقت شاعری کے لوازمات کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور عمدہ شاعری تخلیق کی ہے -

اردو کا شعری ادب فارسی شاعری کے زیر سایہ پروان چڑھا - جن لوگوں نے اردو شاعری کا آغاز کیا یا جنہوں نے اس کی نشو و نما میں حصہ لیا - شاعری کے بارے میں ان کا تصور فارسی شاعری سے الگ کچھ نہ تھا - اردو میں شعر کہنے والوں کے سامنے فارسی شاعری کی روایت موجود تھی - انہوں نے اسی کی پیروی کی - اور اصناف سخن سے لے کر تشبیہ ، استعارہ اور دیگر لوازمات شعری تک اسی کو معیار سخن تصور کیا - منقبت نگاری کا جو انداز عربی شاعری میں شروع ہوا تھا - وہ ایران کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ فارسی شاعری میں منتقل ہوگیا - فارسی شعراء نے اپنے کمال فن سے اسکا دامن وسیع کیا - اسی کے زیر اثر اردو میں منقبت نگاری کا پودا پھلا پھولا - چنانچہ اردو منقبت نگاری کے تفصیلی جائزے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے - کہ عربی اور فارسی کے مشہور منقبت نگاروں کی تخلیقات کا اجمالی جائزہ لیا جائے - تاکہ اردو منقبت نگاری کے واضح رجحانات کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی جا سکے -

بـــــاب دوم

عربی اور فارسی منقبت نگاری

عربی شاعری ظہور اسلام سے پہلے

عربون کو شاعری سے گہری وابستگی رہی ہے۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا علم شعر و شاعری کا علم تھا۔ یہی ان کا ادبی اثاثہ تھا اور ان کے نزدیک اسی کی شہادت معتبر تھی اور ان کے مقاصد کی تکمیل سب سے زیادہ اہم تھی۔

ابن رشیق نے لکھا ہے

" پہلے یہاں سارے کا سارا کلام نثر مین تھا۔ پھر عربون کو اپنے مکارم اخلاق، خاندان کی پاکیزگی، اچھے دنون کے ذکر، دور دراز کے وطن بہادر گھوڑ سوارون اور سخیون کے گیت گانے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ ان کے نفس بھی کار کریمانہ کے لئے حرکت مین آ جائین اور وہ اپنے بیٹون کی اچھے اخلاق کی طرف رہنمائی کر سکین لہذا انہون نے چند عروضون کو اپنے ذہن مین رکھ کر انہین کلام کے لئے وزن بنا لیا اور جب وزن مکمل ہو گیا تو اس کا نام شعر رکھ دیا کیونکہ انہون نے اس کا شعور حاصل کر لیا تھا۔ یعنی اسے سمجھ لیا اس فن پر انہیں پورا عبور حاصل ہے۔ اس لئے کہ ان کی زبان مین مفہوم ادا کرنے کے لئے بہت زیادہ وسعت ہے ان کا ماحول خیال آفرینی کے لئے مناسب و موزون ہے۔ ان کی طبیعتین پاکیزہ اور ان کی زندگیان سادہ ہین ۔ قوّت، عصبیت اور جذبۂ آزادی ان مین بدرجۂ اتم موجود ہے نیز ان کا جزیرہ ان تمام موانع سے خالی ہے جو ذہن کو غور و فکر کی راہ سے روکین۔"[1]

عربون مین ایک رسم تھی جس سے شاعری اور شاعر کی اہمیت اور حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب ان کے قبیلے مین شاعر ظہور پذیر ہوتا تو دیگر قبائل آ کر انہین اس امر پر مبارک باد دیتے۔ ایک عظیم الشان دعوت کا اہتمام کیا جاتا اور عورتین اکٹھی ہو کر ساز بجاتین اور گیت گاتین ۔ جیسے کہ عام طور پر شادی بیاہ کے موقع پر کرتی ہین ۔ لوگ ایک دوسرے کو بشارت دیتے کیونکہ ان کے نزدیک شاعر ان کی عزتون کو بچانے والا، ان کی مدافعت کرنے والا، ان کے کارنامون کو ہمیشگی بخشنے والا اور ان کی شہرت کو دور دور تک پھیلانے والا ہوتا تھا۔" ان کے ہان

نمبر ١ العمدة ص ٢٠ مطبوعۂ مصر

صرف تین موقعوں پر ایک دوسرے کو مبارک باد دی جاتی تھی۔ لڑکا پیدا ہونے پر، گھوڑی کے بچہ جننے پر اور شاعر بننے پر۔" نمبرا ص ١

وقت اسی طرح آگے بڑھتا رہا اور شاعری اور شاعر کی عزت و تکریم میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس زمانے میں شعر کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ چند شعر ایک بڑی جنگ کی آگ بھڑکا سکتے تھے یا لگی ہوئی آگ کو بجھا سکتے تھے۔ اشعار اس زمانے میں اشتہار کا درجہ رکھتے تھے اور ان سے اکثر وہ کام لیا جاتا تھا جو موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ سے لیا جاتا ہے۔

عربی شاعری ظہور اسلام کے بعد

سید دوعالم جب دنیا میں تشریف لائے تو اسوقت عربوں کی زندگی میں جاہلانہ ذہنیت اور قبائلی عصبیت مستحکم ہو چکی تھی۔ شاعری ان جذبات و احساسات کو ظاہر کرنے اور ابھارنے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ جب آنحضرت ص نے اور قبائل میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لئے عملی اقدامات کا آغاز کیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ ان شاعروں کی حوصلہ شکنی کی جائے جو جنگ کے شعلے بھڑکانے اور عصبیت کے شر کو پھیلانے کا سبب بنتے ہوں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ "الشعراء یتبعھم الغاون" یعنی شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ ص ٢ ایک دوسری جگہ آتا ہے "و ما علمناہ الشعر و ما ینبغی لہ" اور ہم نے اس (نبی) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ شاعری ص ٣ اس کی شان کے شایان ہے۔ چنانچہ ابتدا میں مسلمانوں نے شعرگوئی سے پہلوتہی سے کام لیا ۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ مذہب کلی طور پر شاعری کی نفی نہیں کرتا بلکہ وہ شاعری کی محض اس قسم کو ناپسند کرتا ہے جو اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کرتی ہے اور دلوں میں پوشیدہ بغض و عداوت کو ابھارتی ہے۔

جب اسلام کی دعوت عام ہوئی تو آنحضرت کی مخالفت میں زبانوں اور نیزوں کو استعمال کیا جانے لگا۔ شعرائے عرب غیرجانب داری سے دور کھڑے ہو کر حق و باطل، توحید پرستی،

ص ١ = تاریخ ادب عربی : احمد حسن زیات : ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی ص ٧٦

ص ٢ = سورۃ الشعراء آیت ٢٢۴

ص ٣ = سورۃ یٰسین آیت ٦٩

اور بت پرستی یعنی سرور کائنات اور قریش کے درمیان ہونے والے معرکے کے انجام کا انتظار کرنے لگے۔ اس جھگڑے مین قریشی شاعرون کے سوا کسی نے حصہ نہین لیا۔ قریش کی طرف سے زبانی حملے کا آغاز عبداللہ بن الزبعری، عمر بن العاص اور ابو سفیان کی طرف سے ہوا۔ انہون نے آنحضرتؐ اور ان کے متبعین کو دل خراش ہجوون کے ذریعے سخت اذیّت پہنچائی جس سے مسلمانون مین بھی جذبۂ شاعری بھڑک اٹھا۔ اور انہون نے خواہش ظاہر کی کہ آنحضرت انہین مخالف شاعرون کے جواب مین شعر کہنے کی اجازت مرحمت فرمائین۔ کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ آنحضرت نے ان سے فرمایا [1]

" جن لوگون نے اللہ اور رسولؐ کی اپنے ہتھیارون سے مدد کی ہے ان کو کیا چیز روکے ہوئے ہے کہ وہ اپنی زبانون سے ان کی مدد نہین کرتے" ۔

حضرت حسان [2] نے یہ سن کر اپنی زبان نکال کر کہا۔

" بخدا اگر مین اسے چٹان پر رکھ دون تو اس کے دو ٹکڑے ہو جائین اور بالون پر رکھ دون تو یہ بال مونڈ ڈالے" اس پر آنحضرت نے فرمایا تم قریش کی ہجو کیسے کرون گے جب کہ مین بھی انہین مین سے ہون۔ اس پر حضرت حسان نے فرمایا" مین آپ کو اس طرح صاف نکال لون گا جس طرح گندھے ہوئے آٹے سے بال "۔ آنحضرتؐ نے فرمایا" جاؤ ابوبکر سے ملو وہ تم کو ان لوگون کے کمزور پہلو سمجھا دین گے۔ پھر ان کی ہجو کرو۔ جبرئیل تمہارے ساتھ ہین "۔

چنانچہ وہ شعرا جو حضور کے خلاف دریدہ دھنی کا ثبوت دے رہے تھے انہون نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلاف بھی زبان درازی شروع کر دی۔ اس کے ردعمل کے طور پر مسلمان شعرا نے حضور نبی کریم کے اوصاف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مناقب بھی بیان کرنے شروع کر دیئے -

ایک رات تمام اہل مکہ نے سنا کہ کوئی شخص بڑی دلنشین آواز مین چند اشعار پڑھ

---

[1] تاریخ ادب عربی - از استاد احمد حسن زیات ص ١٤٦

[2] دربار رسول کے ممتاز شاعر، ٥٣ ھ مین ایک سو بیس برس کی عمر مین آسودہ خاک ہوئے ان کی عمر کے ساٹھ سال زمانہ جاہلیت مین گزرے اور ساٹھ سال انہون نے اسلام کی خدمت کی۔

رہا ہے۔ اس کی آواز اس قدر صاف تھی اور اس میں اتنی جاذبیت تھی کہ ہر ایک نے یہ اشعار سنے اور ہر ایک کو ان کا ایک ایک لفظ یاد رہ گیا مگر وہ کون تھا اور کہاں تھا یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ لوگ اس سمت کی طرف بڑھے جدھر سے آواز آ رہی تھی مگر کسی کو اس کا سراغ نہ مل سکا۔ اس لئے عوام میں مشہور ہو گیا کہ کوئی جن ہوگا۔ چنانچہ ان اشعار کو شعرالجنی کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔

۱۔ پروردگار عالم بہتر سے بہتر صلہ ان دونوں رفیقوں کو دے جو ام معبد کے خیموں میں ٹھہرے تھے[1]۔

۲۔ وہ دونوں حسن سلوک کی علامت بن کر آئے اور اسی شان سے رخصت ہوئے۔ بڑا ہی خوش بخت ہے وہ جو محمدؐ کا ہم سفر بنا۔

۳۔ بنو کعب کے قبیلے کو مبارک ہو ان کی دختر کا ٹھکانہ، جو اہل ایمان کے انتظار میں بیٹھنے کی جگہ بن گیا ہو۔

حضرت حسان بن ثابت نے اس زمین میں پورا[2] قصیدہ کہہ دیا جو ان کے دیوان میں موجود ہے مگر بعض لوگوں نے ان اشعار کو بھی ان مذکورہ بالا تین شعروں کے ساتھ ملا کر "کسی نامعلوم شاعر" کے اشعار قرار دیا ہے۔ چنانچہ نجد کے مشہور عالم شیخ محمد بن عبدالوہاب (جن کے نام سے وہابیت کی نسبت ہے) نے اپنی کتاب میں[3] چودہ اشعار نقل کئے ہیں۔ تیرھویں شعر کا ترجمہ یہ ہے۔

" ابوبکر کو قسمت کی یاوری مبارک ہو جو رسول کی رفاقت سے حاصل ہوئی۔ اللہ جس کو نوازے وہ خوش قسمت ہو ہی جاتا ہے" ۔

عربی کی پہلی منقبت

جمہرۂ اشعار العرب کے مصنف نے عبداللہ بن عباس کی سند سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ

---

[1] ام معبد کے خیمے میں آنحضرت کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق تھے۔

[2] عربی میں نعتیہ کلام از عبداللہ ندوی ص ۲۷

[3] مختصر سیرۃ الرسول

تک یہ بات پہنچی کہ کچھ لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق کے خلاف زبان درازی کی ہے ۔ آپ نے منبر پر تشریف فرما ہو کر خدا کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر ارشاد فرمایا" تم میں سے کسی نے ابوبکر سے زیادہ اپنی جان اور مال سے میری اعانت نہیں کی۔ تم نے مجھے جھوٹا سمجھا لیکن ابوبکر نے سچا جانا۔ اگر میں دوست بناتا کسی کو تو دوست بناتا ابوبکر کو۔ آگاہ رہو کہ تمہارا صاحب اللہ کا دوست ہے"۔ پھر حضرت حسان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا [ص۱] کہ ابوبکر کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا ہے وہ لاؤ"۔ حضرت حسان نے یہ اشعار پیش کئے۔

۱۔ جب تو کسی قابل اعتماد بھائی کا ذکر کرے تو اپنے بھائی ابوبکر کا بھی ذکر کر ان کارہائے نمایاں کی وجہ سے جو انہوں نے سرانجام دیئے ہیں ۔

۲۔ وہ اپنی ترتیب کے لحاظ سے دوسرے ہیں ۔ ان کی خصائص محمود ہیں وہ تمام مخلوق میں سب سے پہلے ہیں جنہوں نے رسول اللہ کی تصدیق کی۔

۳۔ وہ دو میں سے دوسرے ہیں اس بلند غار میں جب دشمن نے چکر لگائے اس کے گرد جب وہ اس پر چڑھا۔

۴۔ وہ رسول اللہ کے محبوب ہیں اور لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ مخلوقات میں کوئی بھی ان کے برابر کا نہیں ہے ۔

۵۔ وہ مخلوق میں بہترین ہیں۔ ان سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہیں۔ نبی کے بعد اور انہوں نے پورا کر دکھایا اس ذمہ داری کو جو ان کو سونپی گئی"۔ [ص۲]

حضور نے ان اشعار کو سن کر فرمایا! حسان، تم نے سچ کہا۔

منقبت نگاری کی تاریخ میں یہ شعر نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اشعار میں سادگی ہے، سچائی ہے، روانی ہے اور یہ مبالغہ اور غلو سے پاک ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق وہ پہلی عظیم المرتبت شخصیت ہیں جو منقبت نگاری کا موضوع بنی۔ شعرالجنی میں بھی حضرت ابوبکر صدیق کا ذکر موجود ہے لیکن وہ بنیادی طور پر نعتیہ اشعار ہیں۔ اگرچہ بعد میں

[ص۲] شرح دیوان حسان بن ثابت از عبدالرحمن البرخوقی مطبوعہ مصر ص ۲۹۹

منقبت نگاری کا انداز یہ بھی رہا کہ اسے نعت کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا گیا کیونکہ بزرگان دین کا مقام اور مرتبہ بھی دراصل سرور عالم سے وابستگی ھی کا نتیجہ ھے۔ لیکن منقبت نے الگ حیثیت سے بھی اپنا وجود منوایا۔ اس کی امتیازی خصوصیت موضوع ھے۔ فارم یا ھیئت نہین ھے۔ جس طرح نعت مختلف ھیئتون مین لکھی گئی ھے لیکن اس کا معتدبہ حصہ نعتیہ قصائد کی شکل مین موجود ھے۔ اسی طرح منقبت نے اصحابہ کرام، آئمۂ عظام اور بزرگان ذی احتشام کے مدیہ قصائد کی صورت مین اپنا وجود قائم رکھا۔

حسان بن ثابت مخضرم شعرأ مین سے ھین۔ یعنی ان کا شمار ان شعرأ مین ھوتاھے جو جاھلیت اور اسلام دونون زمانون مین عمدہ شاعری کرنے والے ھین۔ ان کی زبان مستند تھی فصاحت و بلاغت ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اپنی بلندیٔ فکر، شوکت الفاظ، قدرت فن اور طرفگی ادا کے سبب ھم عصر شعرأ مین سربرآوردہ شمار ھوتے تھے۔ ان کا کلام معنی آفرینی، ترکیبون کی چشتی الفاظ کے حسن انتخاب، جوش اور روانی کی خوبیون سے مزین تھے۔ وہ غزوات کے ھر موقع پر فتح کے کارنامون کو بیان کرتے، شہدأ کا مرثیہ کہتے اور اسلام کی برتری کا سکہ اغیار کے دلون مین بٹھاتے۔ ان کے لئے سب سے بڑی سرفرازی کی بات یہ ھے کہ آنحضرت نے ان کو یہ اعزاز بخشا کہ مسجد نبوی مین ان کے لئے منبر رکھوایا جس پر بیٹھ کر وہ شعر سناتے تھے۔ عرب شعرأ نے جھوٹ اور مبالغے کو کبھی شاعری مین جگہ نہین دی۔ انہون نے جس چیز کو درست اور سچ جانااسی کو اپنے شعر کی زینت بنایا۔ عرب اولاً تو کسی کی شاعرانہ مدح عار سمجھتے تھے اور اگر کرتے بھی تھے تو کبھی صلہ اور انعام لینا گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک رئیس نے ایک عرب شاعر سے کہا کہ میری مدح لکھو تو اس نے کہا" افعل حتی اقول ،، کچھ کرکے دکھاؤ تو کہون۔

حسان بن ثابت کے قصیدون مین مبالغہ اور غلو نہین ھے۔ انہون نے وھی باتین کہی ھین جن کا انہون نے مشاھدہ کیا ھے۔ انہون نے سرور کائنات کی نعت لکھی تو فرط عقیدت سے اسے حمد نہین بنایا اور رسول کو خدا کے مرتبے تک نہین پہنچایا۔ انہون نے دینی حدود کے اندر رہتے ھوئے سرورعالمؐ کی تعریف کی ھے۔

" حضرت حسان کے نعتیہ کلام کی ایک نمایان خوبی یہ بھی ھے کہ وہ دین حق کی مدد کرنے والون کو بھی رسول اللہ کی قوت تخلیق کا شاھکار خیال کرتے ھوئے ان کی تعریف کو بھی نعت رسول مین شامل کر لیتے تھے۔ یون صحابہ کرام کی منقبت بھی نعتیہ مضامین مین شامل ھو گئی ۔ نعت مین منقبت صحابہ کے اولین نمونے آپ ھی کے کلام مین ملتے ھین۔" ص۱

عہد نبوی مین جن شعراء کو خصوصی شہرت نصیب ھوئی ان مین کعب بن زھیر کا نام بڑا نمایان ھے۔ ان کی شہرت کا بڑا سبب ان کا وہ قصیدہ لامیہ ھے جو قصیدہ بانت سعاد کے نام سے مشہور ھے۔ اس مین ۶۰ اشعار ھین۔ اس مین حضور اور آپ کے صحابہ کی تعریف کی گئی ھے۔ یہ قصیدہ حضور کی موجودگی مین پڑھا گیا۔ جب کعب اس شعر پر پہنچے :

ان الرسول لنور یستضاء بہ　　مہند من سیوف اللہ مسلول

تو رسول اکرم نے اپنی ردائے مبارک انھین عطا فرمائی ۔ اس وجہ سے اس قصیدے کو قصیدہ بردا بھی کہا جاتا ھے۔ اس کے بعد کے اشعار مین اصحابہ کی مدح ھے۔

۵۸- اگر انھین جنگ مین کامیابی ھوتی ھے تو اتراتے نہین اور اگر کوئی صدمہ پہنچے تو گھبراتے نہین ۔

۵۹- وہ میدان جنگ مین سفید اونٹنیون کی طرح وقار کے ساتھ جاتے ھین ۔

۶۰- نیزے ان کے سینون پر ھی لگتے ھین پیٹھ پر نہین لگتے اور نہ وہ میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرتے ھین۔

عربون مین قبائلی عصبیت ھمیشہ کی طرح طرح کے فتنے جگاتی رھی۔ ظہور اسلام کے بعد بھی یہی صورت حال رھی۔ البتہ یہ آگ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ کبھی ھلکی اور کبھی تیز ھوتی رھی۔ خلافت ابوبکر اور عمر کے زمانے مین ان کے حسن تدبیر، کمال عدل اور عوام کے جہاد اور فتوحات مین مصروف کار رھنے کی وجہ سے دبی رھی لیکن جب اقتدار کی زمام حضرت عثمان کے

ص۱ اردو [ڈاکٹر ریاض مجید] نعت گوئی ۔ غیر مطبوعہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۔ ص ۱۰۳

ص۲ تاریخ ادب عربی ۔ ترجمہ عبدالرحمن طاھر سورتی ۔ ص ۱۷۸

ہاتھ آئی تو اختلاف کا آغاز ہوا اور بقول احمد حسن زیات " اب صرف خلیفہ ہی رائے دینے والا نہ تھا۔ اس کے خاندان نے بھی عربی قومیت کو چھوڑ کر اموی تعصب کو ہوا دیتے ہوئے حکومت شروع کر دی۔"[۱] چنانچہ ایک فتنہ جاگ اٹھا جس کا خاتمہ حضرت عثمان کی شہادت پر ہوا۔ اس کے بعد حضرت علی اور معاویہ کے درمیان محاذآرائی شروع ہو گئی جس سے نظام حکومت درہم برہم اور اتحاد اسلامی پارہ پارہ ہو گیا اور عربوں کی تلواریں دشمنوں سے جہاد کرنے کی بجائے آپس میں ٹکرانے لگیں۔ شام میں بنو امیہ کی پشت پناہی کرنے والے موجود تھے۔ حجاز میں ابن زبیر کے حمایتی ان کے لئے کام کر رہے تھے۔ عراق میں اہل بیت کے مؤیدین تھے جو خلافت پر ان کا حق فائق سمجھتے تھے۔

شاعری اپنے ماحول کی ترجمان ہوتی ہے۔ وہ اس دور پرآشوب کی تعصب پرستی اور جنگ جویانہ طرز عمل سے کس طرح بچ سکتی تھی۔ چنانچہ وہی ان تفرقوں اور فتنوں کے اظہار کا وسیلہ بنی اور ایک دوسرے سے ٹکرانے والوں نے اس سے وہی خدمت لی جو آجکل ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات سے لی جاتی ہے۔ اسی کے وسیلے سے جنگ کے شعلے بھڑکائے جاتے تھے اوراسی کی بدولت مفاہمت اور رواداری کی فضا پیدا کی جاتی تھی۔ شاعری ہی سے قائدین کی حمایت اور مدافعت کی جاتی تھی اور اسی سے مخالفین کے بخیئے ادھیڑے جاتے تھے۔ عصر اموی اسلامی قدروں کے انحطاط کا زمانہ تھا۔ اکثر شعراء شراب اور تغزل کی طرف مائل تھے۔ رسول اللہ کی نعت کہنا خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ بالواسطہ اس قسم کے اشعار سے رسول اللہ کے اہل بیت سے لوگوں کی عقیدت و محبت میں اضافہ ہوتا تھا اور حکمران خاندان ان کو اپناسیاسی حریف سمجھتا تھا۔ اسلئے وہ اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ہشام بن عبدالملک نے اپنے باپ کے زمانے میں خانہ کعبہ کا طواف کیا اور کوشش کی کہ حجراسود تک پہنچ کر اسے چوم سکے لیکن وہ بھیڑ کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ لہذا اس کے لئے ایک کرسی بچھائی گئی اور وہ لوگوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ سرداران شام بھی تھے۔ اس نے دیکھا کہ امام علی زین العابدین تشریف لائے، انہوں نے طواف کیا اور جب حجراسود کا رخ کیا تو لوگوں نے ادھر ادھر ہٹ کر راستہ بنا دیا۔ ایک شامی نے ہشام سے پوچھا کہ یہ کون ہے

۱۔ تاریخ ادب عربی ۔ ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی۔ ص ۱۷۸

جس سے لوگ اس قدر مرعوب ہو گئے ہیں؟ ہشام نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا" میں نہیں جانتا،، ۔ عہد اموی کا ایک ممتاز شاعر فرزوق[۱] وہاں موجود تھا ۔ اسے یہ جواب بہت برا لگا اور اس نے امام زین العابدین کی شان میں ایک زوردار قصیدہ کہا ۔ حکمرانوں کو یہ بات پسند نہ آئی اور فرزوق کو قید کرا دیا گیا ۔ اس قصیدے کا مطلع یہ ہے :

ھـذا الذی تعرف البطحاو طاتـہ والبیت یعرفـہ ، والحل و الحرام

"یہ وہ ہے جسے سرزمین بطحا پہچانتی ہے اور خانہ کعبہ، حرم اور غیرحرم سب ہی مقامات ان کو جانتے ہیں"۔ باقی اشعار کا مفہوم یہ ہے :

یہ خیرالعباد کا فرزند ہے۔ یہ تقی، نقی، طاہر اور سردار ہے۔ یہ حضرت فاطمہ کا بیٹا ہے۔ اس کے نانا ختم المرسلین ہیں۔ انہیں عرب وعجم سب جانتے ہیں۔ اگر تو انہیں نہیں جانتا تو اس سے ان کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی۔ یہ نرم خو ہیں اور کسی سے ناراض نہیں ہوتے۔ یہ وعدہ ایفا کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالی نے انہیں حکمت و دانائی کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ان کے نانا تمام انبیاؑ سے افضل ہیں جن کی امت کے سامنے ساری امتیں بےوقعت ہیں۔ وہ اس گروہ سے ہیں جن کی محبت دین ہے، قرب باعث نجات ہے اور جن کا بغض کفر ہے۔ ذکر الٰہی کے بعد ان کا ذکر مقدم ہے ۔ اگر پرہیزگاروں کا شمار کیا جائے تو وہ امام ہیں۔ اگر زمین پر بہترین لوگوں کی تلاش کی جائے تو وہ یہ ہیں۔ وہ مصیبت کے وقت فریاد رس ہیں اور جنگ کے وقت جھاڑیوں کے شیر ہیں۔ ان کی محبت سے مصیبتیں دور ہوتی ہیں اور نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمود الٰہی لکھتے ہیں کہ عربی میں منقبتی شاعری کا آغاز فرزوق سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے امام زین العابدین کی منقبت میں اس نے شاندار قصیدہ میمیہ لکھا جو آن کی آن میں سارے عرب میں پھیل گیا اور اس کی شہرت میں آج تک کمی واقع نہیں ہوئی[۲]۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرزوق کا یہ قصیدہ اس کی فنی مہارت اور شاعرانہ صلاحیتوں کا عمدہ اظہار ہے اور اس

---

[۱] بصرہ میں پیدا ہوا ۔ اہل بیت کی مدافعت اور حمایت میں اس کے کچھ قابل تعریف کارنامے ہیں بنیادی طور پر ہجوگو شاعر تھا، ۱۱۰ھ میں فوت ہوا ۔

[۲] اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ۔ ص ۹۴

سے اس کی شہرت مین بڑا اضافہ ہوالیکن یہ عربی مین منقبتی شاعری کا حرف آغاز نہین ہے۔ اس سے بہت پہلے حسان بن ثابت حضرت ابوبکر صدیق کی مدح مین اشعار لکھ چکے تھے جو سیدعالمؐ کی فرمائش پر آپ کی موجودگی مین پڑھے جا چکے تھے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ ان اشعار مین حضرت ابوبکر کے خصائص سیدھے سادے انداز مین اور آسان الفاظ مین بیان کئے گئے ہین اور ان مین جذبات کی وہ حرارت اور الفاظ کا وہ شکوہ موجود نہین جو فرزوق کے قصیدے کا طرۂ امتیاز ہے۔

کمیت بن زید اسدی[۱] اپنے قصائد " ہاشمیات " کی وجہ سے بنو ہاشم کا بےمثال شاعرتھا اس نے پر خلوص دل اور رواں اور پرجوش طبیعت سے ان کی حمایت کی وہ اپنے ایک قصیدے مین اہل بیت کی محبت کا اظہار یون کرتاہے۔

مین مصیبت کے وقت ان کو اللّٰہ کی طرف سے وسیلہ بناتا ہون۔ مین اگر کسی سے ناراض ہوتا ہون تو ان کے لئے۔ خوش ہوتا ہون تو ان کی خاطر۔ لوگ مجھ سے عداوت رکھتے ہین۔ مجھے برا کہتے ہین کہ مین بنی ہاشم اور اہل بیت سے کیون محبت کرتا ہون۔ میرے لئے تو آل نبی ہسی مقتدیٰ ہین اور وہی میرے مرجع ہین۔ یہ وہ لوگ ہین جن سے قریش قابل تعظیم ٹھہرے۔ ان کے فضائل کے خیمے بڑے لمبے چوڑے ہین۔

ابوالاسود دوئلی[۲] کہتے ہین :

مین حضرت محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم سے بہت محبت کرتا ہون اور عباس، حمزہ اور وصی سے۔ یہ نبی کے چچا کے فرزند ہین اور اقربا مین سے ہین۔ ساری مخلوق مین یہ مجھے محبوب تر ہین۔ اگر ان کی محبت صحیح ہے تو بھی مجھے پہنچے گی اور اگر غلط ہے تب بھی پہنچے گی۔

ابو نواس[۳] آل علی سے اپنی محبت کا اظہار یون کرتے ہین :

جو شخص علوی نہ ہو اس کے لئے کبھی کوئی فخر نہین۔ اللّٰہ نے مخلوق بنائی تو انہین پاکیزہ بنایا۔ وہ ملاء اعلی ہین۔ ان کے پاس علم کتاب ہے۔ ان کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو درود اور

ص۱ کمیت بن زید اسدی ۶۰ھ کو کوفہ مین پیدا ہوا۔ زبان سیکھنے کے بعد ادب اور علم مین مہارت حاصل کی۔ ایک دفعہ بنی امیہ کی مذمت اور بنوہاشم کی مدح کرنے پر ہشام نے اس کے قتل کا حکم دیا لیکن وہ جیل سے بھاگ نکلا اور شام جاکر معاویہ بن ہشام کی قبر سے پناہ گیر ہوا جس پر خلیفہ نے اسے معاف کر دیا۔ ۱۲۶ مین انتقال کیا۔

ص۲ شاعر ہونے کے علاوہ عربی صرف و نحو کا ماہر تھا۔ م ۶۹ھ

ص۳ شاعری کی تمام اصناف مین طبع آزمائی کی لیکن خمریات کی وجہ سے خصوصی شہرت حاصل کی م ۱۹۹ھ

سلام بھیجا جاتا ھے۔

اس کے چند اور اشعار کا مفہوم یہ ھے :

ایک شخص کہنے لگا تو آل طٰہ[۱۱] کی بڑی تعریف کرتا ھے کیا تجھ پر فرض ھو گیا ھے کہ ساری مدح ان پر ختم کر دے میں نے کہا کیا کروں ساری مخلوق ان سے استفادہ کرتی ھے۔ میں ان لوگوں کی کیا مدح کر سکتا ھوں جن کے والد بزرگوار کا خادم جبرئیل تھا۔

امام محمد بن ادریس شافعی[ص۱] کہتے ھیں :

لوگ مجھے کہتے ھیں کہ تو رافضی ھو گیا ھے۔ میں نے کہا رفض میرا مسلک و اعتقاد نہیں ھے لیکن اگر تم حب علی کو رفض کہتے ھو تو میں سب سے بڑا رافضی ھوں۔

ایک اور شعر میں کہتے ھیں کہ اگر میرا گناہ حب آل محمد ھے تو میں اس گناہ سے کبھی توبہ نہیں کروں گا۔

ص۱۔ فقہ کے معروف امام (متوفی ۲۰۳ھ)

عربی شاعری کا جائزہ

صحرائی زندگی کی سختی ، بےکیفی اور سادگی نے عربون کی شاعری کو ایک خاص امتیازی شان عطا کر رکھی تھی۔ چنانچہ عربی شاعری کی پہلی خصوصیت راستی اور سچائی ہے۔ اس مین جذبے کی سچی عکاسی اور فطرت کی صحیح ترجمانی موجود ہے اور آرائش زبان و بیان اور تکلفات شعری سے یہ شاعری بالکل مبرا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس شاعری مین فکری تسلسل پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اسلئے شعرون مین منطقی ربط مفقود ہوتا ہے یہان تک کہ اگر شعرون کی ترتیب بدل دی جائے یا بعض شعرون کو قطعی طور پر محذوف کر دیا جائے تو بھی کوئی کمی محسوس نہین ہوتی۔ عرب کی فضا ایک دیہاتی فضا تھی اور " دیہاتی فلسفیانہ نظر نہین رکھتے ان کی نگاہ مین تمام اشیاء اور حوادث ایک دوسرے سے الگ اور بےتعلق ہوتے ہین جنہین کوئی رشتہ باہم نہین ملاتا۔ یہی سبب ہے کہ عربون مین شاعری پرکھنے کا معیار ایک شعر ہوتا ہے پوری نظم نہین ہوتی،، [ص۱] ان کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا آغاز عام طور پر کھنڈرات اور مکانات کے ذکر سے ہوتا ہے۔ اسلئے کہ عرب خانہ بدوش زندگی گزارتے تھے۔ آج یہان خیمے نصب کر لئے تو کل وہان۔ جہان کچھ سبزہ اور پانی نظر آیا وہان کا رخ کر لیا۔ چنانچہ اسی آمدورفت مین جب کوئی شاعر پہلی جگہ سے گزرتا تو اسے اپنا گزرا ہوا زمانہ یاد آ جاتا۔ وہ ان دوستون کو یاد کرتا جو اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے اور پھر وہ لطیف یادین اسے بےقرار کر دیتین ۔

" عربی شاعری جاہلیت اور اسلام مین اپنے ظاہر و باطن اور اپنی قسم کے اعتبار سے اواخر عہد بنو امیہ تک ایک ہی طریقے پر رہی۔ سیاست ، تمدن اور نئے مذہب کے اثر نے بھی اس کو کسی نئے راستے پر نہین ڈالا ۔ البتہ ان چیزون نے اس کے بہت سے گوشون کو اجاگر اور معانی و مضامین کو وسیع تر کر دیا جس سے شاعری کے بعض موضوعات مثلاً ہجو کو تقویت پہنچی اور بعض مین کوئی نمایان خصوصیت پیدا ہو گئی مثلاً غزل۔ بھلا شاعری مین جدت طرازی کا امکان کس طرح پیدا ہوتا جبکہ تمام شعراء دیہاتون اور جنگلون سے آتے تھے،، ۔

ص۱ تاریخ ادب عربی = احمد حسن زیات - ص ۷۹

ص۲ - ایضاً - ص ۱۷۷

احمد حسن زیات کی یہ بات جزوی طور پر درست ہے۔ عربی شاعری مدح ، ھجو، رثا اور تشبیت پر مشتمل تھی لیکن طلوع اسلام کے ساتھ موضوعات میں جو تبدیلی پیدا ہوئی اس کی طرف انہوں نے اشارہ نہیں کیا۔ خدائے واحد کے اقرار کے علاوہ حضور سرورکائنات کی ذات گرامی سے مسلمانوں کو والہانہ محبت تھی۔ حضور کے اکابر رفقاء کو بھی وہ دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔ آپ کے اہل بیت بھی ان کی شیفتگی کا مرکز تھے لہذا حمد ، نعت و منقبت کے مضامین بھی شاعری میں داخل ہو گئے۔ اگرچہ یہ مدح ہی کی ایک صورت تھی۔ لیکن اس کا انداز قدیم مدحیہ شاعری کی بالکل مختلف تھا۔ یہاں تیغ زنی اور بہادری کا مضمون نہیں تھا بلکہ مذہبی اخلاقی اور روحانی اوصاف کا ذکر تھا۔ ایک ایسی شیفتگی کا اظہار تھا جس کی مثال ادب عالم میں نہیں ملتی۔ شاعری کا اسلوب اگرچہ قدیم ہی رہا ۔ خدا کی حمد ، رسولؐ کی نعت اور ان کے خلفاء کی مدح نے شاعری کے نئے افق واضح کر دیئے اور قلم کی زبان ایک نئے ذائقے سے آشنا ہوئی۔

قدیم اقوام نے رزمیہ اور ڈرامائی شاعری کو شکل میں اپنی تہذیب و معاشرت کو محفوظ کر رکھا ہے۔ لیکن عربی میں ایسی شاعری کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس لئے کہ ان اصناف میں طبع آزمائی کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے اور عرب غور و فکر سے بےنیاز، برجستگی اور بدیہہ گوئی کے عادی تھے۔ ان کلاسیکی اصناف میں دوسروں کے کرداروں اور ان کی نفسیات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن اہل عرب اپنے آپ میں اس قدر محو تھے کہ انہیں دوسروں کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہ تھی ۔ علاوہ ازیں یہ اصناف طوالت اور تجزیہ کی طالب تھیں۔ اہل عرب اختصار کے رسیا تھے۔ انہیں طویل سفروں اور ان دیکھے جزیروں سے واسطہ نہیں پڑا تھا ۔ اس لئے وہ ان کہانیوں اور قصوں سے محروم تھے جو رزمیہ اور ڈرامائی شاعری کے سرچشمے کہلاتے ہیں۔

فارسی مین منقبت نگاری

۲۱ھ کا سال ایرانی تاریخ مین فیصلہ کن سال شمار ھوتا ھے۔ اس سن مین نہاوند کے مقام پر ایرانیون اور عربون مین زبردست جنگ ھوئی جس مین ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم کو شکست ھوئی اور ایران عربون کے تابع ھو گیا اور دو سو سال تک عرب ایران پر حکومت کرتے رھے۔ دین اسلام کی اشاعت کی وجہ سے ایران مین عربون کا سیاسی غلبہ معنوی غلبے مین تبدیل ھوگیا اور عربون کا اثر ایرانیون کی روح تک اتر گیا۔ ان دو سو سالون مین فارسی شاعری کی سرزمین بالکل بنجر رھی۔ اس طویل عرصے مین عربی کی حکمرانی رھی۔ یہ سیاست اور مذھب کی زبان تھی۔ ایران کے شاعر اور دانشور اس کو اپنی زبان پر ترجیح دیتے رھے۔ انھون نے عربی مین شعر کھے، اسی مین خط و کتابت کی اور اس کی ترویج مین ھمہ تن مصروف رھے۔ چنانچہ کئی فارسی شعراٗ جو اپنی زبان مین زمزمہ ریزی کرتے رھے گمنامی کے گوشے مین دفن ھو گئے اور کسی نے ان کی آوازنہ سنی۔ کئی نغمہ طراز اپنے نغمون کو پہلو مین سمیٹے پیوند زمین ھو گئے اور کسی کو ان کے وجود کا احساس تک نہ ھوا۔

بنو امیہ عرب عصبیت کا بری طرح شکار تھے۔ اس لئے انھون نے غیرعرب ایرانیون سے اچھا سلوک نہ کیا۔ اس صورت حال نے ایرانیون کو اس تحریک کا حامی اور موید بنا دیا جو شعوبیہ تحریک کے نام سے بنو امیہ کے خلاف چل رھی تھی۔ اس وقت اھل بیت النبی بنو امیہ کے ھاتھون پریشان حالی کا شکار تھے۔ چنانچہ ایرانیون نے بنو امیہ سے اپنی نفرت کا اظھار حمایت اھل بیت سے کیا۔ پروفیسر براؤن کھتے ھین کہ

" علی زین العابدین کے ساتھ ان کی وابستگی کو اس خیال نے بھی مستحکم کر رکھا تھا کہ ان کی والدہ ایران کے شاھی خاندان کی شہزادی تھین "[1]۔

چنانچہ جب مختار ثقفی نے بنو امیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو ایرانیون نے اس کا ساتھ دیا اور ان سے ان کی زیادتیون کا بدلہ لیا۔

عباسیون کا دور زندگی کی تشکیل نو کا دور تھا۔ اب شاعر جنگون کی بات نھین کرتے تھے بلکہ انھون نے اپنے آپ کو درباریون مین ڈھال کر خلفاٗ کی مدح خوانی کے لئے اپنے آپ

---

[1] Literary History of Persia P. 194

کو وقف کر رکھا تھا اور ان کی شاعری ان کی زندگی کی طرح تصنع، تکلف اور مبالغے کی شاعری بن گئی تھی۔ یہ دور ایرانیوں کے لئے حیات نو کا پیغام تھا۔ اس مین ایرانی طرز معاشرت اور علوم و عقائد نے رواج پایا۔ اسی زمانے مین فارسی زبان نے دو سو سال کی گمنامی کے بعد موجودہ فارسی کی صورت اختیار کی۔ شاعرون نے اس زبان مین شعر کہے اور نثرنگارون نے فارسی نثر کا آغاز کیا۔

سامانی خاندان کے دور مین ایرانی علم و ادب کو نئی زندگی عطا ہوئی۔ سامانیون نے بخارا کو دارالحکومت بنایا جو اس وقت بڑے بڑے شاعرون، ادیبون اور دانش ورون کا مرکز تھا۔ " اس دور مین کسائی روزی پیدا ہوا جو اپنے زمانے مین دانش ورون اور شاعرون مین بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس نے حضرت علی کی مدح مین اشعار کہے،، ؎۱ وہ پہلا شاعر تھا جس نے دینی عقائد اور حکیمانہ اشعار لکھے اور اخلاقی پند و نصائح کو نظم کا لباس دیا،، لیکن منقبت نگاری کے سلسلے مین پہلا قابل ذکر شاعر فردوسی ہے۔

سید علی عباس جلالپوری لکھتے ہین

" ایرانی تمدن کے احیاء کے ساتھ ہی فارسی شاعری کا آغاز ہوا اور قصیدے کے ساتھ عربی سے جو شعری روایات فارسی شاعری مین داخل ہوئین ان مین ایک منقبت کی روایت بھی تھی جس کے اولین ترجمانون مین فردوسی طوسی ممتاز حیثیت کا مالک ہے،، ؎۲ فردوسی کی عظمت شاہ نامہ کی مرہون منت ہے۔ یہ رزمیہ مثنوی اپنے اندر بڑا تنوع رکھتی ہے۔ اس مین دلیری اور بہادری کی داستانون کے علاوہ ایران کی قدیم تاریخ اور ملی کہانیان ہین اور بادشاہون، وزیرون اور دیگر بڑی شخصیات نے بپایان عمر جو نصیحتین اپنے لواحقین کو کین ان کا شاعرانہ اظہار ہے۔ اس مثنوی کا آغاز خدا کی حمد و ثنا سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد عقل کی تعریف ہے۔ پھر آفرینش عالم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تخلیق آفتاب و ماہتاب کا تذکرہ ہے اور بعدازان حضوراکرمؐ، صحابہ کرام اور اہل بیت کی مدح ہے۔

ص۱ ترجمہ تاریخ ادبیات ایران ۔ رضا زادہ شفق ص ۵۹

ص۲ مقالات جلالپوری ص ۹۵

چہ گفت آن خداوند تنزیل و وحی — خداوند امر و خداوند نہی
کہ خورشید از رسولان مہ — بتائید بر کس ز بوبکر بہ
عمر کرد اسلام را آشکار — بیار رست گیتی چو باغ بہار
پس از ہر دوان بود عثمان گزین — خداوند شرم و خداوند دین
چہارم علی بود جفت بتول — کہ او را بخوبی ستائد رسول
کہ من شہر علم علیم درست — درست این سخن قول پیغمبراست
منم بندہ اہل بیت نبی — ستائندہ خاک پائے صفی

فردوسی نے مدح پیغمبر کے بعد صحابہ کرام کا ذکر محض برکت طلبی اور خیرجوئی کے لئے کیا ہے البتہ اہل بیت سے اسے خصوصی محبت ہے۔ اس لئے ان کا تذکرہ ذرا وضاحت کےساتھ کیاہے۔ عربی منقبت نگاری مین دو واضح رجحانات موجود تھے۔

۱۔ خلفائے راشدین کی منقبت

۲۔ اہل بیت النبی کی منقبت

بعض شاعرون کے ہان یہ دونون رجحانات اکٹھے ہو جاتے ہین اور ایک ہی نظم مین خلفائے راشدین اور اہل بیت کے اوصاف و فضائل بیان ہوئے ہین۔ فردوسی نے بھی اسی روایت کی تقلید کی۔

ڈاکٹر محمود الہی لکھتے ہین :

یون تو سب سے پہلے کسائی (روزی) مروزی نے مذہبی قصیدے لکھے لیکن ناصر خسرو [ص۱] پہلا شاعر ہے جس نے قصیدے کو ایک تحریک کی صورت مین مذہب اور عقیدے سے روشناس کرایا۔ اس کے بعد قصیدے، حمد، نعت اور اولیائے دین کی کی منقبت مین ہین جن مین اس نے فلسفیانہ طرز اختیار کیاہے ۔[ص۲]

ناصر خسرو نے پری چہرہ معشوقون اور گلرنگ شراب کی جگہ روحانی اور اخلاقی مضامین کو بھی اپنے اشعار مین سمونے کی کوشش کی۔ یہی خصوصیت اس کی شاعری کا انفرادی رنگ بن

ص۱ ناصر خسرو (م ۳۸۱ھ) عہد سلجوقیہ کے ابتدائی دور کا ایک ممتاز شاعر، نامورسیاح اور اسماعیلی مبلغ تھا۔ اس نے شاعری کو اپنے عقائد کی تبلیغ کا وسیلہ بنایا۔

ص۲ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی ۔ ص ۱۱۲

گئی۔ اس کا دیوان، فلسفہ، اخلاق، پند و موعظت، عقل و دانش اور مذہب ایسے موضوعات پر مشتمل ہے ۔ نعت و منقبت کو یکجا کرنے کا اس کا ایک اپنا رنگ ہے جس کی چمک دمک قاری کو متاثر کرتی ہے۔

قرآن بود و شمشیر پاکیزۂ حیدر
دو بنیاد دین متین محمدؐ
چو ہارون ز موسی علی بود در دین
ہم انصار و ہم ہمنشین محمدؐ
ز فرزند زہرا و حیدر گرفتم
من دین سیرت راستین محمدؐ

شاعری کا صوفیانہ انداز

سلجوقی دور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تصوف نے شاعری کو متاثر کرنا شروع کر دیا اور اس سلسلے کے شعراء نے فارسی شعر و ادب کو ایک رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔ تصوف کی وجہ تسمیہ کے متعلق محققین مختلف آرا رکھتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ صوفی لفظ صفا سے مشتق ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اکرم کے زمانے میں بعض مسلمان درویش چبوتروں پر بیٹھ کر عبادت الہی میں مصروف رہتے تھے۔ یہ لوگ اصحاب الصفہ کہلاتے تھے۔ انہیں کو لوگ صوفی کہنے لگے۔ علامہ ابو ریحان البیرونی نے اپنی کتاب الہند میں لکھا ہے کہ

" تصوف کا لفظ اصل میں تسوف تھا اور اس کا مادہ سوف تھا جس کی معنی یونانی زبان میں حکمت کے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یہ لفظ عربی زبان میں آیا۔ چونکہ صوفیاء میں اشراقی حکماء کا انداز پایا جاتا تھا اسلئے لوگوں نے انہیں سوفی کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ سوفی سے صوفی ہوگیا "۔ [ص۱]

لیکن قدیم صوفیاء اس بات پر متفق ہیں کہ لفظ صوفی کو صوف سے نسبت ہے ۔ صوف کو اون یا پشمینہ بھی کہتے ہیں۔ ابتدا میں صوفی اون کے جبے پہنتے تھے اسی وجہ سے ان

ص۱ بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ۔ خلیق نظامی ۔ ص ۱۷

کو صوفی کہا جاتا تھا۔

امام قشیری مشائخ طریقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" آنحضرت کے وجود باجود تک صحابہ کے لقب کے سوا اور کوئی لقب ایجاد نہیں ہوا تھا کیونکہ شرف صحبت سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں ہو سکتا تھا۔ صحابہ کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کا لقب پیدا ہوا۔ یہ زمانہ بھی ہو چکا تو بزرگان دین زاھد و عابد کے لقب سے ممتاز ہوئے لیکن زھد و عبادت کا دعوی ہر فرقہ کو یہاں تک کہ اھل بدعت کو بھی تھا۔ اس لئے جو لوگ خاص اھل سنت والجماعت میں سے زاھد اور اھل دل تھے وہ صوفی کہلائے۔ یہ لقب دوسری صدی ھجری کے ختم ہونے سے پہلے رواج پا چکا تھا،، ص[1]

جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ تصوف کثرت صوم و صلواۃ کا نام نہیں بلکہ تصوف سینہ کی سلامتی اور نفس کی سخاوت کا نام ہے۔ ص[2]

ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہے کہ جب کلام کرے تو اس کا کلام اس کے حال کی حقیقت کا مظہر ہو اور کوئی ایسی بات نہ کہے جو اس میں نہ ہو اور جب خاموش رہے تو اس کی خاموشی اس کے حال کی ترجمان ہو اور علائق دنیاوی سے بےتعلقی کا ثبوت اس کے اعضاء سے واضح ہو۔ ص[3]

حضرت ابوالحسن نوری فرماتے ہیں کہ تصوف ترک لذات نفسانی کا نام ہے۔ ص[4] حضرت شبلی فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جو دونوں جہان میں سوائے ذات خداوندی کے اور کچھ نہ دیکھتا ہو۔ ص[5] اور سید علی ھجویری کا فرمان ہے کہ صوفی وہ ہے جو صاف دل ہو اقسام کدورت سے ص[6]۔ حضرت ابوسعید ابوالخیر سے کسی نے سوال کیا کہ تصوف کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے جواب

ص[1] بحوالہ ادب نامہ ایران = مرزا مقبول بیگ بدخشانی ص ۴۸
ص[2] الرسائل القشیریہ = ابوالقاسم القشیری ص ۵۲
ص[3] کشف المحجوب = سید علی ھجویری ترجمہ ابوالحسنات، سید محمد احمد قادری۔ ص ۱۲۱
ص[4] ایضاً ص ۱۲۲
ص[5] ایضاً ص ۱۲۶
ص[6] ایضاً ص ۱۱۶

دیا کہ دل مین جو خواهشات هین ان کو نکال دو اور هاتھ مین جو کچھ هے دے دو۔ جو کچھ تم پر گذرے اسے اللہ کی رضا سمجھو اور حرف شکایت لب پر نہ لاؤ۔[1]

مولانا جامی لکھتے هین کہ سب سے پہلے صوفی کا لقب ابوهاشم کو ملا جو کوفہ مین پیدا هوئے اور ۷۷۸-۷۷۷ھ مین وفات پائی۔ صوفیا[2] کی طریقت کی وضاحت اور تشریح سب سے پہلے ذوالنون مصری نے کی پھر جنید بغدادی طریقت کو وسعت دے کر ضبط تحریر مین لائے۔

علامہ شبلی لکھتے هین کہ امام غزالی سے پہلے تصوف مین سب سے زیادہ جامع اور علمی پیرایہ مین جو کتاب لکھی گئی وہ امام قشیری کا رسالہ تھا تاهم اس رسالے مین صرف ورع و تقوی، صبر و شکر وغیرہ کے عنوانات قائم کئے گئے اور هر عنوان کے نیچے قرآن مجید کی آیات اور بزرگون کی حکایات لکھ دین کسی چیز کی حد اور حقیقت بیان نہین کی اور مسکاشفات اور روحانی ادراکات کا تو سرے سے ذکر هی نہین۔ امام غزالی پہلے شخص هین جنہون نے علمی طور پر اس فن کو مرتب کیا۔

علامہ ابن خلدون مقدمہ تاریخ مین لکھتے هین :

" امام غزالی نے احیاء العلوم مین دونون طریقون کو جمع کیا چنانچہ ورع اور اقتدا کے احکام لکھنے کے ساتھ ساتھ ارباب حال کے آداب اور طریقے بتائے اور ان کی اصطلاحون کی شرح کی جس کا نتیجہ یہ هوا کہ تصوف بھی ایک باقاعدہ علم بن گیا حالانکہ پہلے اس کا طریقہ صرف عبادت کرنا تھا۔[3]"

تصوف کے کئی سلسلے هین مثلاً شاذلیہ - مولویہ - اویسیہ - نقشبندیہ - چشتیہ - سہروردیہ - قادریہ وغیرہ - لیکن برصغیر مین موخرالذکر چار سلسلے هی مقبول هوئے -

سلسلہ نقشبندیہ

ابتدا مین سلسلہ خواجگان کہلاتا تھا - یہ سلسلہ ترکستان مین قائم هوا تھا - اس

ص[1] ادب نامہ ایران - مرزا مقبول بیگ بدخشانی - ص ۱۶۸
ص[2] نفحات الانس
ص[3] الغزالی ص ۱۹۳

کے ایک مشہور بزرگ خواجہ محمد اتابسوی ہین۔ ان کے بعد خواجہ عبدالخالق عجدوانی نےکچھ اصطلاحین وضع کین اور ان کو اپنے روحانی نظام کا جزو بنایا مثلاً ہوش و ردم۔ نظر بر قدم سفر در وطن ۔ خلوت در انجمن وغیرہ

خواجہ اتابسوی اور خواجہ عجدوانی نے اس سلسلے کو فروغ دینے کے لئے بڑی کاوشین کین لیکن اس کو مقبول عام بنانے کا شرف خواجہ بہاؤالدین نقش بند کے لئے مقدر ہو چکا تھا ان کے بعد یہ سلسلہ نقش بندیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

سلسلہ چشتیہ

چشت ، خراسان کا مشہور شہر ہے۔ وہان کچھ بزرگان دین نے روحانی اصلاح و تربیت کا مرکز قائم کیا۔ اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور وہ نظام اس مقام کی نسبت سے چشتیہ سلسلہ کہلانے لگا۔[ص۱] اس سلسلہ کے پہلے معروف بزرگ شیخ ابوسحاق شامی تھے لیکن اس کو پروان چڑھانے اور پھیلانے کا فریضہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے سرانجام دیا۔ برصغیر مین اس سلسلے کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس سلسلے مین سماع کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

سلسلہ قادریہ

حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی اس سلسلے کے بانی ہین۔ وہ پیران پیر غوث الاعظم جیلانی کے نام سے بھی معروف ہین۔ انہون نے روحانی اصلاح و تربیت کا نہایت اعلی نظام قائم کیا تھا اور اپنے خلفاء کو دور دور تبلیغ و اشاعت کے لئے بھیج دیا تھا۔ ان کے بعد اسلامی ممالک کے دور دراز علاقون مین اس سلسلے کی شاخین قائم ہو گئین۔

سلسلہ سہروردیہ

شیخ نجیب الدین عبدالقاہر سہروردی اس سلسلے کے بانی ہین۔[ص۲] وہ امام غزالی

ص۱ تاریخ مشائخ چشت = خلیق احمد نظامی ص ۱۳۵

کے بھائی احمد غزالی کے تربیت یافتہ تھے۔ شہاب الدین سہروردی ان کے بھتیجے تھے۔ انہون نے "عوارف المعارف"، کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس سلسلے کا حلقہ وسیع کیا۔ برصغیر مین اس سلسلے کو پھیلانے کا شرف جس بزرگ کو حاصل ہوا وہ شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی ہین۔ انہون نے ملتان کے علاوہ دیگر کئی مقامات پر خانقاہین قائم کین جن مین سے اوچ شریف کی خانقاہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ فارسی شاعری مین منقبت نگاری کے دو واضح رجحانات تھے۔ مناقب اہل بیت اور مناقب اصحاب رسول ۔ تصوف کے زیراثر صوفیانہ سلسلون کے شیوخ بھی منقبت نگاری کا موضوع بن گئے۔ چونکہ اشاعت اسلام، سلسلہ طریقت کی توسیع اور مریدان باصفا کی تربیت کی طرف ان حضرات کی توجہ مبذول رہی اور بےشمار لوگ ان کے روحانی فیوض اور ان کی بلند و ارفع تعلیمات سے بہرہ مند ہوئے اس لئے شعرا نے ان کی زندگی کے اس پہلو کو اپنی منظومات کا موضوع بنا کر انہین خراج عقیدت پیش کیا۔

حکیم سنائی (۵۴۵ھ) پہلے شخص ہین جس نے تصوف کو شاعری سے روشناس کیا علامہ شبلی کہتے ہین کہ " اس سے پہلے حضرت ابو سعیدابوالخیر کی چند رباعیان تصوف مین پائی جاتی تھین لیکن ان مین صرف جوش عشق کو پرزور طریقے سے ادا کیا گیا ہے۔ تصوف کے مسائل اسرار اور معارف نہین بخلاف اس کے حکیم سنائی کی تصنیفات تصوف کی مستقل تصانیف ہین " [ص۱] حدیقہ ان کی معروف مثنوی ہے جس مین تصوف کے اکثر مقامات مثلاً صبر، رضا، توکل، قناعت وغیرہ مستقل عنوانات رکھے گئے ہین اور ان کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حدیقہ مین حکیم سنائی نے اہلبیت کی مدح بھی لکھی ہے اور بنوامیہ کی مذمت بھی کی ہے۔

ڈاکٹر محمود الہی لکھتے ہین :

" مذہبی قصیدہ نگاری کو سنائی نے فروغ دیا [ص۲] ، انہون نے " در نعت خواجہ لولاک و اصحاب پاک " مین حضور اکرم کی جناب مین عقیدت و نیازمندی کا خراج پیش کرنے کے بعد خلفائے

ص۱ شعرالعجم ج اول ص ۱۲۷ = ص۲

ص۲ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ - ص 115

راشدین کی مدح بھی لکھی ہے۔ انہوں نے ایک قصیدہ حضرت علی کی شان میں لکھا ہے۔

ای امیرالمومنین ای شمع دین ای بوالحسن
ای بیک ضربت ربوده جان دشمن از بدن

از برائی دین حق آباد کرده شرق وغرب
کردی از نوک سنانت عالمی را پرسدن

دین جلال و دین کمال و دین جمال و منزلت
نیست کس را در جهان جز مرترا ای بوالحسن

امام علی موسی رضا کی منقبت میں فارسی کا پہلا قصیدہ بھی سنائی نے لکھا۔
قصیدے کا مطلع ہے :

دین را حرمیست در خراسان
دشوار ترا به محشر آسان

چند اور اشعار ملاحظہ کریں :

از خاتم انبیا در و تن
از سید دوصبا در و جان
مهرش سبب نجات و توفیق
کینش مدد هلاک و خذلان

سنائی نے شیخ خواجہ امام محمد بن محمد کی مدح میں ایک ترکیب بند بھی تحریر کیا ہے۔
مدح کا انداز یہ ہے :

مهتر راه شریعت اوست کاکنون چون سراج
نور او روشن همی دارد ره همام را

ای محمد خلق ـ یوسف خلقت اندر صدر تو
حسن خلقت کرد چون ما چرخ را ز احسان تو

سنائی کے یہاں منقبت نگاری کے تینوں رنگ موجود ہیں۔ مدح صحابہ، مدح اہلبیت اور مدح بزرگان دین۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی رنگ گہرا ہے اور کوئی ہلکا۔ اہلبیت کے ساتھ اس کی محبت میں والہانہ پن اور شیفتگی زیادہ نمایاں ہے۔ ان کا کلام پختہ اور برجستہ ہے۔ کہیں کہیں طرز ادا میں جدت اور اچھوتا پن بھی ہے۔

فارسی کی صوفیانہ شاعری میں جن لوگوں نے کمال حاصل کیا ان میں شیخ فریدالدین عطار (م ٦٢٧ھ) خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں لیکن منطق الطیر ان کا شاہکار ہے۔ یہ ایک تمثیلی مثنوی ہے جس میں وحدت الوجود کے مسئلے کو نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کا آغاز حمد و ثنا سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد نعت رسول مقبول ہے اور پھر خلفائے راشدین کے مناقب بیان ہوئے ہیں۔

پہلی منقبت خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کی مدح میں ہے

خواجۂ اول کہ اول یار اوست
ثانیٔ اثنین از هما فی‌الغار اوست
هر چه حق از بارگاه کبریا
ریخت در صدر اشرف مصطفیٰ
او همه در سینۂ صدیق ریخت
لاجرم تا بود از د تحقیق ریخت

دوسری منقبت خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق کے بارے میں ہے

خواجۂ شرع، آفتاب جمع دین
ظل حق، فاروق اعظم شمع دین
آنکه دارد بر صراط اول گذر
هست او از قول پیغمبر عمر
کار دین از عدل او انجام یافت
نیل جنبش زلزله آرام یافت

تیسری منقبت مین حضرت عثمان غنی کو یون خراج عقیدت پیش کیاگیا ھے

خواجهٔ سنت، که نور مطلق است
بل خداوندی دو نور برحق است
سیّد سادات گفتے بر فلک
شرم دارد دائم از عثمان ملک
جون بنود او تاکند بیعت قبول
بد بجائے دست او دست رسول

چوتھی منقبت مین حضرت علی کی شان مین لکھتے ھین

خواجه حق، پیشوائے راستین
کوه حلم و بحر علم و قطب دین
ساقئ کوثر امام رھنمائے
ابن عم مصطفٰی شیر خدائے
مرتضٰی و مجتبٰی جفت بتول
خواجهٔ معصوم و داماد رسول

شیخ عطار نے ان نظمون مین کہین بھی غلو اور مبالغے کو داخل نہین ہونے دیا۔ زبان بے تکلف، روان اور سادہ استعمال کی ھے اور کہین بھی ابہام یا پیچیدگی پیدا نہین ہونے دی۔ خلفائے راشدین کے مناقب بیان کرتے ہوئے ان کے قلم نے فرط عقیدت سے لغزش نہین کھائی اور ان کے ان اوصاف ھی کا ذکر کیا ھے جو قرآن و حدیث یا کتب سیرت مین مذکور ھین ۔ پختگی ، برجستگی اور صفائی مین ان کا کلام امتیازی حیثیت رکھتا ھے۔

مولانا روم (م ٦٧٢ ھ) کی پہچان ان کی مثنوی ھے جس مین انہون نے رموز معرفت کو کہانی کے انداز مین بیان کیا ھے۔ یہان خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کی مدح بھی

موجود ہے۔ دیوان شمس تبریز میں انہوں نے اہل بیت کی تعریف میں بھی اشعار لکھے ہیں۔

جز کتاب اللہ و عزت ز احمد مرسل نماند
یادگار کان توان تا روز محشر داشتن

در شریعت در مدینہ علم
درحقیقت امیر ہر دو سرا

لیکن منقبت نگاری کی تاریخ میں ان کی غزلیات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے پیر و مرشد خواجہ شمس الدین تبریز کی مدح بھی لکھی ہے۔ بعض غزلوں میں تو انہوں نے شمس الدین کی ردیف بھی استعمال کی ہے۔ ان کی اکثر غزلیں ان ہی کے نام پر ختم ہوتی ہیں - ایک غزل کے چند اشعار دیکھئے :

شمس تبریزی کہ نور مطلقست
آفتابست وز انوار حق است
این نفس جان دامنم برتافتست
بوی پیراہان یوسف یافتست
کز برائی حق صحبت سالہا
باز گو رمزی از آن خوش حالہا
من چہ گویم یک رگم ہشیار نیست
شرح آن یاری کہ آ درا یار نیست

شعراؑ نے عام طور پر منقبت نگاری کے لئے قصیدہ یا مثنوی کی ہیئت استعمال کی ہے۔ مثنوی مولانا روم فارسی زبان کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ وہ روایتی انداز میں یا ذرا تفصیل کے ساتھ یہاں اپنے شیخ کی مدح لکھ سکتے تھے اور انہوں نے کئی جگہ ان کا ذکر کیا بھی ہے

لیکن انہون نے مدح شیخ کا حق ادا کرنے کے لئے غـزل کا میدان منتخب کیا۔ عشق کی حرارت ، جذبات کی گہرائی اور گیرائی کے اظہار کے لئے غزل سے بہتر اور کوئی وسیلہ نہین ہے۔ لہـذا مولانا نے اپنے لئے ایسی ہیئت کا انتخاب کیا ہے جو ان کے احساسات کی شدت اور جذبات کے سوز و گـداز کے لئے سب سے مؤثر وسیلۂ اظہار ہو سکتی تھی۔ انہون نے اپنے پیر و مرشد کـی دینی خدمات، رسول کی اتباع، احکام دین کی پابندی وغیرہ کا ذکر نہین کیا کـیونکـہ وہ ایـک مجذوب پیر تھے لیکن اپنے بیان مین غیر معمولی اثر اور اپنی ذات مین ایک زبردست کشش رکھتےتھے۔ مولانا روم اسی مقناطیسی قوت کے اسیر تھے اور ان کے اشعار پر شیفتگی کی قوس قـزح محیط نظـر آتی ہے ۔

شیـخ سعـدی (م ۶۹۱ ھ) کثیرالجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ شاعر تھے۔ صوفی تھے ۔ فقیہہ تھے ۔ واعظ تھـے ۔ حسن پرستی اور رندی ان کے مزاج کا حصہ تھی ۔ تصوف کی تعلیم انہون نے شیخ شہاب الدین سہروردی سے حاصل کی اور انہین کے فیض صحبت سے شیخ نے تزکیۂ نفس کے مراحل طے کئے۔ شیخ کے والد مذہب کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے تھے ۔ اس لئے مذہبی میـلان طبـع انہین ورثے مین ملا تھا۔ نعتیہ اشعار کی طرح ان کے منقبتی اشعار بھی سادگی اور خلوص کے جوہر رکھتے ہین۔ اسی لئے ان مین اثر بھی ہے اور سوز بھی۔ ان کی گلستان اور بوسـتان کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کا سبب بھی دلنشـین پیرایـہ بـیان ہے۔ ان کے یہ اشعـار زبان زد خاص و عـام ہین۔

خـدایا بحـق بنی فاطمـہ   کہ بر قولم ایمان کنی خاتـمہ
اگر دعوتـم ردکنـی درقبول   من و دست و دامان آل رسول

ان کے قصائد مین خلفائے راشـدین کی مدح یون کی گئی ہے

اے یار غـار سیّد و صـدیق نامـور   مجموعـہ فضـائـل و گنجینـۂ صـفا
دیگر عمـر کہ لائـق پیغمبری بـدی   گـر خواجۂ رسل نہ بدیختم انبـیاؑ
دیگر جمال سیرت عثمان کہ بر نکرد   درپیش روی دشمن قاتـل سـر از حیا
کس را چہ زور و زہرا کہ وصف علیکند   جبار در مناقب او گفتـہ ھـل اتـٰی

اهل بیت اور خلفائے راشدین کی مدح لکھتے ہوئے انہون نے خیال آرائی اور مضمون آفرینی سے کام نہین لیا بلکہ قرآن اور حدیث کی روشنی مین مدح کا راستہ متعین کیا ہے۔ وہ علم دین پر مکمل عبور رکھتے تھے اسلئے حفظ مراتب سے اچھی طرح آگاہ تھے۔

عراقی (م ۶۸۸ ھ) : عراق کے رہنے والے تھے اسی لئے عراقی تخلص کیا۔ ایک قافلے کے ساتھ برصغیر آئے۔ یہان شیخ الاسلام بہاؤالدین زکریا علم و عرفان کی محفلین آراستہ کئے ہوئے تھے جن کی ضیاباریون نے ایک عالم کو منور کر رکھا تھا۔ عراقی ان کی خدمت مین حاضر ہوئے اور کچھ عرصہ ان کی صحبتون سے فیض یاب ہوتے رہے۔ شیخ نے بڑی شفقت فرمائی اور انہین خرقہ خلافت عطا فرمایا۔ عراقی ، فارسی زبان کے ممتاز شعرا٫ مین سے ہین۔ ان کا کلام سادہ اور روان ہے۔ انہون نے جذبات عشق و محبت کو بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ جذب و کیف کی جو حرارت عراقی کے یہان ہے وہ بہت کم شاعرون کو نصیب ہوئی ہے۔ انہون نے جو قصائد شیخ الاسلام خواجہ بہاؤالدین زکریا کی مدح مین لکھے ہین ان مین عراقی کی فنی چابکدستی کے علاوہ شیخ سے ان کی گہری وابستگی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

شیخ شیوخ جہان قطب زمین و زمان — غوث همه انس و جان مالک رقاب

ناشر علم الیقین ، کاشف عین الیقین — واصی حق الیقین مہدی هادی خطاب

پرسی اگر از جہان کیست امام زمان؟ — نشنوی از آسمان جز زکریا جواب

سالک مجذوب را بر در او بازگشت — طالب مطلوب را از در او فتح یاب

روشندلان آئینہ دل چو صفا بینند — روئے دلداردران آئینہ پیدا بینند

خاص حق صاحب قدوس بہاء الاسلام — غوث حق رحمت عالم زکریا بینند

خاک پایش بتبرک همه در دیده کشند — تا مگر از مددش نور تجلّی بینند

قطب وقت اوست همه عالم ازو آسوده — بردرش زمرۂ ابدال تو لا بینند

۱

شیخ ربّانی بہاء الحق والدین آنکہ ما　بوسہ برخاک درش چون قدسیان ہردم زنیم
پائے چون روح القدس بردیدۂ سدرہ نہیم　آتش از سوز دل درینگہ آدم زنیم
خرمن ہستی بباد بے نیازی بسپرد ہیم　دست درفتراک صاحب ہمت اعظم نہیم
خاک رو بیم از سرکویش بجا روب وفا　در بماند گرد کے از دیدہ آنرادم زنیم

حضرت بہاء الدین زکریا کے فیوض و برکات سے سارا ملک مطلع انوار بنا ہوا تھا ۔ آپ کے عہد کو خیر الاعصار کہا جاتا ہے[۱] آپ علوم ظاہری کے عالم اور مکاشفات و مشاہدات کے مقامات و احوال مین کامل تھے۔ ان کے علمی فیضان اور روحانی کمالات کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم عراقی کے اشعار پڑھتے ہین تو ہمین محسوس ہوتا ہے کہ عقیدت کی انتہائی بلندیون پر پرواز کرنے کے باوجود انہون نے برجا مبالغہ آرائی کو شعار نہین بنایا اور وہی کچھ لکھا جو انہون نے محسوس کیا یا مشاہدہ کیا۔

جامی (م ۸۹۸ھ) : خراسان کے علاقہ جام مین پیدا ہوئے اس لئے جامی کہلائے۔ ہرات کے مدرسہ نظامیہ سے علوم دینی کی تعلیم حاصل کی۔ ایک بزرگ سعدالدین تفتازانی خواجہ بہاؤالدین نقش بندیہ کے خلیفہ تھے۔ ان کی بدولت سلسلہ نقش بندیہ مین شامل ہوئے۔ جامی ممتاز عالم دین اور قادرالکلام شاعر تھے۔ نعت گوئی ان کا میدان خاص ہے۔ ان کا نعتیہ کلام اس اخلاص اورشیفتگی کا آئینہ دار ہے جو انہین سیّد دو عالم کی ذات اقدس سے ہے۔ کیف و مستی اور جذب و شوق ان کے کلام کا امتیازی وصف ہے۔ انہون نے حضرت علی کی شان مین شعر کہے ہین :

تاکہ زباب تو نازل شد علی بابہا
در گیت و رباب دین باب معظم آمدہ

نوح را صدا شکورا گفت در اسرلی ولے
سعیکم مشکور آمد مرترا در ھل اتلٰی

---

[۱] تذکرہ حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی ۔　　ص ۷۵

لیکن انہوں نے اپنے شعروں میں خاص طور پر خواجہ بہاؤالدین نقش بند کے ساتھ دلی عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے ایک ۳۰ اشعار کی نظم " در منقبت قطب الطریق غوث الخلائق خواجہ بہاؤالملت والدین محمد بخاری المعروف نقش بند قدس اللہ تعالی سرہ العزیز "، لکھی ہے جس کا آغاز یوں ہوتا ہے

در خم این دائرہ نقش بند　　چند شوی بند بہر نقش بند

مدح کا انداز یہ ہے

قطب دین نقطۂ توحید او　　خلقت دین خرقۂ تجرید او

اول او، آخر هر منتہی　　آخر او حبیب تمنا ، تہی

صورت او، راست بمیزان شرع　　جان دراز زندگی از جان شرع

حق طلبان را بنظرهائے خاص　　دادہ ز اندیشۂ باطل خلاص

دو اور مثنویاں

یوسف زلیخا اور لیلی مجنوں قابل ذکر ہیں۔ ان میں بھی جامی نے مثنوی‌نگاری کی روایت کو نبھایا ہے اور نعت رسول مقبول کے بعد پیرطریقت خواجہ عبیداللہ نقش بند کی منقبت لکھی ہے۔ جامی کے ہاں تکلف اور تصنع نام کو نہیں ۔ ان کا اسلوب سادہ، رواں اور شیریں ہے اور جو شخص فارسی سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

محتشم کاشانی (م ۹۹۶ھ) : صفوی دور کا مشہور شاعر تھا۔ ابتدا میں عشقیہ شعر کہتا تھا۔ اس نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدے بھی لکھے۔ لیکن صفوی خاندان کے دینی رجحانات کو دیکھ کر ایسے اشعار لکھے جن میں اہل بیت کی تعریف اور ان کے مصائب کا تذکرہ ہوتا تھا۔ شاعری کے اس انداز نے بہت جلد ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور اسے اپنے وقت کا سب سے بڑا مرثیہ گو تسلیم کر لیا گیا۔ آج اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی شہرت اور عظمت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ اسے فارسی شاعری میں وہی مقام و مرتبہ حاصل ہے جو اردو میں میر انیس کا ہے

ص۱ مثنوی تحفۃ الاحرار　　ص ۳۵

اس کی زبان سلیس، روان اور بے ساختہ ہے اور لفظی صنائع بدائع سے پاک ہے۔ اس کا ہر مصرعہ خلوص و صداقت کا آئینہ دار ہے۔

حضرت علی کی مدح مین چند اشعار دیکھیئے۔

صورت معنی فطرت باعث ایجاد خلق	بہترین نسل آدم نفس خیرالمرسلین
آنکہ مداحش خدا ہمدم رسول اللہ بود	گر کسے لیمتاش باشد ہم رسول اللہ بود
باخدا و مصطفی رائوتو یک رو داشتہ	از خدا و مصطفی شمشیر دختر یافتہ
بندۂ بیچارہ کاشی ازدل وجان سال و ماہ	روز و شب درخطۂ آمل ثناخوان شمااست

قاآنی (م ۱۲۷۲ھ) : شجاع السلطنت فتح علی شاہ قاچار اور ناصرالدین کے مصاحبون مین شامل تھے۔ اس لئے ان کی شاعری درباری شاعری ہے جس مین سلاطین و امراٗ کی مدح مین لکھے ہوئے قصیدے خاص طور پر نمایان ہین۔ لیکن ایک مدحیہ قصیدہ امام ہشتم کی شان مین جس کا مطلع ہے :

بگردون تیرہ ، ابرے بامداران برشد از دریا
جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

۸۵ شعرون کا یہ قصیدہ قاآنی کی طباعی اور سخن وری کا کمال ہے۔ سید امداد امام اثر اس قصیدے کے بارے مین لکھتے ہین -

" اس قصیدے کے اشعار تشبیب شوکت لفظی و معنوی ایسے رکھتے ہین کہ کمتر کسی قصیدے کے اشعار تشبیب اس صفت خاص سے متصف دیکھے گئے ہین۔ فصاحت کا قائدہ نظر آتا ہے - فصاحت کے ساتھ بلاغت کی آمیزش شاعری کی ممتاز صورت دکھا رہی ہے - رنگینی الفاظ کا یہ عالم ہے کہ میناکاری کا حکم رکھتی ہے۔ جو لفظ جہان پر ہے وہ ایک جڑاؤ جوہر ہے۔ ان سب ندرتون کے ساتھ عالی خیالی ، بلند پروازی ، نفاست، پاگیزگی ، تمکنت اس درجہ ہے کہ جس کی اعلیٰ درجے کی شاعری متقاضی ہے۔ ان محاسن کے علاوہ یہ اشعار نیچرل خوبیون سے مملو ہین " ؎۱

؎۱ کاشف الحقائق جلد دوم ص ۲۲۳

حافظ شیرازی (م ۷۹۳ھ) : نے قصیدے اور مثنویان بھی لکھی ھین۔ ان کے زمانے مین شیراز کے جو جو حکمران گزرے ھین ان سب کی مدح مین انھون نے قصیدے لکھے ھین۔ سلطان محمود کی مدح مثنوی مین لکھی ھے لیکن ان کے اصل جوھر غزل مین کھلتے ھین۔ روانی، برجستگی اور صفائی کے علاوہ جوش بیان ان کی غزل گوئی کی صفت خاص ھے۔ انھون نے عام اور پامال مضامین کو بھی چھوا تو اسے حسن اسلوب اور جدت ادا سے دلآویز اور لطیف بنا دیا۔ حافظ بزرگان دین سے بھی تعلق خاطر رکھتے تھے۔ اس سلسلے مین ایک واقعہ ان کے اکثر تذکرہ نگارون نے بیان کیا ھے۔

حافظ کے زمانے مین شعر و سخن کے چرچے عام تھے۔ چنانچہ انھون نے بھی شاعری شروع کی لیکن طبیعت موزون نہ تھی۔ بے تکے شعر کہتے اور لوگون کو تفریح طبع کا سامان ھاتھ آتا رفتہ رفتہ ان کی لغوگوئی کی شہرت تمام شہر مین پھیل گئی۔ لوگ تفریح کے لئے ان کو صحبتون مین بلاتے اور لطف اٹھاتے۔ دو سال تک یہی حالت رھی۔ لوگون کا استہزاد حد سے بڑھا تو ان کو بھی احساس ھوا۔ ایک دن نہایت رنجیدہ ھوئے اور بابا کوھی کے مزار پر جا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ رات کو خواب مین دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو لقمہ کھلاتے ھین اور کہتے ھین کہ جا اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے۔ نام دریافت کیا تو معلوم ھوا کہ امیر علیہ السلام ھین۔" ص۱

حافظ بنیادی طور پر رندی و سرمستی کے شاعر ھین لیکن ان کے دیوان مین ایک منقبتی غزل بھی موجود ھے جس مین حضرت علی اور امام ھشتم حضرت موسی رضا کی مدح کی گئی ھے اور ان سے والہانہ محبت کا اظہار کیا گیا ھے۔

مطلع ھے : اے دل غلام شاہ جہان باش و شاہ باش
پیوستہ در حمایت لطف الٰہ باش

دو اور شعر اس طرح ھین :

امروز زندہ ام بولائے تو یاعلی
فردا بروح پاک امامان گواہ باش
قبر امام ھشتم سلطان دین رضا
از جان بہ بوس و بر در آن بارگاہ باش

ص۱ شعرالعجم شبلی جلد دوم ص ۱۶۱

امام موسیٰ رضا کی منقبت مین پندرہ بندون کی ایک مسدس بھی لکھی ھے۔

جد تو سلطان کونین ســت یعنی مصطفیٰ جدهٔ تو فاطمہ ام امام مجتبــــیٰ

جد دیگر حیدر صفدر علــی مــــرتضــی هم غریب و هم شهیدی چون حسین کربلا

درمحبت هر زمــان گــوئیــم و باشد ورد ما

کا الســلام اے حضرت شاه خراسان الســلام

حافظ نے حضرت علی کی شان مین ایک زوردار قصیدہ بھی لکھا ھے جس کا مطلــع ھے ۔

مقــدریکــه ز آثــار صنـع کرد اظهــار

بهــر و مهر و مه و سال و ماه و لیل ونهار

اس کے چند اشعار یہ ھین۔

عــلی امام و عــلی ایمــن و عــلی ایمــان

عــلی امین و عــلی سرور و عــلی ســردار

عــلی علیم و عــلی عــالم و عــلی اعـــلم

عــلی حکیم و عــلی حاکم و عــلی گفـــتار

عــلی نصیر و عــلی ناصر و عــلی منصـــور

عــلی مظفر و غالب عــلی ســـــر و ســردار

آخــری تین شعر یہ ھین ۔

بــدشمـــنان نیشــین حافظــا تو لا کـــــن

نجات خویش طلب کن بجان هشت و چــار

[illegible]

[illegible]

متابعت بمنافق چو میکنـــی بگـــــــذر

زیاده گفتـــن نا مـــش هـــزار استغــفا ر

حافظ کے فن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مختصر سے الفاظ میں گہرے مطالب اور لطیف معانی ادا کئے ہیں۔ شیرینی، سادگی اور ایجاز اس کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان کی منقبت نگاری میں تولا کے ساتھ تبرا کا رنگ بھی نمایاں ہوا ہے جس نے اردو شاعری میں بھی اپنی چمک دمک دکھائی ہے۔ انہوں نے جہاں اہل بیت کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کیا ہے وہاں ان کے مخالفوں پر دشنام کے تیر بھی برسائے ہیں۔

برصغیر کے معروف فارسی گو شعراء

امیر خسرو (م ۷۲۵ھ) : خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید باصفا تھے اور انہیں سے انہوں نے سلوک، طریقت اور درویشی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ ازلی تھا۔ وہ سرتاپا عشق تھے اور یہ بجلی ان کی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی۔ خواجہ نظام الدین اولیاء سے بیعت کے بعد جو کچھ نقد و اسباب تھا سب لٹا دیا اور ہر وقت خواجہ صاحب کے ساتھ رہنے لگے۔ خواجہ صاحب بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا نظام الدین کیا لائے ہو تو خسرو کو پیش کروں گا۔ ص[1]

امیر خسرو کو ہندوستان میں فارسی کا سب سے بڑا شاعر کہا جاتا ہے۔ بلندی فکر اور جودت طبع ان کا خاص وصف ہے۔ ان کے قصائد کا ذکر کرتے ہوئے شبلی نعمانی لکھتے ہیں

" اہل سخن کے نزدیک شاعر کی جودت طبع کا اندازہ گریز سے لگایا جاتا ہے اس معیار کے لحاظ سے امیر خسرو اپنے تمام معاصرین سے ممتاز نظر آتے ہیں۔" ص[2]

ان کی غزلوں میں سوز و گداز کے علاوہ جدت تشبیہات، مضمون آفرینی اور موسیقیت پائی جاتی ہے اور " ان کی مثنویوں کا جواب تو ایران میں بھی نہ آیا "۔ ص[3]

امیر خسرو کا دیوان جس میں بیشتر قصیدے سلاطین دہلی کے نام ہیں پانچ حصوں

ص[1] العجم جلد دوم ص ۹۸
ص[2] شعرالعجم ج دوم ص ۱۲۷
ص[3] نقد و نظر = حامد حسن قادری ص ۱۶۸

مین منقسم ھے۔ اس کے تین حصون یعنی تحفۃ الصغر، وسط الحیوۃ اور غرۃ الکمال مین خواجہ نظام الدین اولیاء کے مدحیہ قصائد موجود ھین ۔

انھون نے اپنی مثنویون مین بھی مدح شیخ کا حق ادا کیا ھے ۔

مثنوی مطلع الانوار کے چند شعر ملاحظہ کیجئے

شیخ امم، قطب حقیقت نظام　　خضر و مسیح از دم یحیی العظام

آن بولدیت شدہ سلطان پناہ　　دوختہ از ترک دو عالم کلاہ

مفتخر از ولے بغلامی منم　　خواجہ نظام ست و نظامی منم

امیر خسرو کو اھل بیت ، خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرام سے بھی محبت و عقیدت ھے - اس کا اظہار انھون نے مختلف اشعار مین کیاھے ۔

یکی یگانہ ابو بکر ثانی‌اثنین　　کہ بودہ است بہ راہ خدامی جان افشان

دوم عمر کہ زبھر نفاذ فرمائش　　بر آب نیل رود بھر کو ر می شیطان

سوم چراغ دو شمع آفتاب ذوالنورین　　بر آسمان کرم ابر با حیا عثمان

چھار مین علی‌آن شہسوار دین‌کہبرد　　حسام سرفگنش گو می نصرت از میدان

دگر حسین و حسن و حسن نوردیدۂ زھرا　　کہ واجب است‌براحسان ھردو استحسان

صحابہ ھر ھمہ خاص‌اند ، خاصہ‌معشرعشر　　ھمہ مبشر رحمت شدہ بہ سیر خبان

عرفی (م۹۹۹ھ) : صفوی دور کا اھم شاعر تھا۔ اس نے جب شعر کہنے شروع کئے اس وقت شاعری کے میدان مین محتشم کاشی ، وحشی یزدی اور غیرتی کے نام گونج رھے تھے۔ اس کے باوجود عرفی نے اپنی ذھانت اور فنی مہارت کے سبب نام پیدا کیا ۔ یہ وہ دور تھا جب پاک و ھند مین شاعری کے بڑے چرچے تھے۔ بادشاھون اور امراؑ کی فیاضیون کی گونج دور دور تک سنائی دے رھی تھی۔ عرفی نے جب یہ سنا تو برصغیر کا رخ کیا اور یہان دربار شاھی کے ساتھ وابستہ ھو گیا۔ اس کی شاعرانہ صلاحیتون نے یہین نشوونما پائی۔ اس نے قصیدے، غزلین اور قطعے لکھے ھین۔ اس کے مشہور قصیدون مین سے ایک قصیدہ وہ ھے جو حضرت علی کی شان مین لکھا گیا ھے اور جس مین

۱۸۳ شعر ھین۔ عرفی کا یہ قصیدہ اس کے کمال فن کا آئینہ دار ھے۔ اس مین وہ مضمون آفرینی نازک خیالی ، جدت تشبیہ ، ندرت استعاب، طرفگی طرز ادا تمام شعری وسائل کو بروئےکار لایا ھے اس کا مطلع یہ ھے:

جہان بگشتم و دردا کہ ھیچ شہر و دیار
ندیدہ ام کہ فروشند بخت در بازار

چند مدحیہ اشعار دیکھیئے ۔

غبار صحن سرائے تو تاج ھفت اورنگ
شکنج زلف سخائے تو موج دریا بار
اگر نہ قہر تو یاد آرد آسمان شاید
کہ خطہ منطقہ رش برمیان شود زنار
محیط بر کف جود تو کرد موج فدا
سپہر بر سر جاہ تو کرد اوج نثار

حسن تشبیہہ و خوبی استعارہ کے علاوہ مترنم تراکیب کا استعمال بھی قصائد عرفی کی اھم خصوصیت ھے ۔ سبک ہندی کی ایک نمایان خوبی خیال بندی ھے۔ شاعر ایک خیال سے کچھ اس طرح نکتہ آفرینیان کرتا جاتا ھے کہ اشعار فکر کا ایک خوبصورت تار بن جاتے ھین۔ عرفی کو اس فن مین کمال حاصل ھے۔ ۱۸۳ اشعار کا مندرجہ بالا قصیدہ ظاھر کرتا ھے کہ اس نے محض رسمی قصیدہ نہین لکھا بلکہ اسے اپنے ممدوح کے ساتھ دلی محبت ھے اور اس کے ساتھ شاعری مین وہ اپنا ایک مخصوص رنگ و آھنگ رکھتا ھے ۔

غنیمت کنجاھی[۱] : خاک برصغیر پاک و ھند سے جنم لینے والے فارسی شعرا مین غنیمت کنجاھی کا نام بڑی اھمیت کا حامل ھے۔ وہ ایک بزرگ سید صالح محمد کے مرید تھے جو غوث الاعظم جیلانی

---

[۱] ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخین معلوم نہین ہو سکین۔ اتنا معلوم ھے کہ ان کا دور اورنگ زیب کا دور تھا ۔

کی اولاد مین سے تھے اور خود بھی صاحب کمال تھے۔ ان کے فیض صحبت تھے۔ غنیمت کی شخصیت مین بڑی تبدیلی رونما ہوئی اور ان کی شاعری کے رگ و ریشے مین تصوف سرایت کر گیا۔ عقیدے کے لحاظ سے وہ سنی المذھب تھے اور تصوف کے قادری سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت غوث الاعظم کے ساتھ ان کی وابستگی عشق بلکہ جنون کی حد تک بڑھی ہوئی تھی چنانچہ ان کے سامنے جب غوث الاعظم کا نام لیا جاتا تو فوراً سجدے مین گر جاتے۔ ادھون نے غوث الاعظم کی شان مین بڑے زور دار قصیدے لکھے ھین۔

ایک قصیدے کا مطلع ھے :

آہ زین طائفہ می لان محبت پـــزبـان
جملہ یک گـرہ می بوسہ بشـوق لـب نـان

مدحـیہ اشعار ملاحظہ ہون

میـز دنـدی رہ دین گر تشـدی رهبـر مـن
قبلۂ پاک دلان ، کعبـۂ و مقصـود جهـان
غوث اعظم ، شـہ شاهان زمان محـی الدیـن
قطب اقطاب جهان مظهر فیض یـــز دان
آنکـہ از شمع سر تـربـت او حاصـل شـد
قـدسیان را بفلک نو چـراغ ایـــما ن

ایک اور قصیدے کے چند اشعار دیکھیئے

مـن و خـاک جـناب قبلـہ می جان شـاہ گیلانـی
کـہ می بازد بنامـش اسـم اعظم عشـق پنهـانـی
خـیالـش هر کہ را عـرض تجلی کـرد دو خـاطـر
بـر رنگ مـردمـک گـروید داغ سینـہ نـورانـی
بود دربارگاهـش بنـــدگان شـ... پـــرور را
شکست شیشہ می دلهـــا صـ... کوس سلطانی

خلوص اور جذبے کی سچائی غنیمت کے کلام کی اہم خوبی ہے۔ انہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا وہ سادہ سلیس اور رواں انداز میں کہا۔ ان کا ادبی اثاثہ فارسی ادب کے قابل قدر ذخیرے میں شمار ہوتا ہے۔

عبدالقادر بیدل (۱۰۵۲ھ تا ۱۱۳۳ھ) : بیدل کا تعلق شاعری کے اس دبستان سے ہے جو سبک ہندی کے نام سے موسوم ہے۔ ان کے زمانے میں یہ اسلوب شاعری ارتقا کی منزلیں طے کرکے اپنے منتہائے کمال کو پہنچ چکا تھا۔ ان کی باریک بین اور نکتہ سنج طبیعت کو یہ انداز بہت پسند آیا اور اس میں ان کے جوہر خوب کھلے۔ بیدل کا تعلق ایک صوفی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد شیخ عبدالقادر جیلانی سے گہری عقیدت رکھتے تھے اسی لئے انہوں نے اپنے بیٹے کا نام انہیں کے نام پر عبدالقادر رکھا۔ چنانچہ تصوف سے وابستگی انہیں ورثے میں ملی تھی۔ انہوں نے خواب میں سرور کائنات اور حضرت علی کو دیکھا تو ان کے ساتھ تعلق خاطر اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔

بیدل نے بہت سی اصناف سخن قصیدہ، غزل، مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، رباعیات میں طبع آزمائی کی ہے اور لطف یہ ہے کہ ہر صنف میں ان کی انفرادیت اور امتیازی شان نمایاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے فکر و زبان کو شاہان روزگار کی مدح و ستائش سے آلودہ نہیں کیا۔ جس طرح ان کی زندگی کا انداز قلندرانہ اور بے نیازانہ تھا وہی شان استغنا ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے بیشتر قصائد حمد باری تعالی، نعت رسالت مآب اور منقبت حضرت علی میں ہیں ان کا مدحیہ قصیدہ حضرت علی کی شان میں ہے۔ یہ انوری کے جواب میں لکھا گیا ہے اور عرفان و حکمت کی گوہر ریزی کے باعث انوری کے قصیدے سے کسی صورت بھی کم نہیں ہے۔ شینیہ قصیدہ بھی آپ کے مناقب میں ہے۔ اس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ۔

کدا میں شیر یزدان ـ مرتضی آن صفدر غالب

کہ می خوانند ردان حقیقت شاہ مردانش

دو طاق منظر رحمت ـ خم محراب ابرویش

دو مصراع در علم نبی لب ہائے خندانش

چو ذات حق بچندین دستگاہ عالم اسما

بخود گنجیدہ چندا نے کہ نتوان یافت پایانش

مرزا غالب (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء) : فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے مایۂ ناز شاعر ہیں۔ وہ اردو کے مقابلے میں فارسی شعرگوئی کو باعث افتخار تصور کرتے تھے۔ ایک قطعے میں وہ ذوق کو اس طرح خطاب کرتے ہیں ۔

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

تمام ممتاز اور نامور شعراء میں خاص خاص مضامین کے ساتھ مناسبت دیکھی گئی ہے۔ مرزا بھی اس کلیہ سے مستثنے نہ تھے۔ تصوف ، حب اہل بیت ، احساس تفاخر ، شوخی ، ظرافت ، عشق و محبت ، کسی میدان میں بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ جدت طرز ادا ، ندرت تشبیہہ و استعارہ ، ایجاز واختصار رمزیت اور پہلوداری کے علاوہ نکتہ آفرینی اور تخیل کی بلند پروازی ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں ۔ غالب نے حمد میں ایک قصیدہ اور نعت میں صرف دو قصیدے لکھے ہیں۔ البتہ حضرت علی کی منقبت میں پانچ قصیدے کہے ہیں اور جو قصیدہ نعت اور منقبت دونوں پر مشتمل ہے وہ غالب کی اس محبت و عقیدت پر دلالت کرتا ہے جو انہیں حضرت علی سے ہے اور جن کے اوصاف سرور دوعالم کے اوصاف جیسے ہیں۔ مجموعی طور پر فارسی کے چونسٹھ قصیدوں میں سے بارہ قصیدے حمد و نعت کے علاوہ حضرت علی ، حضرت امام حسین ، حضرت عباس علم دار اور بارھویں امام مہدی سے متعلق ہیں ۔

حضرت علی سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے نصیریوں کے ہم خیال ہو جاتے ہیں ۔

یا رب ز یا علی نہ شناستم قلندرم

یک مے بہ آبگینہ و ساغر بسر آورم

در دل بہ جستجو ہمہ ایزد درآورم

وزلب بہ گفتگو ہمہ حیدر بر آورم

نصیریوں کی ہم خیالی ایک اور قصیدے میں بھی ہے۔

نفس نبی ، خدائے نصیری ، امام خلق

آن منت عظیم کہ حق بر جہان نہاد

پروردگار ناطقۂ عارفان علی

کز حسن حق بکام زبان داستان نہاد

فارسی قصائد مین ایک قصیدہ جو امام حسین کی منقبت مین هے وہ اپنا جواب آپ هے۔ وہ اس طرح شروع هوتا هے ۔

ابر اشکبار و ما خجل از نا گریستن
دارد تفاوت آب شدن تا گریستن

مدح کے چند شعر دیکھئے

اے آنکه در حرم حجر الاسود از غمت
دارد بخود نهان چو سویدا گریستن
سیمائے ماتم تو ستائم که زین شرف
شد روشناس دیدۂ چشمو را گریستن
فیوان به آبیاری گلشن نمی رود
درمانده در گریستن و وا گریستن

تنقیدی جائزہ

انسان کا طرز زندگی اس کی سوچ اور فکر کو متاثر کرتا هے جس دور مین فارسی کا آغاز هوا اس مین زندگی تکلفات سے مبرا تھی۔ اس لئے اس دور مین شاعرون نے سادہ، بےتکلف اور صاف الفاظ مین اپنے جذبات کا اظہار کیا هے۔ انهون نے غیرمانوس تشبیهین اور ناقابل فهم استعارے استعمال نهین کئے اور جس مضمون کو چاها کسی ایچ پیچ کے بغیر سادگی کے ساتھ بیان کیا۔ یهی سادگی اور بےتکلفی فارسی شاعری کے دور اول کی سب سے بڑی خوبی هے۔ فردوسی، ناصر خسرو اور حکیم سنائی اسی دور سے تعلق رکھتے هین۔ ایرانیون کو اپنی تاریخ اور تهذیب و تمدن پر همیشه فخر رها هے چنانچه فردوسی نے اهنی شهرۂ آفاق مثنوی شاهنامه لکھ کر قدیم ایرانیون کو زندہ جاوید کر دیا۔ مثنوی ایرانیون کی ایجاد هے اور انهون نے هی اس کی روایات کو مضبوط بنیاد فراهم کی۔ مسلمانون مین یه احساس بڑی شدت سے پایا جاتا هے که جس کام کا آغاز خدا، رسول اور بزرگان دین کے نام سے هو اس مین رحمتون اور برکتون کا نزول هوتا هے۔ چنانچه مثنوی کا آغاز حمد باری

نعت رسول مقبول ، ذکر صحابہ و اھل بیت سے ھونے لگا۔ مثنوی جیسی نئی صنف سخن کے لئے حمد نعت اور منقبت کی یہ ترتیب شعرگوئی کا ایک نیا انداز ثابت ھوئی اور بعد مین آنے والے مثنوی گو شاعرون نے اسے اپنے لئے ایک روشن مثال تصور کیا اور اس کی پیروی کی۔

ناصر خسرو نے شاعری کو اپنے مسلک کی تبلیغ و ترویج کے لئے استعمال کیا۔ ان کے قصائد کا موضوع دینی ھے۔ ان کے نزدیک حقیقت کی دریافت کے لئے روشن ترین راستہ علم کا راستہ ھے اسی لئے انہون نے کئی قصیدون مین دانش و بینش کی فضیلت بیان کی ھے۔ ناصر خسرو نے اھل بیت کی تعریف مین بہت شعر لکھے ھین۔ لیکن ایک حدیث کے مطابق حضرت علی شہر علم کا دروازہ ھین اس لئے دیگر وجوھات کے علاوہ اس وجہ سے بھی ناصر خسرو نے ان کی منقبت مین شعر کہے ھین۔ دولت کی ریل پیل اور آسودہ خاطری کے سبب معاشرتی انحطاط اور اخلاقی برائیان پھیل رھی تھین اس لئے پند و نصائح اور اخلاقیات کی تعلیم شاعری کا موضوع ٹھہری ۔

فارسی شاعری کا دوسرا دور ساتوین صدی ھجری سے نوین صدی ھجری تک محیط ھے۔ یہ وہ زمانہ ھے جس کا دامن تاتاریون کی یلغار اور بربریت سے خونچکان ھے۔ اس ظاھری شکست و ریخت کے باوجود فارسی شاعری کا یہ دور رخشندہ و تابندہ ھے۔ اس دور کی شاعری مین صنائع بدائع کے علاوہ سادگی ، جوش اور پختگی ھے۔ غزل ایک علیحدہ صنف سخن کی حیثیت سے ابھرتی ھے۔ شاھی دربارون سے شاعرون کا تعلق کم نظر آتا ھے جو حتی المقدور خوشامد اور تملق سے آزاد ھے۔ شعراؑ نے شعر وسخن کو وسیلۂ تبلیغ بنایا اور فقر و تصوف کے مضامین کو دلآویز اور رنگین پیرائے مین بیان کیا۔ عطار ، رومی ، سعدی ، حافظ ، جامی اور امیر خسرو اس دور کے اھم شعراؑ ھین۔ اس دور مین لاکھون انسان تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور بےشمار گھر بےچراغ ھو گئے چنانچہ خارج سے باطن کی طرف رجوع ، صوفیانہ مسائل ، دنیا کی ناپائیداری اور انسانی زندگی کی ھیچ مقداری جیسے موضوع عام ھو گئے۔

فارسی شعر و سخن کا تیسرا دور دسوین سے بارھوین صدی ھجری تک پھیلا ھوا ھے۔ دسوین صدی کے اوائل مین ایران پر صفوی خاندان کی حکمرانی قائم ھو گئی۔ صفوی حکمرانون کی ذاتی دلچسپی کے باعث ان کے دور مین مذھبی شاعری کو فروغ حاصل ھوا۔ مضمون آفرینی ،

صنائع لفظی و معنوی کا استعمال، تمثیل نگاری، باریک بینی، بلند پروازی اس دور کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہین۔ محتشم کاشی، عرفی، قاآنی، بیدل اور غالب اس طرز سخن کے علمبردار ہیـــن صفویون کے دور مین مرثیہ اور منقبت نگاری کو خصوصی فروغ حاصل ہوا۔

معاشرتی انحطاط کے سبب اخلاقی قدرین ٹوٹنے لگین۔ ہر شخص اپنی ذات کے خول مین مقید ہو گیا۔ دوستی کا وہ معیار نہ رہا کہ دوسرون کی خاطر جان کی بازی لگا دی جائے۔ خلوص و محبت اور مہر و وفا کی شمعین بجھنے لگین ـ ظلم و ستم کا دور دورہ ہوا۔ انصاف دنیا سے اٹھ گیا۔ شرافت اور حیا نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ طبیعتون سے غنا جاتی رہی اور لوگ سونا چاندی جمع کرنے کے پیچھے لگ گئے۔ علم و فضل، بہادری و فتوت، غریبون اور مسکینون کی دلداری جیسی صفات ختم ہو گئین ـ لوگ ہمت اور حوصلہ ہار گئے اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہونا ان کے بس مین نہ رہا۔ اس صورت حال مین منقبت گو شعرأ نے حضرت ابوبکر صدیق کے خلوص و وفا، حضرت عمر فاروق کے عدل و انصاف، حضرت عثمان غنی کی غنا اور شرافت حیا اور حضرت علی کے علم و فضل اور شجاعت و بہادری کو موضوع شعر بنایا۔ اہل بیت کی عظمت و کردار کو اجاگر کرکے، انہین ظلم کے سامنے صف آرا ہونے کا درس دیا۔ مشائخ طریقت اور بزرگان دین کی صحبت انسان کے زخمی دل پر مرہم کا کام دیتی ہے۔ شاعرون نے ان کے ذکر سے دکھی انسانیت کو سکون و راحت کا پیغام دیا۔ اس دور مین جو منقبت نگاری ہوئی وہ رسمی نہین مقصدی ہے۔ یہ وقت کی ضرورت تھی جسے فارسی شعرأ نے بطریق احسن پورا کیا۔

اس باب مین عربی اور فارسی منقبت نگاری کے چند نمایان رجحانات اور اسالیب کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے۔ غایت یہ ہے کہ اردو منقبت نگاری کے مآخذ سے تعارف حاصل کیا جا سکے ورنہ ان دونون زبانون مین منقبت نگاری کی مستحکم روایت موجود ہے جس کا کلی احاطہ کرنے کی اس مقالے مین ضرورت ہے نہ گنجائش ـ اس اجمالی تذکرے سے بہرحال یہ معلوم ہو جائے گا کہ اردو منقبت نگارون کے سامنے منقبت نگاری کے کون کون سے نمونے موجود تھے اور وہ کس حد تک ان سے متاثر ہوئے ـ

باب سوم

(دکنی دور)

اردو منقبت نگاری کے ابتدائی نقوش

پس منظر ۔

اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں صوفیائے کرام اور مشائخ عظام نے گرانقدر خدمات سر انجام دی ہیں ۔ ان نفوس قدسیہ نے اپنے کردار و عمل سے اسلام کی وہ شمع روشن کی جس نے بر صغیر کے اطراف و اکناف کو روشن کر کے مظلوم و مقہور انسانوں کو عظمت انسانی کا احساس دلایا اور ذات پات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں کو مساوات ، بھائی چارہ اور اخوت کا سبق دیا ۔ انہوں نے یہاں کے لوگوں کو سماجی نا انصافیوں سے نجات دلائی ۔ ان کی کاوشوں سے ہر طرف مہر و محبت کی روح پرور پھوار کا منظر نظر آنے لگا ۔ انہوں نے لوگوں کے دلوں پر اس طرح قبضہ جمایا کہ جو ان کے پاس آیا وہ انہی کا ہو کر رہ گیا ۔ ان کے دروازے بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے لئے کھلے تھے ۔ لوگ ان کے آستانوں پر حاضری دینا ، ان کی زیارت کرنا اور صحبت اختیار کرنا سعادت دارین سمجھتے تھے ۔ عام لوگوں سے اس قرب کا ایک سبب ان بزرگوں کی پاکیزہ زندگیاں تھیں اور دوسرے وہ جس زبان میں تلقین و وعظ کرتے تھے وہ لوگوں کی اپنی زبان تھی ۔

آریہ جب سر زمین ہند میں وارد ہوئے تو انہوں نے یہاں کے مقامی باشندوں کو جنوب کی طرف دھکیل دیا ۔ یہ لوگ احساس کمتری کا شکار تھے اور عظمت انسانی کے تصور سے نا آشنا تھے ۔ ان لوگوں تک جب اسلام کا پیغام اخوت پہنچا تو گویا بجھتے ہوئے چراغ کو روغن مل گیا ۔ ان میں زندگی کی قوت نمو لوٹ آئی اب وہ مسلمان بن کر رہنا چاہتے تھے ۔ ان کے سامنے آسودگی کے دروازے کشادہ ہونے لگے ۔

محمد بن قاسم سے بہت پہلے مسلمان تاجروں نے جنوب کے بعض ساحلی علاقوں پر اپنی نو آبادیاں قائم کر لی تھیں اور آہستہ آہستہ اسلام کا پیغام توحید بھی یہاں نفوذ کرنے لگا تھا ۔ لیکن جن بزرگوں نے دین اسلام کی تبلیغ کو اپنا مشن قرار دیا اور اس علاقے میں توحید کی مشعل جلائی ان میں سید راجو قتال (م 731) ، امیر حسن سنجری (م 736) ، برہان الدین غریب (م 738) ، شیخ عین الدین گنج العلم (م 795) خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (م 825) ، شمس العشاق شاہ میراں جی (م 902) شیخ بہاؤ لدین باجن (م 916) شاہ برہان الدین جانم (990 ھ) شاہ امین الدین اعلی (م 1086) قاضی محمود دریائی (م 941 ھ) اور شاہ علی محمد جیوگام دھنی

(م 973) خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

ان بزرگوں نے دکن کے مختلف علاقوں میں اپنے سجادے پھیلائے اور اصلاح اخلاق اور تبلیغ دین کا فریضہ سر انجام دیا ۔ انہوں نے برہمنوں کی طرح نہ تو عربی کو مسلم اور غیر مسلم عوام کی سطح سے بلند رکھا اور نہ مقامی بولی کو اپنی علمی اور دینی شان کے خلاف سمجھا ۔ انہوں نے عام انسانی سطح پر رہتے ہوئے لوگوں سے اپنے رابطے قائم رکھے اور اس طرح مقامی بولی سے بھی اپنا تعلق استوار کیا ۔ انہوں نے وعظ و نصیحت اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے فارسی اور عربی پر مقامی زبان کو ترجیح دی اور اپنی قوت عمل اور فکری توانائی سے دکن کے تہذیبی اور معاشرتی ڈھانچے میں نئی روح پھونکی ۔ ان صوفیاء کی تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ انسان دوستی دکن کے ثقافتی مزاج کا اہم حصہ بن گئی اور مختلف عقیدے رکھنے والے لوگوں کے درمیان تعصب کم ہوا ۔ ۔ رواداری ، حسن سلوک ، مروت اور روحانی اور مادی زندگی کی اقدار کا اعتدالی نقطہ نظر جیسے عناصر پیدا ہوئے ۔ اردو یہاں کی واحد مشترکہ زبان تھی ۔ یہ وسیع تر اتحاد کی اسی قوت کے سہارے دکن میں تیزی سے پھیلی اور ضرورت کی زبان بن کر پروان چڑھی اس بات کا ثبوت شاہ میراں جی شمس العشاق جیسے بزرگوں کے حالات سے ملتا ہے ۔ شاہ میراں جی شمس العشاق مکہ میں پیدا ہوئے ۔ وہیں ان کی پرورش ہوئی ۔ تقریباً بارہ سال تک نبی کریم کے روضہ پر حاضری دیتے رہے ۔ اس دوران میں ایک رات نبی کریم نے خواب میں انہیں ہندوستان کی طرف جانے کا اشارہ کیا ۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں وہاں کی زبان نہیں جانتا ۔ اس پر نبی کریم نے فرمایا کہ تم جاؤ تمہیں سب زبانیں معلوم ہو جائیں گی ۔ اس بشارت پر شاہ میراں جی ہندوستان آ گئے اور اردو (جو اس زمانے میں ہندوی کہلاتی تھی) پر عبور حاصل کر کے اس میں کئی نظمیں اور رسالے یادگار چھوڑے ہیں ۔

مسلمان صوفیاء نے قرآن ، حدیث ، فقہ تصوف ، معرفت اور اخلاقیات وغیرہ پر خطبات دیئے اور رسائل قلمبند کئے ۔ ان صوفیہ میں بہت سے شاعر بھی تھے اور انہوں نے اپنے تبلیغی مقصد کے حصول کے لئے شاعری کا پیرایہ استعمال کیا ۔ انہوں نے عام لوگوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اپنے دینی افکار کو ان راگوں اور راگنیوں کے مطابق ترتیب دیا جو عوام میں بڑے مقبول تھے ۔ چنانچہ جکری کو اس دور

میں خصوصی مقبولیت حاصل ہوئی -

جـــکـــر ی -

جکری ، ذکری کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور یہ اپنے اظہار اور ادائیگی کے اعتبار سے راگ کی ایک قسم ہے - یہ مسلمانوں کی اختراع ہے اور حمد ، نعت اور منقبت کے مضامین کے لئے ایجاد کی گئی ہے - تاکہ پرکیف عالم میں ذکر کے مزے لئے جا سکیں - اس سے مسلمان صوفیاء اور فقراء کے اس انداز فکر کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جہاں ہر سانس کو ذکر بنانا چاہتے تھے وہاں انہیں ہر ذکر میں جذب و مستی اور ذوق و شوق پیدا کرنے کا خیال تھا - شیخ بہاؤ الدین باجن نے اپنی شاعری کو جکری کہا ہے کیونکہ اسے مختلف راگوں میں گایا جا سکتا ہے - جکری میں شاعر کے صوفیانہ سلسلہ کا شجرہ اور مشائخ کی مدح بھی ہوتی ہے - یہ قوالوں اور سامعین کی محبوب صنف شعر و موسیقی ہے اور اس کی وجہ اس کی اثر انگیزی ہے -

- - - - - - - - - - - -

منقبت نگاری کا آغاز

اس دور کی شاعری میں جن مضامین نے راہ پائی وہ خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا ، حضور اکرم کی نعت اور ائمہ اہل بیت اور صوفیا و مشائخ کی منقبت ہے - یہ مضامین الگ الگ نظموں کی صورت میں بھی باندھے گئے اور مثنویوں کے درمیان بھی آتے ہیں - اکثر مثنویوں میں حمد اور نعت کے بعد خلفائے راشدین خاص طور پر حضرت علی ، امام حسین ، یا کسی پیر و مرشد کی منقبت اور مدح کے عنوان سے اشعار ملتے ہیں -

پروفیسر نجم الاسلام لکھتے ہیں -

" اردو شاعری میں مدحیہ شاعری کا قدیم ترین نمونہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز (م 825 ھ) کے وہ اشعار ہیں جن میں حمد و نعت کے مضامین کے بعد خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی مدح کی گئی ہے - [نمبر1]

ڈاکٹر محی الدین زور خواجہ بندہ نواز کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں -

---

نمبر1 = مضمون = دکنی اردو میں مدحیہ شاعری = قصیدہ نمبر صریر خامہ سندھ یونیورسٹی ص99

"بہت سی نظمین ، راگ ، راگنیاں اور چکی نالے منظوم کئے جو مختلف کتب خانوں کی بیاضوں میں محفوظ ہیں[نمبر2]"

مثال کے طور پر یہ دو نظمیں دیکھئے جو حقیقت کے نام سے لکھی گئی ہیں - تصوف کی کی نظموں کو حقیقت کہتے ہیں -

حقیقت

میں عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے
او پیو میرے جیو کا برقا لیا ہے

او معشوق بے مثال ہے نور نبی نپا یا
نور نبی رسول کا او میرے جیو میں بہا یا
ایکوں اپنے دیکھنے کیس آرس لا یا
کھڑکھڑے پیو جیو میں اپسیں اپ دکھاوے
ایسی میٹھی معشوق کوں کوئی کیوں دیکھنے پاوے
جنہہ دیکھے ا وہی کون اسے اور نہ بھاوے

کل شئی محیط ہے اس کون پچھانے
جو کوئی عاشق اس پیو کہ اسی جیو میں جانے
اسی دیکھت کم ہور ہے جیسی ہیں دیوانے
خواجہ نصیر الدین جنے سائیاں پیو بنا ئی
جیو کا کھوں کٹھ کھول کر پیا مکھ آپ دکھا ئی
اکھی سید محمد حسینی پیو سنکھ کھیا نہ جائی

---- --

نمبر1 دکنی ادب کی تاریخ = ص 12 - مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی

حقیقت

شکل بازی عشق کے چھ سوڑے جیو کوانا
موتو قبل ان تمو تو شاہد ہے معنا

اونچا مندر ہو عشق کا کوئی کیونکسر باوے
چاروں سیویاں چڑھ کر توہیے ہارتا آوے
جی سیس دیوے پانوں تل تو بھی ناپاوے
دوئی دوئی تائی دور کیکٹ واحد ہونا
چاروں کپڑے کپٹے جال کر مجنوں ہو رہنا
پورا مفلس ہووے تو اسے کھیل جت لانا

سوے عاشق شہباز ہے دونوں جگ کھلارا
خواجہ نصیرالدین سائیاں نپت راکھے ہمارا
نسنکہ کھیل توں پندرعشق کے تھسا ڑا

یہ کلام اگرچہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے نام سے منسوب ہے لیکن جدید تحقیق کی روشنی میں اس کی صحت مشکوک ہے - اس سلسلے میں نصیرالدین ہاشمی کا کہنا ہے کہ !

"بہت ممکن ہے کہ یہ کلام یا اس میں سے بعض آپ کا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ زمانہ بعد میں لوگوں نے آپ سے منسوب کر دیا ہو - چونکہ سردست قطعی ثبوت نہیں ملا ہے اس لئے ہم اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن خیال ظاہر نہیں کر سکتے"[1] -

اس دور کی سب سے پہلی تصنیف جو اب تک دریافت ہوئی ہے وہ نظامی کی مثنوی " کدم راؤ پدم راؤ" ہے - یہ اردو ادب کی اولین روایت کی نمائندہ ہے - مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ

---

[1] = مقالات ہاشمی = مضمون خواجہ بندہ نواز کی ہندوستانی شاعری ص 22 - 23 -

یا کوئی قصہ یا کوئی اخلاقی مضمون بیان کیا جا تا ہے اسے بنا پر زندگی اور معاشرت کے جس قدر پہلو ہیں سب اس میں آ جا تے ہیں اسی لئے تبلیغ مذہب و اخلاقیات کے اس دور میں دکن میں مثنویوں کو مقبولیت حاصل ہوئی ۔ مثنوی نگاری کی ابتدا ایران سے ہوئی ۔ فردوسی نے شاہنامہ جیسی رزمیہ مثنوی لکھ کر اس صنف کو اوج کمال تک پہنچا دیا ۔ فردوسی کی مثنوی خدائے بزرگ و برتر کی ثنا سے شروع ہوتی ہے ۔ پھر نعت رسول مقبول اور اس کے بعد خلفائے راشدین کی مدح ہے ۔ دکنی مثنوی نگاروں نے بھی اسی روایت کو پیش نظر رکھا ۔ عقیدے کے اختلاف کے ساتھ بعض شاعروں نے خلفائے راشدین کی جگہ صرف حضرت علی کی مدح لکھی ۔ لیکن عمومی طور پر حمد ، نعت اور اس کے بعد کسی عظیم شخصیت کی مدح مثنوی نگاری کا عام انداز رہا ہے ۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا آغاز بھی اللہ تعالیٰ کی حمد سے ہوتا ہے ۔

گسائیں تہیں ایک دنہ جگ ادار
بروبر دنہ جگ تہیں دینہار

پھر نعت کے بعد خلفائے راشدین کی مدح میں یہ شعر ملتا ہے ۔

ابا بکر ساچا عمر کا نیاؤ
کہ عثمان بھنڈاری علی کھڑک راؤ

اس دور کی اردو شاعری کا مجموعی رنگ مذہبی ہے ۔ حمد ، نعت ، منقبت ، مناجات ، مرثیہ ، مذہبی خیالات کے اظہار کے لئے وقف ہیں ۔ مثنویوں کے مضامین اور قصے بھی اخلاقی اور صوفیانہ اساس رکھتے ہیں ۔ غزل جو خالصتاً عشقیہ جذبات کے لئے وقف تھی ۔ مذہبی علامتیں رکھتی ہے ۔ اس کی وجہ اسلامی معاشرے کی مخصوص ہیئت اجتماعی ہے جس کا اثر مسلمانوں کے تخلیق کردہ ادب پر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ غیر مسلم ادیبوں نے بھی اس کے اثرات قبول کئے ہیں ۔ اور ان کی تخلیقات میں بھی یہ رجحان غالب نظر آتا ہے ۔ توحید اور رسالت پر شدید یقین اور مساوات و اخوت جیسے عقائد نے (جن کا دوسرے مذاہب میں فقدان نظر آتا ہے) مسلمانوں کو امتیازی حیثیت دے دی ہے ۔ مسلمانوں میں دوسری اقوام کی نسبت برتری کا احساس ہمیشہ رہا ہے ۔

اس لئے ان کا فن کے بارے میں اپنا ایکمخصوص زاویہ نگاہ ہے ۔ان کے نزدیک صرف وہی فن قابل قبول ہے جو تعمیری ہو اور حقیقی مذہبی روح سے ہم آہنگ ہو ۔

نظامی عروضی سمر قندی کہتے ہیں !

" سخن دانی ایک چشمہ حکمت ہے ۔پیٹ کی خاطر اس چشمے کو گندہ کرنا سخت ظلم ہے۔ شعر اس قسم کا کہنا چاہیئے جس کی شرع اجازت دے "۔ [نملہ]

مسلمانوں کے مخصوص مذہبی تصورات نے اردو شاعری کے مضامین اور اسالیب پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے ۔ منظوم تصانیف کے شروع میں حمد ، نعت اور منقبت کا موجود ہونا دیوان کا آغاز حمدیہ اور نعتیہ غزلوں سے کرنا ، شعروں میں قرآنی تلمیحات کے علاوہ آیات و احادیث کو مکمل طور پر یا جزوی طور پر باندھنا ، یہ سب اسی سبب سے ہے ۔ خدا کی حمد بیان کرنے ، رسول کی توصیف کرنے اور بزرگان دین کی مدح کو کار ثواب سمجھنے کے سبب حمد ، نعت اور منقبت کو فروغ حاصل ہوا ۔

منقبت نگاری کے رجحانات

منقبت نگاری کے سلسلے میں اس دور کی شاعری میں تین واضع رجحانات ملتے ہیں ۔

1 ۔ خلفائے راشدین کی منقبت

2 ۔ حضرت علی اور اہل بیت کی توصیف

3 ۔ بزرگان دین کی تعریف

خلفائے راشدین کی منقبت میں نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ" نصرتی کی گلشن عشق ، محمود بحری یا لسحری کی "من لگن" شیخ باجن کی شہادت الحقیقت ۔عبدل کا ابراہیم نامہ ، امین کی " بہرام و حسین بانو" غوصی کی "سیف الملوکو بدیع الجمال' غلام علی کی "پدماوت" اور ملک خشنود کی "جنت سنگار" خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں !

جوں دوست ہے مصطفیٰ خدا کے ۔۔۔ یوں یار ہے چار مصطفیٰ کے

بو بکر کہیں جسے جو صدیق ۔۔۔ دوسرے عادل عمر ہے تحقیق

نملہ = بحوالہ غیر مطبوعہ مقالہ = اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر ، الف ۔د ۔نسیم ۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، لاہور ۔

تیسرے عثمان سمد حیا کے | چوتھے ہیں علی ولی خدا کے
یوں مل کے اٹھے چہار یار او | جوں حرف چہار کے چہار او

"محمود بحری - من لگن"

ابو بکر صدیق وو یار غار | دھریا سقف دین رکن تے جس ادھار
عمر ابن خطاب اور نیک رائے | کہ اتعدل سون دین کا گھر بسائے
جو عثمان دھنی شرم و ایمان کے | او جامع اہیں جملہ قرآن کے
وصی نبی ذی شرف ات بلی | سو او شاہ مردان علی ولی

" نصرتی - مثنوی گلشن عشق "

وجہی نے مثنوی قطب مشتری میں حضرت علی کے مناقب بیان کئے ہیں - نصرتی نے گلشن عشق اور علی نامہ میں تین خلفائے راشدین کی مدح کے بعد حضرت علی کی شان میں مفصل منقبت لکھی ہے - قلی قطب شاہ کے دیوان میں مناقب علی موجود ہیں - علی عادل شاہ شاہی نے ایک قصیدہ در منقبت امیر المومنین حضرت علی قلمبند کیا ہے - اور ایک اور قصیدہ "در منقبت دوازدہ امام علیہم السلام" لکھا - ابن نشاطی نے پھول بن میں حضرت علی کے علاوہ امام حسین کی منقبت لکھی ہے - امین نے مثنوی بہرام و حسن بانو میں امام حسن اور امام حسین کی تعریف میں کچھ اشعار لکھے ہیں - ہاشمی بھی آل رسول کی مدح میں رطب اللسان نظر آتے ہیں - مثالیں دیکھئے -

زبان کوں منقبت کے سات کھولوں | نبی کے جانشیں کا مدح بولوں
تیرا خنجر جو آوے چنچل چھلاتی | سو اوسکا میان ہے دشمن کی چھاتی
جو سرمہ گرد تجھ نعلین کا ہے | شفاء العین میرے عین کا ہے
تیری تعریف کرنا ایک ساعت | اہے ہفتاد سالاں کی عبادت
عطا کر حشر کے دن جام مجھ کوں | توں کر دو جگ میں شیریں کام مجھ کوں

(ابن نشاطی - پھول بن)

توں جگ کا پیارا توں جگ کا ادھار | خدا کا توں ہمدم نبی کا توں یار

جو کاماں کیا ہے شجاعت کے توں — خبر نہیں ہے رستم کی ارواح کوں

عجب اژدہا ہے تیرا ذوالفقار — کہ یکدم سوں کھالیا ہے سالم کفار

اگر ہاک مارے توں آ حال میں — چھپے عرش جا ڈرتے پاتال میں

تیرا مرتبہ اونچ تے اونچ ہے — اول توں اہے آخر کوں بی توں چ ہے

(وجہی - قطب مشتری)

دکنی منقبت نگاری کا تیسرا واضح رجحان بزرگان دین کی مدح سرائی ہے - یہاں شاعروں نے عموماً اپنے پیرو مرشد کی تعریف کی ہے - ان شاعروں نے ان بزرگوں کے گن گائے ہیں جو اس وقت حیات تھے یا شاعر نے کم از کم ان کو دیکھا ضرور تھا - البتہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی ذات ایسی ہے جن سے شعراء غالبانہ عقیدت رکھتے ہیں - اس کی بڑی وجہ ان کی وہ حیثیت ہے جس کی بنا پر انہیں پیران پیر کا لقب حاصل ہے - محی الدین عبدالقادر جیلانی کی مدح میں چند مستقل تصانیف بھی تحریر ہوئی ہیں - ان میں افضل کا محی الدین نامہ اور ذوقی کا غوث نامہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں - ان کے علاوہ عشرتی - بحری - غواصی - سید احمد ہنر اور فیروز نے بھی ان کے مناقب لکھے ہیں -

پیران پیر کے بعد جن بزرگوں کے بارے میں سب سے زیادہ لکھا گیا وہ خواجہ گیسودراز بندہ نواز کی ذات گرامی ہے - نصرتی نے گلشن عشق میں - عبدل نے ابراہیم نامے میں ابراہیم عادل شاہ نے "نورس" میں اور علی عادل شاہ شاہی نے اپنے کلیات میں ان کے فضائل و مناقب منظوم کئے ہیں طبعی نے "بہرام و گل اندام" میں شاہ راجو حسینی کی مدح کی ہے - محمود بحری نے "من لگن" میں اپنے مرشد شیخ محمد باقر کی تعریف کی ہے - شاہ برہان الدین جانم نے اپنے پیر و مرشد اور والد شاہ میراں جی کی توصیف میں شعر کہے ہیں - شاہ امین الدین اعلیٰ نے اپنے مرشد اور والد شاہ برہان الدین جانم کی مدح لکھی ہے - شیخ باجن نے شیخ رحمت اللہ کی اور قاضی محمود دریائی نے اپنے والد اور پیر و مرشد شاہ چا یلندہ کی منقبت لکھی ہے -

اس دور میں پیری مریدی کا سلسلہ عام تھا - چنانچہ خواجہ گیسو دراز بندہ نواز کے صاحبزادے سید اکبر حسینی جنہیں نظم و نثر میں خصوصی مہارت تھی اور جو اپنے وقت کے نامور صوفیاء میں

شمار ہوتے تھے پیر کی شخصیت کو خدا شناسی کے راستے کی ضروری کڑی بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں

" جس کوں پیر نہیں ہے دین نہیں - جسے دین نہیں تو اسے بوج نہیں ہور جسے بوج نہیں اسے عشق نہیں -جسے عشق نہیں اسے صحبت نہیں - ہور جسے صحبت نہیں اسے پیر نہیں - بے پیر ہو کر رہنا عین کفر ہے" -

بزرگان دین کی منقبت کی چند مثالیں دیکھیئے -

غوث الاعظم کی شان میں -

تہیں قطب الا قطاب جگ پیر ہے
تہیں غوث اعظم جہانگیر ہے
تہیں چاند باقی ولد تارے ہیں
توں سلطان سردار بسیارے ہیں

(فیروز - توصیف نامہ)

خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی مدح میں -

سید محمد پتی میرا جیون رتن میں اتم ہیرا
محل محل صدر سنوارے اس نمونے بہشت اپارے
افند ہوتا ہے سدا بہارے ارتی لیائے انبر بھرتارے
کدم کستوری جو چندن لائے بادل کالے ہو رنگ برسائے

(ابراہیم عادل شاہ - نورس)

زبان دھو کے پھل منرسوں مکہ میں لاؤں
سو سید محمد حسینی کا ناؤں
جتے عاشقاں میں اچھے سرفراز
جتے جگ کا مخدوم بندہ نواز
تیرا جد ہے جیون اشرف الانبیاء
توں ویسا چہ ہے افضل الاولیاء

دکھن کی عجب بخت ور خاک ہے

کہ جس بیچ تجہ خواب گہ پاک ہے

(ملا نصرتی ۔ گلشن عشق)

مدح شیخ محمد باقر قدس سرہ ۔

مولا کے محب نبی کے نائب

مانس نہیں مظہر العجائب

سا گرے سپور معرفت کے

بل عین ہے نور موفت کے

اس دور جو بایزید ہوتے

مل شیخ سوں مستفید ہونے

تر لوک اپر تیری و میری

در حال کرے توں دستگیری

(محمود بحری ۔ من لگن)

شاہ چا پلندہ کی منقبت ۔

سائیں کن ایک بار اکھار ہوں دکھیا کروں جوہار

تیرے مکھڑے کے بلہار

محمود سائیں سیوک تیرا توں تو سائیں سمرت میرا

کریں ہماری سار

امت نبی محمد کی یہ محمود تیرا داس

برکت پیر چا ہلندہا سائیں پور دیں من کی آس

(محمود دریائی)

خلفائے راشدین اور اہل بیت اور بزرگان دین کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے اردو

ادب میں ایک معقول مذہبی سرمایہ جمع ہو گیا ہے اور خلفائے راشدین اور اہل بیت کے بارے میں لکھنے والوں کے مذہبی عقائد کا اختلاف بھی سامنے آتا ہے - دکنی شعراء نے بلا امتیاز مسلک حضرت علی اور اہل بیت کے فضائل و مناقب بیان کئے ہیں - لیکن پہلے تین خلفاء کے بارے میں صرف ان شعراء نے قلم اٹھایا ہے جو خلافت کی موجودہ ترتیب کو درست سمجھتے ہیں - اہل بیت کی محبت تمام مسلمانوں پر اجتماعی مسلک ہے - لیکن چاروں خلفاء کو ایک ہی مشعل کی کرنیں سمجھنا ہر ایک کا ایمان نہیں ہے - اس لئے ان شاعروں کے ہاں جن کا مسلک اہل سنت ہے نہ صرف خلفائے راشدین کے مناقب نظر آتے ہیں - بلکہ اہل بیت کی تعریف و توصیف میں بھی انہوں نے کوتاہی نہیں کی - لیکن شیعہ شاعروں نے اپنے مخصوص انداز فکر کی بنا پر پہلے تین خلفاء کو قابل توجہ نہیں سمجھا -

اس دور کی منقبتی نظمیں ایک اور رجحان بھی رکھتی ہیں - اور وہ مخالفین کے خلاف نفرت کا اظہار ہے - اگرچہ یہ رنگ اتنا شوخ نہیں ہے تاہم اس قابل ہے کہ اس پر غور کیا جائے وجہی کا یہ شعر دیکھئے -

علی کا محب نئیں جکوئی [illegible] توں جان
[illegible]

(قطب مشتری)

قلی قطب شاہ

قلی قطب شاہ کے ہاں یہ رنگ زیادہ نمایاں ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سلاطین قطب شاہیہ میں وہ پہلا حکمران ہے جس نے شیعیت کا علم بلند کیا اور اسے فروغ دینے کی کوشش بھی کی قلی قطب شاہ کا بڑا بھائی عبدالقادر عرف شاہ صاحب صوفیانہ مشرب رکھتا تھا - وہ تخت شاہی کے لئے اس کا مد مقابل تھا - گولکنڈا اور بیدر کے اکثر مشائخ و صوفیاء اس کے پشت پناہ تھے - تخت حاصل کرنے کیلئے قلی قطب شاہ کی ضرورت یہ تھی کہ وہ ایک ایسی قوت منظم کرے جو تاج و تخت کے حصول کیلئے اس کی مدد کرے چنانچہ اس نے شیعیت کو فروغ دے کر یہ قوت منظم کر لی - قلی قطب شاہ کی شاعری میں اس کے اس جذبے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں وہ کئی جگہ اپنے ہم مسلکوں کو

مبارکباد دیتا ہے اور مخالفوں کو ہدف دشنام بنا کر بد دعا دیتا ہے ۔میلاد کے قصیدے میں سنیوں کو خارجی اور کافر کہتا ہے شیعوں کو موسیٰ اور ان کے مخالفین کو فرعون سے تشبیع دیتا ہے۔

بزرگان دین کی تعریف و توصیف میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ایک بات واضع ہے کہ ہر شاعر اپنے پیر و مرشد کو عقیدت کی نگارہ سے دیکھتا ہے ۔وہ تمام انسانی خوبیوں سے متصف ہے ۔ اتباع رسول اس کی خاص خوبی ہے ۔روحانی تصرفات میں اسے کمال حاصل ہے ۔اس کی نگاہ کرم مشکلات کو ٹالتی ہے اور آسودہ خاطری کے در کھولتی ہے ۔ اس کے پس منظر میں یہ تصور کار فرما ہے کہ الله تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں پر بڑی نوازشیں کر رکھی ہیں ۔وہ اس کی عطا کردہ قوتوں سے ضرورت مندوں کی اعانت کرتے ہیں ۔ اور مشکلات میں گھرے ہوئے انسانوں کیلئے آسائشیں پیدا کرتے ہیں ۔

ولی ۔ ولی دکنی تک آتے آتے اردو کی شعری روایت تین صدیوں کا سفر طے کر چکی تھی ۔ولی کی حیثیت ایک پل کی سی ہے اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شمالی ہند کی زبان کو دکنی ادب کی طویل روایت سے ملا کر ایک کر دیا اور زبان و بیان کے ایک نئے معیار کا آغاز کیا جسے برسوں تک ریختہ کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ۔

" ریختہ کی تین خصوصیات قابل ذکر ہیں ۔ایک تو یہ کہ اس نے پیرویٔ فارسی کے راستے کو اختیار کیا دوسرے بے ساختگی اس کی بنیادی خصوصیت ٹھہری اور تیسرے زبان و بیان کا یہ عالم گیر روپ ایسا تھا ۔جو بے تکلف سب کی سمجھ میں آتا تھا ۔ اور جسے سارے علاقوں نے واحد ادبی معیار کے طور پر قبول کر لیا[نمبر ۱]"

شاہ سعدالله کے مشورے سے ولی نے اپنے رنگ سخن کو فارسی روایت کے مطابق ڈھالنے کا عمل شروع کیا ۔چنانچہ جب ولی کا دیوان شعرائے دہلی کے سامنے آیا تو انہوں نے فارسی کو چھوڑ کر اسی رنگ سخن کی پیروی شروع کر دی اور اس طرح ولی اردو ادب کی جدید روایت کے معمار اول بن گئے ۔ انہوں نے اپنی متوازن طبیعت سے فارسی دکنی اور شمالی کی زبان کو اس طرح ملا کر ایک کر دیا کہ

نمبر ۱ تاریخ ادب اردو حصہ اوّل ڈاکٹر جالبی ص 530

وہ علاقائی سطح سے بلند ہو کر ہمہ گیر ہو گئی یہی نہیں بلکہ اس نے قدیم شعری روایت کے بہترین اجزاء کو اپنی شاعری میں سمیٹ لیا اور ان تمام آوازوں کو اپنی آواز میں جذب کر لیا جو تاریخ کے ساز سے نکل رہی تھی ۔ ولی کی شاعری میں سارے قدیم دور کی روح بول رہی ہے لہٰذا اس کے ہاں مذہبی شاعری کی روایت بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے

سرور کائنات اور دیگر اکابرین ملت سے والہانہ محبت امت محمدی کا جزو ایمان ہی نہیں اصل ایمان بھی رہا ہے خطیبوں نے اپنی محبت کے اظہار میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے ۔ ادیبوں نے لفظوں کا جادو جگایا ۔ اور شاعروں کے قلم نے شعروں کا امرت ٹپکایا ۔ ولی قادر الکلام شاعر تھے ۔ مذہب ان کے دور کا عام رنگ تھا ۔ وہ اس سعادت سے کیونکر محروم رہ سکتے تھے ۔ ان کے یہاں اصناف سخن کا بڑا تنوع پایا جاتا ہے ۔ ان کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصیدے ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، رباعیات ، قطعات ، مثنویات ، مخمس اور مستزاد بھی پائے جاتے ہیں ۔ ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں جن میں شاعر نے عجیب حسن کلام کے ساتھ حمد نعت اور منقبت کا مضمون یکجا کر دیا ہے ۔

سجن کی خرد سالی پر خدا ناصر خدا حافظ

رکیباں کی ملامت سوں محمد مصطفےٰ حافظ

سجن کے حسن افزوں پر خدا تو اماں کرنا

کہ اس امید گلشن پر علی مرتضےٰ حافظ

سجن کی تیغ ابرو سوں شہادت گاہ پاؤں میں

مرے اس قتل ہونے پر شہید کربلا حافظ

ان کے دیوان میں چھ مدحیہ قصیدے ملتے ہیں لیکن یہ قصیدے درباری داری یا خوشامد کے طور پر کسی کی مدح میں نہیں لکھے گئے ۔ وہ قناعت پسند اور درویش صفت انسان تھے ۔ ان کے قصائد میں پہلا قصیدہ حمد ، نعت ، منقبت اور موعظت میں ہے اس میں 123 اشعار ہیں حمد اور نعت کے بعد خلفائے راشدین کی مدح یوں کی ہے ۔

بعد اس آفتاب انور کے　　چار ھین اھل علم و اھل عمل

صاحب صدق و عدل و علم وحیا　　ایک سون ایک اکمل و افضل

ان کو اصحاب مین سباقت ھے　　دین کون جو کئے قبول اول

ھین دجے کہ وہ دین کےپلسون　　کفر کے دست و پا کون کیتے شل

ھین تجے وہ کہ جن کے لوھوسون　　رنگ پکڑا کلام عزو جل

ختم خلفا کی کیا کہون مین بات　　جس کے رھنے کا عرش پر ھے محل

اس کے بعد پانچ اشعار مین حضرت علی کی بہادری اور ان کے تقوے کا ذکر کرتے ھین -

جب ھوا وہ سوار دلدل پر　　فوج پر فوج دل پہ مارا دل

وہ ھرپھکتائے دین کہ جن نے کہا　　لاکھ مشکل کو ایک پل مین حل

نام اس کا کہ جس کے تقوے سے　　زور نے زور ، بل نے مارا بل

ھے علی وہ کہ جس کی دھشت سے　　جی گیا دشمنون کا تن سے نکل

خوف اس کا عدو کی چھاتی پر　　جیون ھرن کے سینے اوپر چیتل

اس کے بعد چارون خلفا کی مجموعی مدح یون کرتے ھین -

ھین یہ چارون ستون شرع متین

دین کا ھے ان سون مستقیم محل

ھین یہ اسلام کے صیحفے پر

چار اطراف صورت جدول

بعد ازان شاعر امام حسن اور امام حسین کی تعریف مین زمزمہ ریز ھوتا ھے !

بعد ان کے ھین دو امام جہان　　نور چشم پیمبر مرسل

ھر دو سلطان کشور کونین　　ھر دو مقبول شاہ روز ازل

ایک کا تن ھوا ھے اطلس سبز　　ایک خون سون زمین کیا مخمل

دوسرا قصیدہ نعتیہ ھے- تیسرے مین حضرت علی مرتضٰی کی مفصل مدح ھے اس مین ۳۳ اشعار ھین -
اس کا مطلع یہ ھے-

ہر ایک رنگ میں دیکھا ہوں چرخ کے نیرنگ

ہوا ہوں غنچہ صفت جگ کے باغ میں دل تنگ

مدح کے مضمون میں کہتے ہیں کہ حضرت علی مرتضی شیر حق ہیں ۔ ناصر دین ہیں وہ دنیا کے فتنہ و طوفان سے پناہ دینے والے ہیں۔ ان کے عدل کا شہرہ سن کر آسمان نے ستم کرنا بند کر دیئے ہیں۔ خدا نے انہیں ہر دشمن پر فتح دی ہے۔ ان کے گھوڑے کی برق رفتاری لاجواب ہے ان کے نام کا ذکر شکستہ دلوں کو حوصلہ دینے والا ہے ۔

چوتھا قصیدہ بیت الحرام کی مدح میں ہے اور پانچویں میں حضرت میران محی‌الدین کی تعریف ہے اس میں ۳۸ اشعار ہیں۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

دکھے نظر سوں اگر یہ جمال نورانی

شرم سوں مصرلیسے جا کے ماہ کنعانی

ان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مشائخاں جو کئے ہیں مدام کسب شرف

تیری جناب سے پائے ہیں قرب حقانی

وہ آفتاب غلط جگ میں ہوا روشن

تیرے جو نقش قدم پر گھسا ہے پیشانی

تیری مدد سوں ہے اکثر ضعیفاں کوں قوت

دیئے ہیں مور کوں یاں حشمت سلیمانی

خدا کے فضل سوں مسند نشیں ہو تم اسکے

بنی ہے نور سوں جس کے یہ شکل انسانی

تیری گلی میں میسر ہوں جس کوں بسترخاک

قصور ہے کہ منگے پھر کے قصر کیوانی

چھٹا قصیدہ جس میں ۴۷ اشعار ہیں شاہ وجیہ الدین کی شان میں ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

ھوا ھے خلق پر پھر سے فضل ربانی
کیا ھے ابر نے رحمت سون گوھر افشانی

مدح اشعار یہ ھین ۔

یو دین پاک مین بےشک ھے تو وجیہ الدین
مدم ھے آج زمین کے اپر تیرا ثانی
ھے ملک دین مین تیری ذات کو شہنشاھی
ھے نقد علم تیرا سکۂ سلمانی
ھرایک کون اس سون خبرنئین ھرجگ کےصفحےپر
تجھے جو کشف ھوئے رازھائے پنہانی
تیری جناب سون ھے فیض طالبان کو مدام
تیرے کرم سون ھے اکثر کون قرب حقانی

ڈاکٹر اعجاز حسین ولی کے قصیدون کا ذکر کرتے ھوئے کہتے ھین !

" ولی کے قصائد پر نظر ڈالتے ھوئے حیرت ھوتی ھے کہ اس عہد مین جب زبان ابتدائی حالت مین تھی کیونکر انہون نے زوردار قصیدے کہے ھون گے۔ جتنی خوبیان قصیدے مین ھونی چاھیئےین وہ سبھی موجود ھین۔ شوکت الفاظ بھی ھے، زور بھی ھے اور مشکل زمین کے ھوتے ھوئے روانی بھی ھے۔ ان کے قصائد مین محاکاتی عنصر بھی خوبی کے ساتھ قلم بند ھوئے ھین " [۱] قصیدون کے علاوہ کچھ ترکیب بند اور ترجیع بند بھی ایسے ھین جن مین قصیدون کا رنگ غالب ھے ان مین شاہ وجیہ الدین کی مدح والا ترجیع بند خاص طور پر قابل ذکر ھے۔ اس بند مین ۵۵ اشعار ھین اور ھر دس اشعار کے بعد یہ شعر دھرایا جاتا ھے۔

اے امام جمیع اھل یقین   قبلۂ راستان وجیہ الدین

اس کا ایک بند ملاحظہ ھو !

---

[۱] مختصر تاریخ ادب اردو   ص ۴۲

اے گل گلشن حسین و حسن   تجھ سون روشن ہوا زمین و زمن

عالم فرش سون لچا ہر عرش   حق نے جنت کیا تیرا مسکن

فیض تیرا عیان ہو جس ساعت   بحر کا ہر گہر کرے دامن

گو ہر فکر تجھ سون ہے سیراب   جوہر عقل تجھ سون ہے روشن

خلق یون بہرہ تجھ سون باقی ہے   فیض جیون آفتاب سون معدن

آسمان کے اپر گداز ہے دت   شوق تیرے سون ماہ سیمین تن

عشق تیرے کی آگ مین خورشید   سرسون لے پگ تلک ہوا ہے اگن

دیکھنے کون تیرے ہوا مشتاق   گل نرگس سون کھول چشم چمن

یون تو ہے انتخاب عالم مین   جیون کہ ہے آدمی مین نطق سخن

خوش بصارت بدل کیا ہے ولی   گرد تیرے قدم کی کحل دہن

اے امام جمیع اہل یقین

قبلۂ راستان وجیہ الدین

ولی دکنی نے شاہ وجیہ الدین کا زمانہ نہین پایا۔ ولی کا انتقال ۱۱۳۳ھ اور ۱۱۳۸ھ کے درمیان ہوا۔ شاہ وجیہ الدین حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کے مرید تھے اور ۹۹۸ھ مین فوت ہوئے۔ ان کا مدرسہ، خانقاہ اور مزار احمدآباد مین مرجع خلائق تھا۔ ولی یہان مقیم رہے اور شاہ وجیہ الدین سے روحانی طور پر فیض یاب ہوتے رہے۔ ولی خود حضرت علی رضا سرہندی سے بیعت تھے۔ ایک شعر مین ان کا ذکر یون کرتے ہین۔

بعد شاہ نجف ولی اللہ   پیر کامل علی رضا پایا

اردو ادب کے مذہبی سرمائے مین ولی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کے دیوان مین حمد، نعت اور منقبت کی موجودگی مذہب اور مذہبی شخصیات سے ان کی گہری وابستگی کا اظہار کرتی ہے انہون نے مذہبی تعلیم حاصل کی تھی اسلئے وہ حمد، نعت اور منقبت کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انہون نے یہ نظمین لکھتے ہوئے مبالغے اور غلو کو اپنا شعار نہین بنایا اور فرط محبت یا جوش عقیدت مین ان نظمون کی حدود کو پھلانگنے کی کوشش نہین کی۔ انہون نے مذہب کے دائرے مین رہتے ہوئے اور خدا، رسول خدا اور بزرگان دین کے مقام اور مرتبے کو سمجھتے ہوئے یہ اشعار قلم بند کئے

گئے ھین۔ ان نظمون مین ان کی زبان کافی حد تک صاف ھے اور وہ دکنی الفاظ و محاورات جو ان کے کلام مین کثرت سے ملتے ھین بہت کم ھین۔ تشبیہات کی جدت اور استعارات کی ندرت نے ان کے کلام کو وہ تازگی اور شگفتگی عطا کی ھے جو انہین کا حصہ ھے۔ انہون نے فارسی کی خوبصورت ترکیبون اور ھندی اور فارسی کے منتخب الفاظ کی آمیزش سے اپنے کلام کو اس طرح آراستہ کیا ھے کہ دلکشی اور صفائی ھر جگہ نمایان ھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ھین ۔

" اردو شاعری کو ایک نیا رخ دینے والے کی حیثیت سے ولی کا باب سخن تاقیامت کھلا رھےگا ،، ۔ ص[۱]

یہ بات جہان مجموعی حیثیت سے ولی کی شاعری کے بارے مین درست ھے وھان اردو منقبت نگاری کے بارے مین بھی صحیح ھے۔ انہون نے بزرگان دین کی مدح مین جو انداز بیان اختیار کیا اس مین توازن اور اعتدال ھے۔ انہون نے اپنے داخلی جزبات کو منقبت کے مضمون پر حاوی نہین ہونے دیا اور عقیدت کا اظہار کرتے ھوئے حدود ادب سے باھر نہین نکلے۔ وہ بٹے تلے الفاظ اور محتاط انداز کے ساتھ اھل بیت اور بزرگان دین کی مدح مین نغمہ سرا ھوئے ھین۔ ان کے مناقب مین قرآن اور حدیث کے مضامین کے ساتھ ساتھ نیازمندانہ رجحان کی ترجمانی بھی ملتی ھے۔ ولی نے اپنے کمال فن اور احتیاط آمیز رویئے کے سبب آنے والے منقبت نگارون کو ایک روشن راستہ دکھایا ھے۔ غزل کی طرح منقبت نگاری مین بھی ان کی حیثیت ایک منارۂ نور کی ھے۔ ولی کے ھان منقبت نگاری کے تینون رجحان موجود ھین۔ انہون نے خلفائے راشدین کی تعریف ، حضرت علی اور اھلبیت کی توصیف اور مشہور صوفی بزرگ شاہ وجیہ الدین کی مدح لکھی ھے۔

کلیات ولی ص[۱] مین دو مثنویات بھی درج ھین جن کے بارے مین مرتب کا خیال ھے کہ یہ دونون کسی اور مثنوی کے حصے ھین ص[۲] پہلی مثنوی کا آغاز خدا کے حضور دعا سے ھوتا ھے پھر نعتیہ اشعار ھین اس کے بعد خلفائے راشدین کی مدح کا مضمون یون بیان ھوا ھے۔

ص[۱] مرتبہ نورالحسن ہاشمی ؛ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۴ء

ص[۲] کلیات ولی ص ۳۲۶

کیا حق اس رسول ارواح خاطر مرتب چار دیوار عناصر

ہوا جب چار باغ دین روشن شریعت کا کھلا اس بیچ گلشن

سنواری گرد اس کے چاردیوار حقیقت مین سمجھ ہین چار وہ یار

وہ ہین مقبول درگاہ صمد کے وہی ہین منتخب اس چار حد کے

ان اشعار مین شاعر نے مضمون آفرینی سے کام لیا ہے اور اپنے ممدوحین کی تعریف کا انوکھا پہلو تلاش کیا ہے۔ ولی نے روایتی انداز مدح سے گریز کیا ہے اور منقبت کے لئے نئے انداز سے بات کی ہے۔ زبان اسلوب ولی کی نمائندہ ہین۔ اس مین دکنی الفاظ و تراکیب کی آمیزش نہین ہے۔ یہان حمد ، نعت منقبت کے مضامین باندھ کر ولی نے مثنوی نگاری کی اس روایت کو نبھایا ہے جس کی بنیادین اب خاصی مستحکم ہو چکی تھین ۔

—— مولانا محمد باقر آگاہ (۱۱۵۸ھ تا ۱۲۲۰ھ) نے دکن کے مذہبی ادبی اثاثے مین معتدبہ اضافہ کیا ہے۔ " ہشت بہشت ،، ان کی معروف سیرتی مثنوی ہے جس مین سید عالم ؐ کی سیرت مبارکہ کو آٹھ منظوم رسالون مین تقسیم کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا نام ہشت بہشت رکھا ہے ایک بسیط دیباچہ بھی کتاب کے شروع مین درج ہے جس مین سبب تالیف اور مضامین کے مآخذون کا بیان ہے۔ کتاب کا آغاز رسالۂ عقائد سے کیا گیا ہے جس مین مختلف عنوانات کے تحت مضامین نظم کئے گئے ہین مولانا آگاہ نے اہل سنت کے چارون مذہبون کو برحق قرار دیا ہےاور کسی ایک امام کی اتباع کی تلقین کی ہے۔ اس کے بعد صوفیاء کے خانوادون مین سے حضرت غوث الثقلین کے خانوادہ کو افضل قرار دیا ہے مولانا کا خاص کمال یہ ہے کہ انہون نے صحت روایات کا بڑا خیال رکھا ہے اور کوئی ضعیف روایت نظم نہین کی ہے ۔ پہلا رسالہ من دیپک ہے جس مین رسول اکرم کے نور مقدس کا ذکر ہے۔ حمد و نعت کے اشعار کے بعد حضرت غوث اعظم کی منقبت ہے اور پھر اپنے مرشد سیدابوالحسن قربی قادری کی مدح ہے غوث الاعظم کی مدحت کا انداز یہ ہے

اب باقر جلدی لے کے قلم کر منقبت غوث الاعظم

سالار رسل کا نور بصر او مظہر کل کا لخت جگر

جان و دل آدم محی الدین سلطان دو عالم محی الدین

هے قبلۂ حاجات اس کا در ہے عرش معلی کا افسر
گھستے ہین ولیان وان سراپنا خاک اس کی کرین افسر اپنا
ہے ورد جہان کو ناؤن اس کا ہے سر پہ ولیان کرپاؤن اس کا
کل جگ کاشہ اس کا دادا پس وہ ہے سب کا شہزادہ
تسلیم و تحیات و رضوان تربت پر اوس کے ہوے ہرآن
اور اوس کے مریدان ہین سارے
آسمان ہدایت کے تارے

آگاہ نے اپنے پیر و مرشد سید ابوالحسن قربی قادری کی تعریف یون کی ہے -

خاصا قزلی اور شیخ زمن عرفان کی کان کا پاک تن
ہے علم و معارف مین جعفر ہے کرم مین معین اوس کا جگر
جب عرفان کی تقریر کرے ہر سامع کو تصویر کرے
تھا ہر فن مین وہ بے جوڑا جو وصف کرون وہ ہے تھوڑا
من اوس کا حق سے بھرا چھو دل اوس کا دت سرور اچھو

دوسرا رسالہ من ہرن ہے۔ اس مین رسول کریم کے ظہور کی بشارت کا بیان ہے۔ نعت کے بیان کے بعد مناجات ، منقبت حضرت غوث الاعظم اور مدح سید ابوالحسن قربی قادری ہے۔ مضمون کم و بیش وہی ہے جو پہلے رسالہ من دیپک مین بیان ہوا۔

تیسرا رسالہ " من موہن ،، ہے۔ اس ولادت باسعادت اور اس سے متعلق معجزات کے ظہور کا بیان ہے - اس مین بھی حسب معمول حضرت غوث الاعظم کی منقبت اور اپنے پیر و مرشد کی مدح کی ہے۔ غوث الاعظم کی شان مین مین شعر لکھتے ہوئے بھی اپنے پیر و مرشد کی تعریف کی ہے

سب مشائخ کا پیر محی الدین سارے میران کا میر محی الدین
ہے کھڑا جس کی غوثیت کا لوا عرش والا سے تا بہ تخت سرا
ہر مرید اوس کا ہے جہان صفا خاص کر بوالحسن شہ والا

چوتھے رسالے جگ موہن اور پانچوین آرام دل مین حضور اکرم کی ذات گرامی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہے۔ رسالہ راحت جان مین حسب معمول نعت کے بعد منقبت غوث الاعظم اور مدح شیخ ہے ۔ ساتوین رسالے " من دربن ،، مین حضور اکرم کے معجزات کو منظوم کیا گیا ہے۔ یہان نعت کے بعد خلفائے راشدین اور شیخ عبدالقادر جیلانی کی منقبت اور اپنے شیخ کی مدح مین شعر کہے ہین۔ آٹھوین رسالے " من جیون ،، مین بھی مصنف نے اپنی روایت کو قائم رکھا ہے اور حضرت غوث پاک اور اپنے شیخ کی مدح کی ہے۔

ہشت بہشت کا ایک حصہ تحفۃ النساء ہے جس مین بنات رسول حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا ، حضرت زینب ، حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم کی مدح کی گئی ہے۔ اس کے بعد امہات المومنین حضرت خدیجہ ، حضرت عائشہ ، حضرت حفصہ ، حضرت زینب بنت خزیمہ ، حضرت سودہ ، حضرت ام سلمہ حضرت صفہ ام

فاطمہ والدہ ماجدہ حضرت غوث الاعظم ، حضرت غوث الاعظم کی پھوپھی ام محمد عائشہ ، حضرت رابعہ بصریہ حضرت معاذہ ، حضرت شعرانہ ، حضرت عفیرہ ، حضرت فاطمہ خراسانیہ ، حضرت رابعہ اور حضرت حکیمہ کا تذکرہ ہے۔

ہشت بہشت کی ہیئت مثنوی کی ہے۔ اس مین بحرون کا تنوع اور رنگا رنگی موجود ہے۔ آگاہ لکھتے ہین۔

" آٹھون رسالون کو بحر اخرب ہین۔ اول کے چار رسالے چار خرب ہین اور آرام دل مین دو خرب ہین اور راحت جان ایک خرب ہے اور من دربن چار خرب مین اور من جیون ایک خرب ہے،، ص[1]

اس کتاب مین آگاہ نے شاعری نہین کی ہے بلکہ صاف و سادہ زبان مین اپنی بات کہی ہے۔ انہون نے جو واقعات قلم بند کئے ہین وہ معتبر کتابون سے تحقیق کرکے لکھے ہین چنانچہ کہتے ہین

" اگر وہ تمام کتابان تو دیکھیگا یا کسی سے سنیگا تو تجھے قدر ان رسالون کی معلوم ہوگی۔ ص[2]

ص[1] دیباچہ ہشت بہشت ص ۷

ص[2] ایضاً ص ۸

تنقیدی جائزہ

دکن کی معاشرتی اور سماجی صورت حال ظاہر کرتی ہے کہ اس دور میں معاشرے پر مذہب کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ رشد و ہدایت پانے اور راہ مستقیم پر چلنے کے لئے کسی نہ کسی بزرگ دین کے دامن عاطفت سے وابستہ ہونا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس دور کے ایک ممتاز صوفی سید اکبر حسینی کا کہنا کہ جس کا پیر نہیں اس کا دین نہیں اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس صورت حال کے اثرات اس دور کے ادب پر بھی محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ مثنوی اس عہد کی مقبول صنف ادب تھی۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی قصہ یا کوئی اخلاقی مضمون بیان کرنے کے لئے یہ نہایت موثر ذریعہ اظہار ہے۔ چنانچہ مذہب کی تبلیغ اور اخلاقیات کے درس کے لئے مثنویوں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مثنوی کی فارسی روایت میں حمد اور نعت کے بعد خلفائے راشدین خاص طور پر حضرت علی اور آئمہ اہل بیت کی منقبت لکھی جاتی ہے۔ صوفیائے کرام اور پیران عظام کی تعریف میں بھی اشعار لکھے جاتے ہیں اصل کہانی بعد میں شروع ہوتی ہے۔ دکنی مثنوی نگاروں نے بھی اسی روایت کو پیش نظر رکھا ۔ چنانچہ منقبت نگاری کے سلسلے میں تین واضح رجحان سامنے آتے ہیں۔

۱۔ خلفائے راشدین کی مدح

۲۔ حضرت علی اور اہل بیت کی مدح

۳۔ صوفیائے کرام کی مدح

اس رجحان کے پیچھے یہ عقیدہ کارفرما ہے کہ جس کام کو خدا ، رسول اور بزرگان دین کے نام سے شروع کیا جائے اس میں خیر و برکت کا نزول ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر مثنوی گو شاعروں نے اس روایت کو نبھایا ہے اور اس طرح اردو ادب کے دکنی دور میں منقبت نگاری کا ایک بڑا حصہ برکت طلبی کے جذبہ تحریک کی عطا ہے۔

دکنی ادب کا یہ دور ولی دکنی تک آتے آتے تین سو سال کا عرصہ طے کر چکا تھا ۔ اس طویل مدت میں اردو منقبت نگاری نے نہ صرف آغاز اور ارتقا کی منزلیں سر کیں بلکہ مختلف شخصیات کو موضوع بنا کر اور مختلف عروضی ہیئتوں کو استعمال کرکے اس کے امکانات کو بھی واضح کیا ہے۔ چنانچہ

اس دور کے منقبتی ادب کا جائزہ لیں تو درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱) منقبت نگاری کا آغاز اردو زبان کے ساتھ ہی ہوا۔ بعض لوگوں کے نزدیک خواجہ بندہ نواز گیسودراز اردو کے پہلے مصنف ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مروجہ راگوں میں جو جکریاں لکھیں ان میں اپنے پیر و مرشد خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی کی مدح میں اشعار لکھے۔ جدید تحقیق کی روشنی میں اردو کی سب سے پہلی تصنیف نظامی کی مثنوی کدم راؤ، پدم راؤ ہے۔ اس میں حمد اور نعت کے بعد خلفائے راشدین کی مدح میں اشعار ملتے ہیں۔ غرضیکہ قدیم نظریئے سے اتفاق کریں یا جدید تحقیق کو درست مانیں، دونوں صورتوں میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اردو منقبت اردو شاعری کے ساتھ ہی وجود میں آئی اور اس کا نقطۂ آغاز بھی وہی ہے جو اردو شاعری کا ہے۔

۲) خیر طلبی کے علاوہ منقبت نگاروں کا مقصد تبلیغی اور اصلاحی تھا۔ شاعروں نے مذہبی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے خلفائے راشدین، آئمہ اہل بیت اور صوفیائے کرام کی زندگیوں اور ان کے کارناموں کو منظوم کیا۔ شعر چونکہ نثر کی نسبت زیادہ تاثیر رکھتا ہے اس لئے عام لوگوں نے اسے آسانی کے ساتھ قبول کر لیا۔

خواتین معاشرے کا ایک بہت بڑا اور اہم حصہ ہیں۔ محمد باقر آگاہ نے ان کی تعلیم و تربیت کے لئے تحفۃ النساء کے نام سے ایک رسالہ ترتیب دیا جو ہشت بہشت کے ایک حصہ کے طور پر شامل کیا گیا۔ اس میں خواتین اولیاء اللہ کا تذکرہ ہے۔

۳) انسانی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے شاعروں نے اپنی نظموں کے لئے ان راگوں اور راگنیوں کا انتخاب کیا جن سے عوام زیادہ مانوس تھے۔ چنانچہ جکریاں، دوہے اور گیت لکھے گئے جن کا موضوع بزرگان دین کی ذات تھی۔ شیخ باجن اور محمود دریائی کے ہاں اس کی روشن مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ زبان کی تنگ دامانی کے باوجود ان گیتوں میں جذبات کی شدت موجود ہے۔ منقبت نگاری کے فروغ اور بزرگان دین کی محبت کو دلوں میں اتارنے کے لئے ان جکریوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

۴) اس ابتدائی سرمایۂ منقبت نگاری میں اردو زبان کے تقریباً تمام ابتدائی انداز سامنے آتے ہیں۔ دکن، گجرات، گولکنڈہ اور بیجا پور میں ارتقاء کی منزلیں طے کرنے والی تمام ابتدائی صورتیں جو ولی دکنی کے اسلوب میں ضم ہو جاتی ہیں اس دور کی منقبت نگاری میں نظر آتی ہیں۔ ابتدائی سرمایۂ منقبت میں دکنی اور ہندی ذخیرۂ الفاظ کا غلبہ تھا پھر اس میں آہستہ آہستہ فارسی اور عربی

کے الفاظ داخل ہونا شروع ہوتے ہین اور ہندی کے غیرمانوس اور ثقیل الفاظ کا زور کم ہو جاتا ہے۔

۵) مثنوی کے علاوہ اردو شاعری کی دیگر اصناف کو بھی منقبتی مضامین کے لئے استعمال مین لایا گیا۔ چنانچہ قصیدہ، غـزل، رباعی، مخمس، مثمن اور ترجیع بند کی مثالین کلیات قلی قطب شاہ، کلیات ولی اور کلیات شاہی مین دیکھی جا سکتی ہین۔

۶) منقبت نگارون نے اپنے ممدوحین کی تعریف کرتے ہوئے معتدل رویہ اختیار کیا۔ انہون نے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان کی منقبت کے ساتھ ساتھ حضرت علی المرتضٰی اور دیگر اہل بیت کی تعریف مین بھی کمی نہین کی بلکہ یون بھی ہوا کہ خلفائے ثـلاثہ کی مختصر تعریف و توصیف کے بعد شعراؑ نے حضرت علی کی مفصل منقبت لکھی۔ لیکن ایک مخصوص زاویہ نگاہ رکھنے والے شاعرون نے صرف حضرت علی اور اہل بیت ہی کو موضوع بنایا ہے اور ان کے مخالفین پر دشنام کے پتھر بھی پھینکے ہین جس کی واضح مثالین وجہی اور قلی قطب شاہ کے ہان ملتی ہین۔

۷) ولی دکنی کے ساتھ اردو شاعری کا مرکز جنوبی ہند سے شمالی ہند کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔اس وقت تک منقبت راگون کے دائرے سے نکل کر اردو شاعری کے مروجہ اصناف سخن کی صورت مین ڈھل چکی تھی ۔ مثنوی مین اصل موضوع تو کہانی ہوتی تھی۔ حمد، نعت منقبت کی حیثیت ضمنی تھی مگر اب رباعیات اور قصائد وغیرہ بھی لکھے جانے لگے۔ شمالی ہند مین باقاعدہ ارتقا سے پہلے دکن مین منقبت نگاری کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم ہو چکی تھی۔

باب چهارم

دبستان دہلی

۱- شمالی ہند کا سیاسی، معاشرتی اور مذہبی ماحول

۲- سودا - میر - قائم چاندپوری - میرحسن - مصحفی

۳- جوشش عظیم آبادی - غالب - مومن - بہادر شاہ ظفر اور داغ

۴- دبستان دہلی کی منقبت نگاری کا جائزہ

برصغیر مین مسلمانون کا سیاسی انحطاط کیا شروع ھوا ایک ھمہ جہتی زوال نے اس شاندار روایات کی حامل قوم کو دیکھتے ھی دیکھتے خاک مین ملا دیا۔ اس پرآشوب دور مین بھی علماء و مشائخ نے اسلام کی شمع کو روشن رکھا اور اس پرچم کو تھامے رکھا جو صدیون تک برصغیر کی فضاؤن مین لہراتا رہا تھا۔ ان علماء و مشائخ مین امام الھند شاہ ولی اللہ خاص طور پر قابل ذکر ھین جنہون نے اس اخلاقی اور روحانی انحطاط کو جو سیاسی و معاشی زوال کے جلو مین بڑھتا جا رہا تھا روکنے کی لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔

یہ تو نہین کہا جا سکتا کہ انہون نے حالات کی پوری طور پر اصلاح کی" اور جس سیلاب کو عالم گیر جیسا دوراندیش اور مستعد منتظم نہ روک سکا اس کا فوری سدباب ایک مذھبی عالم کس طرح کر سکتا تھا۔ لیکن اس بزرگ کی کوششون سے اتنا ضرور ھوا کہ جب اس سیلاب کے بند ٹوٹے تو جہان مغلون کا تخت و تاج اس سیلاب مین بہہ گیا وھان تسبیح و سجادہ تو سلامت رھے اور سیاسی زوال کے ساتھ قوم کا دینی انحطاط نہ شروع ھو گیا"[1]۔ شاہ ولی اللہ ۱۷۰۳ء مین ایک ایسے گھرانے مین پیدا ھوئے جوعلمی اور دینی شہرت رکھتا تھا۔ان کے والد شاہ عبدالرحیم جید عالم ھونے کے ساتھ ساتھ ایک کامل اور بلندپایہ صوفی بھی تھے اور شاہ ولی اللہ کے علمی ذوق اور دینی شغف مین ان کی تعلیم و تربیت کا بڑا دخل تھا۔ ان کی اعتدال پسند طبیعت اور صلح جو مزاج نے ان کے بیٹے مین بھی غلواور تعصب پیدا نہین ھونے دیا۔ شاہ ولی اللہ نے بہت اعتدال کا راستہ اختیار کیا اور افراط و تفریط سے بچتے رھے۔ ان کے اس انداز فکر و عمل نے انہین مسلمانون کے ھر طبقۂ خیال مین محترم بنا دیا۔

شاہ صاحب علوم معقول و منقول مین کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ دو مرتبہ فریضۂ حج کی ادائیگی کی سعادت حاصل کی اور قیام مدینہ کے دوران حدیث شریف کی سند شیخ ابو طاھر بن ابراھیم مدنی سے حاصل کی۔ انہون نے نہ صرف کلام مجید کا فارسی ترجمہ کیا اور درس حدیث دے کر کتاب و سنت کی وسیع اشاعت کا سامان کیا بلکہ علوم اسلامی کی ترتیب و تنظیم سے ھمارے

---

[1] رود کوثر : شیخ محمد اکرم ص ۳۳۵

لئے ایک بیش بہا علمی خزانہ یادگار بھی چھوڑا اور اختلافی مسائل مین ایک ایسا راستہ اختیار کیا جس پر " صوفی و ملا ، شیعہ و سنی ، حنفی اور حنبلی ، مجددی اور وحدت الوجودی ، معتزلہ اور اشاعرہ متفق ہو سکین"۔[۱]

حج پر جانے سے پہلے شاہ صاحب درس و تدریس مین مصروف رہتے تھے۔ واپسی پر آپ نے یہ شغل کم کر دیا۔ خود حدیث پڑھاتے اور باقی مضامین دوسرے ماہرون کے سپرد کر کے اپنا زیادہ وقت تصنیف و تالیف مین صرف کرتے ۔

مولانا شبلی لکھتے ھین ۔

" ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ انہیں کے زمانے مین مسلمانون مین جو عقلی تنزل پیدا ہوا اس کے لحاظ سے یہ امید نہ تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیون کا تماشا دکھانا تھا کہ آخیر زمانے مین شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیون کے آگے غزالی ، رازی اور ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے"۔[۲]

شاہ ولی اللہ کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ھے۔ اس سے قبل عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان ، بوستان ، سکندر نامہ اور شاہ نامہ وغیرہ تو پڑھتے تھے لیکن قرآن مجید جو ھدایات کا سرچشمہ تھا اس سے ناواقف رہتے تھے۔ پرانے لوگون مین سے اگر کسی نے قرآن مجید پڑھا بھی تو ناظرہ یعنی مفہوم و معنی سمجھے بغیر ۔ شاہ صاحب کے ترجمے سے قرآن فہمی کا رجحان پیدا ہوا نیز اردو اور دوسری زبانون مین ترجمون کے لئے راہ ھموار ہو گئی۔

شاہ ولی اللہ اپنے والد بزگوار شاہ عبدالرحیم کی طرح تصوف کے کسی ایک سلسلہ سے وابستہ نہ تھے بلکہ انہون نے ہر سلسلے کے بزرگون سے فیض حاصل کیا ھے جس طرح آپ مذاھب اربعہ (حنفی۔ شافعی۔ مالکی حنبلی) مین کسی ایک مذھب کے مقلد و پیرو نہ تھے اسی طرح اھل سلوک کے طرق مین سے کسی ایک طریقہ کے پابند نہ تھے۔ بلکہ ہر مذھب اور طریقہ مین جو بات کتاب و سنت کے زیادہ موافق اور انسان کی روحانی اور دینوی اصلاح کے لئے زیادہ مفید دیکھتے اس کو اختیار کرتے۔

پہلے ذکر ہو چکا ھے کہ شاہ صاحب کا راستہ اعتدال کا راستہ تھا۔ ازالۃ الخفا

۱ رود کوثر: شیخ محمد اکرام ص ۳۴۳

۲ علم الکلام اور الکلام ص ۸۷

مین انہون نے ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے جن کی وجہ سے شیعہ سنی اختلافات پیدا ہوئے ہین۔ انہون نے خلفائے راشدہ کے خصائل اور ان کے حق خلافت پر سیرحاصل تبصرہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خلافت کی ترتیب وہی ہونی چاہیئے تھی جو فی الواقع ہوئی لیکن وہ حضرت علی کے فضائل ومناقب کے خاص طور پر معتقد ہین۔

شاہ ولی اللہ کا ایک بڑا اہم کارنامہ شریعت اور طریقت مین ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ اس کام کے لئے وہ بے حد موزون تھے۔ وہ فقہ کے جید عالم تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک کامل صوفی بھی تھے۔ انہون نے اپنے علم اور روحانی تجربات کو تصوف اور فقہ کے اختلاف کو مٹانے کے لئے استعمال کیا جو بعض اہل شریعت اور اہل طریقت نے پیدا کر رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علما‌ٔ کے طبقے مین علوم ظاہری کے حصول کے ساتھ ساتھ روحانی اصلاح کا احساس بھی بیدار ہوا، انہون نے نہ صرف صوفیا اور فقہا کے درمیان تفریق کو ختم کیا بلکہ صوفیا کے اپنے درمیان جو فکری بعد تھا اس کو کم کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس کی نمایان مثال مکتوب مدنی ہے جس مین انہون نے ابن العربی کی وحدت الوجود اور امام ربانی کی وحدت الشہود کو ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے چار بیٹے تھے اور چارون صاحب کمال تھے۔ بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیز تھے جو ۱۷۴۶ء مین تولد ہوئے۔ انہون نے مختلف علوم و فنون مین مہارت حاصل کی اور اپنے والد کے انتقال پر ان کے جانشین ہوئے اور علم حدیث جسے شاہ ولی اللہ نے برصغیر مین از سرنو مرتب کیا تھا اس کا فیض عام کیا۔ برصغیر کے اکثر محدثین کا سلسلۂ اسناد آپ تک اور آپ کے ذریعے سے شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔ آپ نے زیادہ وقت درس و تدریس اور رشد و ہدایت مین صرف کیا اس لئے آپ کو تصنیف و تالیف کا زیادہ وقت نہین ملا۔

دوسرے بیٹے شاہ رفیع الدین تھے جو ۱۷۴۹ء مین پیدا ہوئے۔ علوم مروجہ آپ نے باپ سے حاصل کئے اور حدیث کی سند بھی انہین سے لی۔ زہد و تقوی مین اپنے والد اور بھائی کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ ان کا سب سے اہم کام قرآن مجید کا لفظی اردو ترجمہ ہے۔

شاہ عبدالقادر شاہ ولی اللہ کے تیسرے بیٹے تھے۔ انہون نے بھی ابتدائی تعلیم و

تربیت اپنے والد سے حاصل کی اور فقہ ، حدیث اور تفسیر مین بڑا نام پیدا کیا۔ قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ ان کی خاص یادگار ھے۔

ایس ایم اکرم لکھتے ھین " آج ان ترجموں سے بہتر ترجمے ہو رھے ھین لیکن جب ہم یہ سوچتے ھین کہ یہ ترجمے اس زمانے مین ھوئے جب اردو نثر کی کتابین انگلیون پر گنی جا سکتی تھین اور لوگ اس زبان مین تصنیف و تالیف کرتے ہوئے ھچکچاتے تھے تو ان بزرگون کی سمجھ اور فرض شناسی کی داد دینی پڑتی ھے کہ وہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلے اور تبدیل حالات کے کے ساتھ نئی زبان مین قرآن و مذھب کی اشاعت کی۔" ص۱

شاہ صاحب کے چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی تھے لیکن انہوں اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح شہرت حاصل نہیں ہوئی۔

جن علمائے دین نے تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ مسلمانون مین عسکری روح پھونکنے کا فریضہ بھی سرانجام دیا ان مین سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل دھلوی خاص طور پرقابل ذکر ھین ۔ انہوں نے غیرت ملی سے سرشار ہو کر سکھوں کے خلاف جنگیں لڑین ۔ ان جنگون کا بظاھر مسلمانون کو کوئی فائدہ نہ ھوا لیکن اس سے ان کے سینون مین جذبۂ جہاد بیدار ھوا۔ ملک کی ذھنی فضا کو دینی رنگ دینے مین کامیابی ضرور حاصل ھوئی۔ دلون مین مذھب کی محبت جاگی اور اس سیاسی زوال کے دور مین بھی قوم کے دل و دماغ سے مذھب کی خوشبو کم نہین ھوئی اور اس کا جھنڈا ھمیشہ کی طرح بلند رھا۔

اس دور کے علماء کی دینی خدمات کا ذکر کرتے ھوئے کلب علی خان فائق رام پوری لکھتے ھین " اودھ مین ملا نظام الدین فرنگی محلی اور دلی مین شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کی اولاد نے علوم عقلی اور نقلی کی اشاعت مین جس قدر کوشش کی اس سے برصغیر پاک و ھند کے تمام گوشے منور ھو گئے۔ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم شمع علم روشن کئے ھوئے تھے اور ادھر شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی دونون آفتاب و ماھتاب تھے۔ علماء مذھبی احکام رائج کرنے مین حکومت وقت سے مرعوب نہ ھوئے تھے۔ صوفی عالم تھے اور عالم صوفی۔ علم دین کے مرکز بےشمار تھے جہان

ص۱ رود کوثر ص ۳۹۷

جہان امرا ؑ اور روسا ؑ ہوتے تھے وہین دوچار علما ؑ بھی نظر آتے۔ غازی الدین خان کا مدرسہ دلی مین بڑے مدرسون مین شمار ہوتا تھا ...."صلہ

شاہ فخرالدین دہلوی کا فیضان بھی دہلی مین عام تھا اور عمادالملک جیسا متلون مزاج بھی ان کے زمرۂ مریدین مین شامل تھا۔

علمائے فرنگی محل کی دینی خدمات بھی قابل ستائش ہین۔ فرنگی محل لکھنو کا ایک محلہ تھا۔ وہان ایک فرانسیسی تاجر رہائش پذیر تھا جس کی وجہ سے یہ علاقہ فرنگی محل کہلاتا تھا۔ جب وہ تاجر واپس چلا گیا تو یہ علاقہ سرکاری ملکیت مین چلا گیا۔ اورنگ زیب کے زمانے مین ملا قطب الدین انصاری نے بڑا نام پیدا کیا۔ انصاریون اور عثمانیون مین زمینداری پر جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے مین ملا قطب الدین قتل کر دیئے گئے۔ ان کے صاحب زادے ملا محمد سعید نے اورنگ زیب کی خدمت مین حاضر ہو کر شکایت کی تو فرنگی محل کا علاقہ انھین معافی مین مل گیا۔ ملا قطب الدین کے بیٹون مین سب سے برگزیدہ ملا نظام الدین تھے جن کے نام پر درس نظامی مشہور ہے۔ آپ کی زیادہ تر شہرت درس و تدریس کی وجہ سے ہوئی اور آپ کے مقابلے مین دوسرے علما ؑ کے مدرسے بےرونق ہو گئے ۔ ملا نظام الدین کے کئی بیٹے تھے جن مین سب سے زیادہ شہرت ملا عبدالحی بحرالعلوم نے پائی۔ انھون نے فرنگی محل کو چھوڑ کر مدراس مین جا سکونت اختیار کی۔ رئیس کرناٹک نواب محمد علی خان نے ان کی بڑی قدر کی اور بحرالعلوم کا خطاب دیا اور درس و تدریس کے لئے ایک بڑا مدرسہ تعمیر کرایا۔ جن علمائے فرنگی محل کو خصوصی طور پر شہرت حاصل ہوئی ان مین مولانا عبدالحیؒ قابل ذکر ہین۔

اسی دور کے ایک اور بزرگ مولوی فضل امام خیرآبادی تھے جو دہلی کے صدرالصدور تھے۔ ان کے صاحب زادے مولانا فضل حق خیرآبادی بہت بڑے عالم دین تھے۔ اپنے دور کے کئی نامور شاعرون مثلاً مومن اور غالب وغیرہ سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ ان کا سلسلۂ فیض مولوی عبدالحق خیرآبادی نے جاری رکھا جو علامہ شبلی کے استاد اور کئی کتابون کے مصنف تھے ۔

صلہ مومن ، حالات زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر ص ۲۳

ان علماؑ کے علاوہ بہت سے مشائخ بھی خدمت دین میں مصروف تھے۔ اس دور کے چشتی بزرگوں میں شیخ کلیم اللہ جہان آبادی سربرآوردہ مشائخ میں سے تھے۔ وہ شاہجہان آباد میں پیدا ہوئے ۔ سفر حج کے دوران شیخ یحیی مدنی سے بیعت ہوئے اور واپس آ کر چشتیہ سلسلہ کی اشاعت میں سرگرم ہو گئے۔ شاہ صاحب نے تنزل اور انحطاط کے دور میں احیاؑ ملت اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے جو کوششیں کیں وہ اسلامی ہند کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ وہ حالات کی ناساعدت کو پہچانتے تھے۔ زمانے کی رفتار کو دیکھتے تھے لیکن ہمت نہ ہارتے تھے اور پکار پکار کر کہتے تھے کہ اعلاء کلمۃ الحق میں مصروف رہو اور اپنے جان و مال کو اسی میں صرف کر دو ۔

دہلی کے مشہور خانم بازار میں ان کی خانقاہ تھی۔ خانقاہ کیا تھی علم و معرفت ، رموز و حکمت ، احسان و سلوک کا سرچشمہ تھی۔ ہزاروں تشنگان معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے وہاں آتے تھے۔ شائقین علم و فضل ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونا باعث فخر و مباہات تصور کرتے تھے۔" ط۱۔

شاہ نظام الدین اورنگ آبادی (متوفی ۱۱۴۲ھ) شاہ کلیم اللہ دہلوی کے عزیزترین خلفاؑ میں سے تھے۔ لکھنو کے قریب ایک قصبہ کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی شاہ کلیم اللہ کے علم و فضل اور درس و تدریس کا شہرہ سنا تو علم حاصل کرنے کے ارادے سے دہلی آئے اور آپ کی خدمت میں رہ کر علوم حاصل کئے۔ ظاہری علوم سے فراغت ہوئی تو آپ سے بیعت کی اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے شیخ و مرشد کی توجہ خاص، زہد ریاضت اور مجاہدہ سے تکمیل کے مرتبے تک جا پہنچے اور ہر خاندان کی خلافت سے فیض یاب ہو کر ملک دکن کے صاحب ولایت مقرر ہوئے ط۲ اور وہیں ۱۷۳۰ء میں آسودہ خاک ہوئے ۔

ط۱۔ تاریخ مشائخ چشت =۔ خلیق احمد نظامی =۔ ص ۳۶۸

ط۲۔ مناقب المحبوبین ۔ ترجمہ پروفیسر افتخار چشتی =۔ ص ۱۸۵

شاہ فخرالدین دھلوی (۱۱۲۶ھ - ۱۱۹۹ھ) : شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کے بیٹے تھے۔ محب نبی اور فخرجہان آپ کے القاب تھے۔ ان کا شمار اپنے وقت کے عظیم المرتبت مشائخ مین ہوتا ھے۔ وہ اپنے والد کے مرید اور خلیفہ تھے۔علوم ظاھری و باطنی مین کامل تھے۔ ۱۱۶۵ھ مین دھلی آئے اور کشنڑہ پھلیل مین ایک حویلی کرائے پر لےکر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور روحانی تعلیم و تربیت کے لئے لوگ بیعت بھی ہونے لگے۔ کچھ عرصہ بعد آپ اجمیری دروازہ کےمدرسہ مین منتقل ہو گئے۔ اس مدرسے مین بیٹھ کر آپ نے صرف چند درسی کتابون کو پڑھانے پر اکتفانہین کیا بلکہ حقائق و معارف کے دریا بہا دیئے۔ ص۱

شاہ صاحب کی صحبت مین جادو کی تاثیر تھی۔ جو ان کے پاس آتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا ۔ جس پر نگاہ ڈالتے اسیر ہو جاتا۔ جرائم پیشہ لوگ پناہ تلاش کرنے خانقاہ مین آتے اور ولی بن کر نکلتے۔ جو ان کا سر پھوڑنے آتے وہ اپنا سر پھوڑتے ہوئے جاتے۔ ص۲

شاہ عبدالعزیز سے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ بھی ان کی بہت عزت و تکریم کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنے دیوان مین جا بجا ان سے عقیدت کا اظہار کیا ھے۔ ظفر نے شاہ صاحب کو بچپن مین دیکھا تھا کیونکہ شاہ صاحب کا انتقال ۱۱۹۹ھ مین ہوا اور ظفر کی ولادت ۱۱۸۹ھ مین ہوئی لیکن عقیدت مندی کا یہ عالم ھے کہ بار بار اشعار مین اس کااظہار کرتا ھے۔

اے ظفر، کیا تجھ کو بتلاؤں کہ جو کچھ ہون سو ہون
لیکن اپنے فخر دین کے کفش بردارون مین ہون

جو ھاتھ آئے ظفر خاک پائے فخرالدین
تو مین رکھون اسے آنکھون کی توتیا کے لئے

ظفر اپنی شاعری کو شاہ فخرالدین کی عنایت سمجھتا ھے

ص۱ مناقب المحبوبین ترجمہ پروفیسر افتخار چشتی ص ۱۸۵

ص۲ تاریخ مشائخ چشت = خلیق احمد نظامی ص ۳۹۱

کہتا ہے ظفر جو کچھ اب جوش محبت میں
اے فخر جہان سب وہ تیری ہی عنایت ہے

خلیق احمد نظامی لکھتے ہین :

"جس زمانے مین شاہ فخرالدین اجمیری دروازہ کے مدرسے مین درس و تدریس مین مشغول تھے اور حقائق و معارف کے دریا بہا رہے تھے دھلی مین شاہ ولی‌اللہ کا مدرسہ اپنے پورے عروج پر تھا۔ شاہ فخرالدین کے مدرسے مین تصوف کا رنگ غالب تھا اور سلوک و علم باطن کی طرف زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ فتاوٰی عالمگیری کے مرتب (شاہ عبدالرحیم) کے مدرسہ مین احسان و سلوک کے ساتھ علم ظاہر پر بھی خاص زور تھا اور قرآن و حدیث کی روشنی مین ایک زبردست انقلابی تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ [ص۱]

شاہ فخرالدین نے تین کتابین تصنیف کی ہین - (۱) نظام العقائد
(۲) رسالہ مرجیہ (۳) فخرالحسن

یہ تینون کتابین ان کی علمیت اور محققانہ قابلیت کی آئینہ دار ہین۔ سرسید نے آثار الصنادید مین لکھا ہے۔

" ان کا دیکھنا آپ کی مہارت علمی پر دلیل قاطع اور برہان ساطع ہے"۔ [ص۲]

امراء اور مشاہیر آپ کے مرید اور معتقد تھے۔

سر سیّد لکھتے ہین

" جتنے امراء ذوالاقتدار اور سلطان عہد تھے آپ کی بیعت سے مشرف ہو کر آپ ہی کی خاک در کو وسیلۂ آبرو اور آپ ہی کے غبار آستان کو تاج و عزت و اعتبار سمجھتے تھے [ص۳] شاہی خاندان کو بھی آپ سے بےحد عقیدت و ارادت تھی۔ شاہ عالم بادشاہ کے علاوہ شاہ عالم کی بہن خیرالنساء بیگم بھی آپ کی مرید تھین۔ نواب زینت محل والدہ شاہ عالم نے آپ کی خدمت

ص۱ تاریخ مشائخ چشت = خلیق نظامی ص ۳۷۶
ص۲ باب چہارم ص ۳۲
ص۳ آثارالصنادید ص۳۲

مین ایک رتھ نذر گزرانی تھی۔

شاہ فخرالدین کے بعد ان کے بیٹے غلام قطب الدین متوفی۱۲۳۳ھ) مسند سجادگی پر جلوہ فرما ہوئے۔ وہ اپنے زھد و تقوی کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔ محمد اکبرشاہ اور بہادر شاہ ظفر ان کے حلقہ ارادت مین داخل تھے۔ بہادر شاہ ظفر کہتے ھین ۔

مرید قطب دین ھون، خاکپائے فخر دین ھون مین
اگرچہ شاہ ھون ، ان کا غلام کمترین ھون مین
بہادر شاہ میرا نام ھے مشہد عالم مین
و لیکن اے ظفر ان کا گدائے رہ نشین ھون‌مین

غلام قطب الدین کے ایک ھی فرزند تھے نصیرالدین عرف کالے صاحب ۔ ان کے بارے مین سر سید لکھتے ھین ۔

" اس زمانے مین ایسا نامی گرامی شیخ نہین ھے۔ حضوروالا اور تمام سلاطین و جمیع امراٴ عظام آپ کے نہایت معتقد ھین۔" ص۱

بہادر شاہ ظفر کو ان سے خصوصی عقیدت تھی۔ ان کی مدح مین اس نے کئی شعر کہے ھین ۔

نظام خانۂ فخر جہان تمہین تو ھو
قیام سلسلۂ خاندان تمہین تو ھو
تمہاری قوت باطن سے تقویت ھے مجھے
کہ میرے باعث تاب و توان تمہین تو ھو

شاہ فخرالدین دھلوی کے وہ خلفاٴ جو نامور ہوئے ان مین شاہ نیاز احمد بریلوی ایک اھم نام ھے ۔ وہ ۱۱۷۳ھ مین سرھند کے مقام پر پیدا ہوئے۔ دھلی مین شاہ فخرالدین کی خدمت مین حاضر ھو کر علوم معقول و منقول مین کمال حاصل کیا۔ ان کی ذکاوت و ذھانت سے شاہ فخرالدین

ص۱ آثارالصنادید

بہت متاثر ہوئے اور انہیں اپنا خرقۂ خلافت پہنا کر بریلی مین اقامت پذیر ہونے کی ہدایت فرمائی۔ وہ علم و فضل مین یکتائے زمانہ تھے۔ زہد و تقوی مین ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی بریلی مین ان کی خانقاہ پر عقیدت مندون کا ہجوم رہتا تھا۔ تشنگان معرفت اپنی روحانی پیا س بجھانے کے لئے قریب و دور سےان کی خدمت مین حاضر رہتے تھے۔ شاہ نیاز شعر بھی کہتے تھے - قدرت نے انہیں طبع رسا سے نوازا تھا چنانچہ کہتے ہین -

رکھتے ہین نیاز یہ اہل دل تیرے شعر سننے کا اشتیاق

غزل ایک دوسری اور کہہ تجھے حق نے فکر رسا دیا

سوز و گداز کےعلاوہ نفاست ، سلاست اور روانی ان کے کلام کے خاص جوہر ہین۔ انہین زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ نہایت سنگلاخ زمینون مین بہت ہی بےتکلفی کے ساتھ شعر کہتےہین۔ ۱۲۵۰ ھ مین بریلی مین آپ نے وصال فرمایا۔

سلسلۂ نقشبندیہ مین شاہ سعداللّٰہ گلشن، مرزا مظہرجان جانان اور شاہ غلام علی اس دور کے ممتاز مشائخ مین سے ہین۔ سعداللّٰہ گلشن حضرت مجدد الف ثانی سرہندی کے پوتے شیخ عبدالاحد سرہندی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ وہ برہان پور کے رہنے والے تھے مگر دہلی اس طرح جاکر بسے کہ دہلوی ہو گئے۔ عمدہ شعر کہتے تھے۔ اکثر شعراؑ آپ ہی کے شاگرد تھے۔ ولی دکنی نے بھی آپ سے کسب فیض کیا تھا اور آپ ہی کے کہنے پر اس نے اپنے دیوان کو فارسی دوارین کے طرز پومرتب کیا اور اس مین وہ مضامین باندھے جو فارسی شاعری کے ساتھ مخصوص تھے۔ آپ شاہ ولیاللّٰہ کے ہمعصر تھے اور شاہ صاحب نے انفاس العارفین مین آپ کی زبانی کئی روایات نقل کی ہین۔ آپ کو سیروسیاحت کا بہت شوق تھا اور ایک عرصہ تک احمد آباد گجرات جا کر مقیم رہے۔ وہ تارک الدنیا بزرگ تھے جامع مسجد دہلی مین زیادہ وقت گزارتے تھے۔ ۱۱۳۱ھ مین آپ کی وفات ہوئی۔

مرزا مظہر جان جانان کا شجرۂ نسب حضرت محمد بن حنفیہ کی وساطت سے حضرت علی تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد مرزا جان اورنگ زیب عالمگیر کے منصب دار تھے۔ ۱۶۹۹ء مین پیدا ہوئے اور بادشاہ اورنگ زیب ہی نے ان کا نام جان جانان رکھا۔ آپ کے والد مرزا جان نے آپ کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام کیا۔ قرآن مجید مع تجوید و قرأت پڑھا۔ علوم معقول و منقول علمائے وقت

سے حاصل کئے۔ فن سپہ گری مین مہارت بہم پہنچائی۔ آپ نے جن بزرگون سے روحانی فیض حاصل کیا ان مین سے سید نورمحمد بدایونی اور شیخ الشیوخ محمد عابد سنامی ، خلیفہ شیخ عبدالاحد سرھندی اور حضرت خواجہ محمد زبیر قیوم رابع خاص طور پر قابل ذکر ھین۔

علامہ نور بخش توکلی لکھتے ھین۔

" اللہ تعالیٰ نے حضرت مرزا کو ارشاد و القائے نسبت مین وہ قوت عطا فرمائی تھی کہ آپ کی غائبانہ توجہات سے لوگ دور دراز شہرون مین بیٹھے ترقیات حاصل کرتے تھے۔ جو حالات حاضرین خدمت پر وارد ھوتے ان کو مسافت بعیدہ پر حاصل ھو جاتے"۔

مرزا صاحب زاھد اور متوکل بزرگ تھے۔ دنیا اور اھل دنیا کی پروا نہ کرتے تھے اور دنیادارون کے ھدیے قبول نہ فرماتے۔[1]

مرزا مظہر جان جانان اردو کے ممتاز شاعر بھی تھے۔ انھون نے سب سے پہلے ایہام گوئی کے خلاف احتجاج کیا اور اردو مین " ھندویت ،، کے رجحان کو غالب آنے سے روکا۔ مرزا مظہر جان‌جانان کی اس تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو اپنے ارتقا کی ابتدائی منزل مین فارسی زبان و ادب کے اسالیب سے آشنا ھوئی اور اس کا رشتہ فارسی کے ذریعے مسلمانون کی ثقافتی اور تہذیبی قدرون سے قائم رھا۔

آپ نے غنا پر فقر کو اختیار کیا تھا اور صبروقناعت پسند کرکے تسلیم و رضا کو اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔

۱۷۸۰ء مین آپ گولی لگنے سے واصل بحق ھوئے۔ مرزا صاحب کئی کتابون کے مصنف ھین۔ ان مین سے آپ کے مکتوبات خاص طور پر غور و فکر کے مستحق ھین۔

مرزا مظہر جان جانان کے مریدون مین شاہ غلام علی دھلوی نے بڑا نام پایا۔ وہ خدارسیدہ عارف اور متشرع عالم تھے۔ دھلی مین ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ ان کی خانقاہ شاہ عبدالعزیز کے مدرسے کے مدمقابل سمجھی جاتی تھی۔ طالبان حق دور دراز کے علاقون سے آپ کی خدمت مین حاضر ھوتے اور فیوض و برکات سے دامن بھر کر لوٹتے۔ آپ کی زندگی مین اس قدر فیض آپ سے جاری ھوا کہ

---

[1] تذکرہ مشائخ نقش بند = نوری بکڈپو لاھور = ص ۲۸۸

مشائخ مین سے کم کسی سے جاری ہوا ہوگا۔ ہندوستان کی حدود سے باہر بہت سے ملکون مین آپ کے خلفاءُ پہنچ گئے اور ان سے اشاعت طریقۂ نقش بندیہ ہوئی ۔

۱۲۲۰ھ کو آپ کا وصال ہوا ۔

مغل فرمانروا مذہبی معاملات مین بڑے روادار تھے۔ صفوی خاندان کا بانی شاہ اسماعیل اپنے شیعی رجحانات مین بڑی شدت رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود بابر اس کا دوست تھا ۔ اس کا بیٹا ہمایون جس کو ایران کے بادشاہ طہماسپ کی مدد سے دوبارہ حکومت حاصل ہوئی تھی شیعی روایات کا اپنے باپ سے بھی زیادہ احترام کرتا تھا ۔ اکبر کے عہد مین اس کے اتالیق بیرم خان کے علاوہ کئی عمائدین سلطنت شیعہ اکابرین مین سے تھے اور ایران سے آنے والے امراءُ و علماءُ شعراءُ کا سلسلہ بھی جاری تھا ۔ جہانگیر اور شاہ جہان کی بیگمات شیعہ رجحان رکھتی تھین اور اورنگ زیب ، جس کی مذہبی عصبیت بہت بدنام ہے اس کی شادی شاہ نواز خان صفوی کی بیٹی دلرس بیگم سے ہوئی تھی۔ زیب النساءُ اسی کے بطن سے تھی۔ اس کے متعلق روایت ہے کہ وہ اپنے استاد ملا محمد سعید اشرف مازندرانی سے متاثر ہو کر خود بھی عزاداری کرتی تھی۔[1]

اورنگ زیب کا جانشین بہادر شاہ اول علی الاعلان شیعہ ہو گیا تھا۔ فرخ سیر کے عہد سے قلعہ معلی مین باقاعدہ طور پر تعزیہ رکھا جانے لگا ۔ پھر نادر شاہ کی فوج کے ساتھ یہ عناصر تمام شمالی ہند مین پھیل گئے۔ اس ماحول مین شیعہ روایات کی جڑین اتنی گہری ہوئین کہ آخری مغلیہ تاجدار بہادرشاہ ظفر نے بیماری سے صحت یاب ہو کر لکھنؤ کی درگاہ حضرت عباس مین اپنی منت پوری کی جس کی بدولت اس کے بارے مین مشہور ہو گیا کہ اس نے شیعہ مسلک اختیار کر لیا ہے۔

اس ساری تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت لوگ اپنے مسلک اور عقیدہ کے اظہار مین زیادہ بیباک ہو گئے تھے اور شمالی ہند مین بھی ذکر اہل بیت اور عزاداری

---

[1] رزم نگاران کربلا = ڈاکٹر صفدر حسین ۔ ص ۱۲

حسین کے لئے سازگار ماحول پیدا ہو گیا تھا چنانچہ اردو شاعروں نے دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ مرثیہ اور مدح و منقبت آئمہ اطہار پر بھی توجہ کی اور اردو شاعری کے مذہبی سرمائے میں قابل قدر اضافہ کیا۔

اردو میں منقبت نگاری کا سلسلہ امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے جنہوں نے فارسی کے علاوہ ریختہ میں بھی اپنے پیر و مرشد خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی مدح میں شعر کہے لیکن اس کی واضح ارتقائی صورت دکنی ادب میں ملتی ہے۔ شمالی ہند کے ابتدائی دور میں غزل کو مقبولیت حاصل ہوئی اور زیادہ تر شعراؑ نے اسی صنف میں کمال فن کی داد دی۔ اس کے بعد قصیدے نے سند قبولیت پائی لیکن متقدمین کے طبقۂ اول کے دہلوی شعراؑ کے یہاں اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے، البتہ طبقہ دوم کے شاعروں مثلاً اشرف علی خان فغان، میر تقی میر، قیام الدین قائم، مرزا رفیع سودا وغیرہ نے اس طرف توجہ کی۔ اس وقت دنیاوی فضا پورے طور پر قصیدے کی صنف کے لئے سازگار نہ رہی تھی اور بادشاہ کا دربار اور امراؑ کی مجالس قصیدہ پروری کے بار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں ۔ اسلئے دنیاوی ممدوحوں کے ساتھ ساتھ قصیدہ گویوں نے مذہبی شخصیات کو بھی اپنا ممدوح بنایا اور حمد، نعت اور منقبت میں معرکۃ الاراؑ قصیدے لکھے، ص۱ ان قصیدہ گویوں میں جو شاعر سب سے زیادہ کامیاب نظر آتا ہے وہ مرزا رفیع سودا ہیں۔ ان کے یہاں زور بیان، شکوہ الفاظ، تزئین بندش، مضمون آفرینی، نازک خیالی، بلند پروازی اور جدت طرازی سبھی خصوصیات ہیں جن کا قصیدہ گو شاعر کے یہاں ہونا ضروری خیال کیا جاتاہے۔

سودا (۱۷۱۳ء تا ۱۷۸۱ء) سے پہلے دکنی دور میں قصیدہ نگاری کی روایت موجود تھی۔ قلی قطب شاہ، غواصی، شاہی، نصرتی اور ولی نے قصیدے لکھے ہیں۔ لیکن ان میں خیالات کی رفعت اور الفاظ کا وہ طمطراق نہیں ہے جو سودا کا طرۂ امتیاز ہے اور جو قصیدہ نگاری کا بنیادی وصف ہے۔ تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے جب بھی اردو قصیدہ نگاری پر قلم اٹھایا ہے سودا کا نام سر فہرست رکھا ہے۔ میر نے انہیں ، سرآمدے شعرائے ہندی، لکھا ہے۔ ص۲ میر حسن نے قصیدہ اور

ص۱ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ج ۷ ص ۴۷

ص۲ نکات الشعراؑ ص ۳۲

هجو مین انہین " صاحب یـد بیضا ،، ٹھہرایا ہے۔ [1] مصحفی کا خیال ہے کہ وہ قصیدہ کے " نقاش اول،، [2] ہین اور نواب شیفتـہ کے نزدیک " قصیدہ تو ختم مرزا سودا پر ہوا ،، [3]

مـولانا آزاد کی رائے ہے

" پس اول قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلی درجۂ فصاحت و بلاغت تک پہنچانا ان کا پہلا فخر ہے۔ وہ اس میدان مین فارس کے نامی شہسوارون کے ساتھ عنان در عنان ہی نہین گئے بلکہ اکثر میدانون مین آگے نکل گئے ہین ،، [4]

امـداد امام اثر لکھتے ہین

" اگر سودا نہ ہوتے تو اردو قصیدے کو زیر بحث لانا فضول ہوتا ،، [5]

ان تمام اقتباسات سے سودا کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور قصیدہ گوئی مین ان کا مقام متعین کرنے مین مدد لی جا سکتی ہے۔

قصیدہ گوئی کا آغاز عرب سے ہوا اور ایران کی آب و ہوا نے اسے پروان چڑھایا۔ اردو کی دیگر اصناف سخن کی طرح قصیدہ کی ابتدا بھی فارسی شاعری کے زیراثر ہوئی اور سـودا نےقصیدہ لکھتے وقت فارسی کے قصیدہ گو شاعرون کو سامنے رکھا بلکـہ بعض موقعون پر انہون نے ان کی زمینون مین قصیدے لکھے۔

سـودا کے قصائـد درج ذیل موضوعات پر ہین :

۱۔ مـذهـب : کئی قصیدے سرکار دوعالم، حضرت علی اور دیگر آئمہ کی شان مین ہین۔

۲۔ مدح اهل دول : اپنے سرپرست امرا کی مدح و ستائش مین کئی قصیدے لکھے ہین ۔

۳۔ هجـــــو : هجـو مین چند قصیدے لکھے ہین۔

۴۔ واقعـات : بعض قصائد مین اس عہد کے تاریخی و معاشرتی حالات قلمبند ہوئے ہین۔ [6]

۱۔ چمنستان الشعـراء ، ص ۳۲۸   ۲۔ تـذکـرہ هـنـدی ۱۲۵

۳۔ گلشـن هنـد ص ۱۵۳   ۴۔ آب حیات ـــ ص ۱۵۸

۵۔ کاشف الحقائـق ص ۲۲۸   ۶۔ سودا = شیخ چانـد ص ۱۹۵

اس مقالے میں ہمارا تعلق صرف مذھبی قصائد سے ہے اسلئے دوسری تمام اقسام سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم اپنے آپ کو صرف انہیں تک محدود رکھیں گے۔

سودا کا آبائی مذہب تشیع تھا۔ ننھال بھی امامیہ مسلک سے تعلق رکھتی تھی۔ سودا کے نانا نعمت علی خان عالی مذہب پرستی میں بڑا غلو رکھتے تھے۔ آبائی اور مادری دونوں رشتوں سے سودا پر مذہبی اثرات پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اپنا طریق بھی امامیہ تھا۔ اپنے مذہب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

پنج تن پاک کا تو اپنے تئیں کہیو غلام
تیرے مذہب کی اگر بزم میں تکرار چلے

انہیں مداح علی ہونے پر فخر ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

مداح علی کا ہوں میں سودا شعراء میں
پڑھتے ہیں ملائک مرے اشعار فلک پر

بارہ اماموں کے بارے میں کہتے ہیں۔

ہیں جو والی میرے بارہ در جہان میں سودا
خاک در ان کی سمجھتا ہوں میں زر سے بہتر

سودا اپنے مذہبی عقیدے میں بڑے راسخ تھے۔ شیخ چاند لکھتے ہیں۔

" وہ اپنے عقیدے میں ایسا راسخ اور پختہ تھا کہ اس سے سر مو انحراف نہیں کیا۔ اس کو مذہبی معاملات میں پورا غلو تھا اور مذہبی جوش میں اکثر نقطۂ اعتدال سے ہٹ جاتا تھا اور حد تمکین سے تجاوز کر جاتا تھا۔ دوسروں کے عقائد کی نہایت نازیبا طریقے سے مذمت کرتا تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مولوی ساجد شاہ آبادی کی ہجو میں جو قصیدے کہے ہیں ان سے ان کے مذہبی جوش کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہجو کلام جس کی بنیاد مذہبی اختلاف پر ہے اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس کا مذہبی جوش و خروش تعصب کی حد تک پہنچتا ہے۔ اس تعصب کی جھلکیاں اس کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں۔" [ا]

[ا] سودا = شیخ چاند ص ۱۰۳

اسی مذہبی جوش نے اسے آنحضرت اور آئمہ معصومین کی شان مین قصیدے لکھنے کے لئے متحرک کر دیا۔ یہ قصیدے نہایت عقیدت اور محبت سے لکھے گئے ہین۔ انھون نے ایک ایک قصیدہ آنحضرت کی شان مین لکھا ہے اور دو قصیدون

چہرۂ مہروش ہے ایک ، سنبل مشک فام دو

زخمی مین تیرا ، اور گلستان ہے برابر

مین نعت رسول مقبول اور منقبت حضرت علی کو یک جا کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ چار اور قصیدے جن کی پہلے مصرعے درج ذیل ہین حضرت علی کی مدح مین قلم بند کئے ہین۔

بسان دانۂ روئیدہ ایک بار گرہ

سنگ کو اپنے لئے کرتا ہے پانی آسمان

یارو مہتاب و گل شمع بہم چارون ایک

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل

شیخ چاند نے ایک غیر مطبوعہ قصیدے کی نشاندھی کی ہے جو سودا نے منقبت حضرت علی مین لکھا ہے اس کا مطلع ہے۔

لخت دل بکھرے ہین یون آہ سے تنگام قلق

یہ قصیدہ چوالیس اشعار پر مشتمل ہے۔[1]

ایک قصیدہ حضرت امام حسن کی مدح مین ہے جس کے بیس شعر ہین اور مطلع یہ ہے

ہوا دشت ہررنگ چمن طرب مانوس [2]

یہ قصیدا بھی کلیات سودا مین موجود نہین ہے۔ اس کی نشاندھی بھی شیخ چاند نے کی ہے۔ اس کے بارے مین ڈاکٹر محمود الٰہی رقم طراز ہین ۔

" لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کیے شعبہ مخطوطات مین قصائد مدت و ممنون نام سے ایک قلمی نسخہ ہے جس مین یہی قصیدہ ممنون کے نام سے درج ہے۔ اس مین پچاس شعرہین

---

[1] سودا ۔ شیخ چاند — ص ١٣٣

[2] ایضاً — ص ١٣٣

اور قصیدے مین ممنون کا تخلص بھی درج ھے۔ شیخ چاند نے نامکمل قصیدہ پیش کیا ھے اور یہ قصیدہ مکمل ھے۔ اس مجموعے کا باقی کلام ممنون ھی کا ھے اس لئے کوئی وجہ نہین کہ اس قصیدے کو ممنون کا قصیدہ نہ سمجھا جائے۔ ممنون کے کلیات کے جو قلمی نسخے ملتے ھین ان سے بھی اس کی توثیق ھوتی ھے کہ یہ قصیدہ ممنون کا ھے۔ " ۱ـ

ان قصائد کے علاوہ سودا نے امام حسین ، امام زین العابدین ، امام باقر ، امام جعفر صادق ، امام موسیٰ رضا کاظم ، امام علی موسیٰ رضا ، امام حسن عسکری ، امام مہدی آخرالزمان اور سیدہ فاطمۃ الزھرہ کی مدح مین زوردار قصائد لکھے ھین ۔ ان قصائد کا آغاز اس طرح ھوتا ھے۔

سوائے خاک نہ کھینچوں گا منت و ستار (امام حسین)

ھے پرورش سخن کی مجھے اپنی جان تلک
(امام موسیٰ رضاکاظم)

اگر علوم سے نہ ھو ساتھ فکر روزی کا
(امام علی موسی رضا)

عیب پوشی ھو لباس چرک سے کیا ننگ ھے
(امام حسن عسکری)

کہا مین ایک دن اس سے کہ اے قسم ایجاد
(امام زین العابدین)

مکھڑے سے اپنے زلف کے پردے کو تو اٹھا
(سیدہ فاطمۃ الزھرہ)

فلک بتا دے مجھے اپنے عیش و غم کی طرح
(امام جعفر صادق)

ھزار شکر، گئے وہ خزان کے رنج و الم
(امام باقر)

جون غنچہ آسمان نے مجھے بھر عرض حال
(امام مہدی)

۱ـ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۱۸۶

سودا کے کمال کا جوہر اکثر مذہبی قصیدون مین کھلتا ہے۔ یہان اگرچہ مبالغے کا رنگ غالب ہے مگر پھر بھی ان مین شاعر کے جذبات کی بھرپور آئینہ داری ہوتی ہے۔ " مذہبی قصیدون مین وہ عام طور پر نیکی اور بزرگی ، عدل و انصاف، شجاعت و دلیری ، جود و سخا ، عفو و کرم،علم و فضل اور شرافت اور پاکیزگی کا ذکر کرتے ہین۔ تیغ و تیرکمان اور گھوڑے کے تعریف کرتے ہین۔ وہ اپنے ممدوح و حسین کے ان اوصاف کے بیان مین اتنی انتہا کو پہنچ جاتے ہین کہ ان کا فرق مراتب ملحوظ نہیں رہتا۔ منقبت مین ایک ہی انداز اور ایک ہی طرح کی باتین کرتے ہین۔،، ص[1]

قصیدہ کا آغاز تشبیب سے ہوتا ہے۔ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ایسے موضوعات لائے جائین جو ممدوح کی شخصیت سے مطابقت رکھتے ہون۔ یعنی تشبیب مین جو کچھ کہا جائے وہ موقع محل کے خلاف نہ ہو۔ سودا نے اکثر قصیدون مین اس بات کا خیال رکھا ہے لیکن بعض مقامات پر ان کا قلم بہک گیا ہے مثلاً " حضرت فاطمۃ الزہرہ کی شان مین جو قصیدہ کہا ہے اس مین ان کی عفت و حیا اور عظمت و بزرگی کی توصیف ہے لیکن تشبیب ٹھیٹ عاشقانہ ہے جسے سوئے ادب کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کہتے ہین

" مدح کرتے ہوئے شاعر کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ ممدوح کی کچھ نہ کچھ ذاتی خصوصیات بغیر مبالغے کے پیش کرے تاکہ انفرادیت ابھر سکے۔ سودا نے ایسا نہین کیا ۔ ان کے یہان ایک اچھے انسان کا مخصوص تصور ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو جاگیرداری کے دور مین آئیڈیل ہو سکتا تھا اس کی خصوصیات مین عدل و انصاف، ایمانداری ، فیاضی ، مروت، حلم، نیکی و بزرگی ، خدا ترسی وغیرہ بزرگان دین کی علمیت اور قابلیت کی مدح کر رہے ہون یا کسی بادشاہ یا نواب کی یا امیر کی سودا اس انسان مین یہی خوبیان دیکھتے ہین ۔ چونکہ سودا کی مدح کے مضامین محدود ہین اس لئے ان قصائد مین ایک بزرگ دین اور عام ممدوح مین کوئی نمایان فرق نہین۔،، ص[2]

ص[1] اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۲۲۰

ص[2] مرزا محمد رفیع سودا = انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ص ۲۶۰-۲۶۱

حضرت علی کے عدل و انصاف کی مدح ان الفاظ مین کی گئی ہے

اگر نقصان پر خس کے شرر کا شک ارادہ ہو
گرہ کو آگ کے وہ مین کرے غرق آن کر پانی
پلے ہے آشیان مین باز کے بچہ کبوتـــر کا
شبان نے گرگ کو گلہ کی سونپی ہے نگہبانی

حضرت موسی کاظم کے عدل کی مدح سرائی اس طرح کی ہے

گلچین کی کیا مجال جو توڑے چمن مین پھول
صورت سے گل کے لوٹے ہے باد خزان تلک
بہ جائے ایک خس کبھو ریلے مین موج کے
زنجیر سے بندھا پھرے آب روان تلک

عالمگیر ثانی کی مدح کے اشعار یون ہین

جہان پناہ ترے در گہ عدالت مین
کسی کو دیوے اذیت کوئی معاذ اللہ
جلے جو شام کو پروانہ بزم مین تیری
تو صبح شمع کے آتا ہے سر پہ روز سیاہ

شجاع الدولہ کی بہادری کا ذکر یون ہوتا ہے

تو وہ عادل ہے جہان مین کہ قلمرو مین تیرے
چیونٹی دست تعدی سے نہ ہووے پامال

" یہ اشعار حسن تخیل، زور بیان، حسن تعلیل اور جدت فکر کا بہترین نمونہ ہین مگر ان مین بنیادی خرابی یہ ہے کہ حضرت علیؓ، عالمگیر یا شجاع الدولہ کے مدحیہ اشعار مین کوئی فرق نہین " ۔ ص[۱]

ص[۱] مرزا محمد رفیع سودا = ڈاکٹر خلیق انجم = انجمن ترقی اردو ہند ص ۲۶۳

یہی حال ممدوحین کی دوسری خوبیوں مثلاً شجاعت ، فیاضی ، مروت وغیرہ کا ہے ۔

گھوڑے کی تعریف سودا کے مدحیہ قصیدوں کا اہم جزو ہے۔ ان کے آباؤ اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ ان کی زندگی کا ایک عرصہ فوج کی ملازمت میں گزرا تھا اسلئے وہ گھوڑوں کی چال ڈھال اور رنگ و روپ سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے گھوڑے کی تعریف میں بہت سے شعر کہے ہیں اور اس کی سراپانگاری کی ہے۔ اس کے علاوہ تلوار، تیر، کمان، نیزہ اور پالکی وغیرہ کی تعریف میں شعر کہے ہیں۔ اسلئے " اگر یہ کہا جائے کہ اردو مرثیوں میں جو ان اشیأ کی تعریفیں ملتی ہیں اس کی روایت سودا ہی نے قائم کی تھی تو غلط نہ ہوگا کیونکہ سودا سے قبل اردو مرثیوں میں یہ انداز نہ تھا ،، ص[1]

قصائد کے علاوہ دیگر اصناف شعر میں بھی منقبتی اشعار موجود ہیں۔ مثلاً مثنوی قصہ در عشق پسر شیشہ گر بزرگر پسر،، میں حمد و نعت کے بعد حضرت علی کی مدح یوں کی ہے۔

علی برحق امام رہنما ہے　　　علی ہی جانشین مصطفی ہے

علی ہی شہسوار راہ دین ہے　　　علی مہر نبوت کا نگین ہے

ایک رباعی میں لکھتے ہیں:

مجھ کو ہر چند نہیں شیعہ و سنی سے کام
پر یہ سمجھا ہوں کہ اس دور میں تھے بارہ امام
ان سوا ہو جو کوئی وہ ہے امام تسبیح
اس تلک جانے سے موقوف ہو اللہ کا نام

یہاں سودا نے زور تخیل سے معمولی بات کو ایک انوکھا انداز دیا ہے۔

ذہن کو نفس مضمون تک پہنچانے میں تشبیہیں بڑی مدد کرتی ہیں۔ سودا نے ہر قدم پر تشبیہوں کا سہارا لیا اور اس طرح سینکڑوں نادر اور اچھوتی تشبیہیں اردو شاعری میں داخل ہو گئیں۔ سودا نے اپنے دور کے شاعروں پر گہرا اثر ڈالا۔ مرثیہ گو شعرا پر ان کی قصیدہ نگاری کے واضح اثرات موجود ہیں۔ سودا کے تقریباً تمام مذہبی قصیدے مضمون آفرینی، تشبیہہ و استعارہ ،

ص[1] مرزا محمد رفیع سودا ۔ ڈاکٹر خلیق انجم ص ۲۶۸

بلند پروازی تخیل کا اعلی نمونہ ھین۔" ص[1]

——— میر تقی میر (۱۷۲۲ء تا ۱۸۱۰ء) : غزل میر کے کمال فن کی اصل جولانگاہ ھے۔ انھون نے اپنے ذاتی غم کے ساتھ اجتماعی کرب کو شامل کرکے غزل کو اپنے دور کی نمائندہ بنادیا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی فنی مہارت اور قادرالکلامی سے اسے انتہائی بلندیون سے آشنا کیا۔

جانا نھین کچھ جز غزل آ کر کے جہان مین

کل میرے تصرف مین بھی قطعہ زمین تھا

ان کی شاعری مین ایک دردمند دل کی سچی آواز گونج رھی ھے اور یہ وہ خاص بات ھے جس کی وجہ سے ان کی شاعری کو قبول عام کا درجہ حاصل ھے۔

غزل کے علاوہ میر نے دیگر اصناف سخن مین بھی طبع آزمائی کی ھے۔ انھون نےمثنویان قصیدے، مسدس، مخمس اور ھفت بند بھی لکھے ھین اور مرثیون مین بھی اپنا رنگ طبیعت دکھایا ھے انھون نے سات قصیدے لکھے ھین جن مین دو نواب آصف الدولہ کی تعریف مین، ایک شاہ عالم کی مدح مین اور باقی چار مین سے تین حضرت علی اور امام حسین کی منقبت مین ھے۔ ان کی قصیدہ گوئی کے بارے مین طباطبائی کا کہنا ھے کہ وہ قصیدہ کہنا جانتے ھی نہ تھے۔ ص[2]

نواب شیفتہ نے لکھا ھے

" چندان کہ غزلش بلند مرتبہ تر است ھم چنان قصیدہ اش پست پایہ تر" ص[3]

مولوی عبدالحق رقم طراز ھین۔

" میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے ھین۔ اگرچہ اس مین بھی وہ بند دھین اور تراکیب مین بلندی پائی جاتی ھے مگر حقیقت یہ ھے کہ وہ اس کون کے نھین تھے اور قصیدے لکھنا ان کی طبیعت کی افتاد کے خلاف تھا۔" ص[4]

ان تبصرون سے واضح ھوتا ھے کہ قصیدہ میر کا میدان نھین تھا لیکن وہ ایک پختہ کار اور قادرالکلام شاعر تھے۔ اسلئے انھون نے اس میدان کو خالی چھوڑنا پسند نھین کیا۔ ان کے

ص[1] اردو قصیدہ نگاری کا جائزہ ۔ محمود الٰھی ص ۱۹۱ ص[2] شرح دیوان غالب ص ۹۲

ص[3] تذکرہ گلشن بے خار ص ۲۹۱ ص[4] مقدمہ کلام میر

یہان تشبیب معمولی ھے، گریز کمزور ھے، الفاظ کا شکوہ، خیال کی بلند پروازی، مضامین کی طرفگیجوش اور زوربیان جو قصیدے کے لازمی عناصر ھین میر کے یہان بہت کم ھین۔ اس لئے ان کے قصیدے بلند مرتبہ کے حامل نہین ھین اور اس میدان مین وہ اپنے ھم عصر سودا سے بہت پیچھے ھین۔ اس سلسلے مین مصحفی کہتے ھین ۔ " غـزل اور مثنوی مین میر، سودا سے بہتر ھین۔ لیکن ھجو اور قصیدے مین سودا کو ان پر فضیلت حاصل ھے۔" صا

نواب آصف الدولہ اور شاہ عالم کے قصائد میر کی مجبوری تھے۔ یہ قصائد مالی منفعت کے لئے لکھے گئے ھین۔ لیکن وہ قصائد جو حضرت علی اور امام حسین کی شان مین کہے گئے تھے وہ اھلبیت سے میر کی گہری وابستگی کا اظہار ھین۔ میر نے اس ماحول مین آنکھ کھولی وہ صوفیون اور درویشون سے آباد تھا۔ میر کے والد علی متقی اپنا زیادہ تر وقت ریاضت اور عبادت مین گزارتے تھے۔ ان پر اکثر استغراق کی کیفیت رہتی تھی۔ میر کے منہ بولے چچا سید امان اللہ میر علی متقی کےمریدان خاص اور درویشان باصفا مین شمار ھوتے تھے۔ ان کے ساتھ میر اکثر درویشون کے ساتھ ملنے جایا کرتے تھے گویا درویشی نہ صرف میر کو ورثے مین ملی تھی بلکہ ان کے ماحول نے بھی ان کی طبیعت پر یہ رنگ چڑھادیا تھا۔

حب اھل بیت تمام مسلمانون کا اور خصوصاً درویشون کا اجتماعی مسلک ھے چنانچہ ایک مخمس مین میر نے ولائے اھل بیت کو اپنا شعار بنایا ھے

ھے ولائے اھل بیت اپنا شعـار
جانے ھےاس کے تئین سارا دیـار
زیر لب کہتا ھون مین پراب کی بار
تو سنے جو مین کہون سـب مین پکار

حیدری ھون، حیدری ھون، حیـدری

میر اپنا یہ عقیدہ بھی ظاھر کرتے ھین

ھـم علـی کو خـدا نہین جانا
پـر خـدا سے جـدا نہین جانا

صا بحوالہ نقد میر ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۱۱

لیکن جب وہ نصیری ہونے کا اعلان کرتے ہین تو ان کے عقیدے کا تضاد ظاہر ہوتاھے۔ انہون نے حضرت علی کی شان مین جو قصیدہ لامیہ لکھا ھے اس مین زمانے کے جور و ستم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہین۔

وقت ھے اپنے نصیری کی مدد کر یا شاہ

ایک اور منقبت کا یہ بند ملاحظہ ہو

پہنچے ہین تیرے ہاتھ تلک کب کسو کے دست
کیا سمجھے شیخ حال کو فطرت ھے اس کی پست
ہون جون نصیری ساقیٔ کوثر کا محو و مست
مسکن علی نگر ھے میرا ، مین علی پرست
پیغمبر اس جگہ کا علی ھے، خدا علی

اپنے اس دعوے کے ثبوت مین یہ دلیل لاتے ہین

پایا علی کو جا کے محمدؐ نے اس جگہ
جس جا نہ تھا لگاؤ گمان و خیال کا

یہ اشعار میر کے قلم سے یونہی نہین ٹپک پڑے بلکہ یہ ان کا مسلک اور موقف تھا اور اس کو انہون نے بار بار دہرایا ھے۔

آفتاب فلک عز و علی تو ہی تھا
چہرہ آرائے زمین اور سما تو ہی تھا
جانشینیٔ پیمبر کی سزا تو ہی تھا
قالب خاکی کے پردے مین خدا توہی تھا
یاعلی جو تجھے کہتے ہین بجا کہتے ہین

دنوی امرا کی تعریف مین حد سے گزر جانا ممدوحین کو خوش آتا ھے اور وہ شاعر پر انعام و اکرام کی بارش کرتے ہین لیکن مذہبی شخصیات کے فضائل بیان کرتے ہوئے ان کے مقام اور مرتبے کو فراموش کردینا اور اس طرح حد سے گزرجانا مستحسن نہین ھے بلکہ یہ تو اس کے عقیدے کی خام کاری پر دلالت کرتا ھے۔ بندے کو خدابنا دینا بندے کی تعریف نہین بلکہ اس کی توہین ھے۔ انتہائے بندگی

کا کمال خدا کے سامنے عاجزی و انکساری سے جھکنا ہے خدا بننا نہین ہے۔ لیکن جہان تک قصیدہ نگاری کے فن کا تعلق ہے میر نے اپنے تمام تر فنی کمزوریون کے باوجود (جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) ایسے قصیدے لکھے ہین جن سے سرسری گزر جانا مناسب نہین ہے۔ مولوی عبدالسلام ندوی نے شعرائے ہند مین میر کے قصائد سے بحث کی ہے اور سودا سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

" بایں ہمہ تشبیہات مین جو سادگی اور لطافت سودا کے یہان پائی جاتی ہے وہ ہی میر کے قصائد مین موجود ہے۔ الفاظ کی شوکت اگرچہ ان کے یہان کم ہے تاہم جہان کہین انہون نے زور طبع دکھایا ہے وہان شاندار الفاظ اور باوقار تراکیب کا انبار لگا دیا ہے،، ص[1]

میر کے قصائد کو سامنے رکھ کر خواجہ احمد فاروقی نے یہ نتیجہ نکالا ہے

" ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر قصیدہ گوئی مین ایسے عاجز نہین تھے جیساکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اپنی گرفتہ مزاجی کی وجہ سے انہون نے اپنی اس وصف کی طرف کوئی خاص توجہ نہین کی اور اسی لئے وہ غزلون کے مقابلے مین " پست پایہ تر،، ہین" ص[2]

میر نے جو قصیدہ امام حسین کی منقبت مین لکھا ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائین

امام ہر دو جہان جس کے آستان کی خاک
رکھے ہے رتبہ کحل جواہر الابصار
شعاع روضے کے قبے کی ہے عالمگیر
پھرے گا سایۂ شب اید جہان مین ہوتاخوار
بصانعے کو یہ نقاشیان مین سب اس کی
زمین ہو یا ہو فلک یا حجر ہون یا اشجار
باحمدے کہ نبوت، ہوئی ہے اس پہ ختم
بفاطمہ کہ ہے وہ بنت سید مختار
بمرتضی کہ ولایت سخران نے کی
بہادری ہی غلامون کی جس کے فن و شعار

ص[1] شعرالہند جلد دوم

ص[2] میر تقی میر حیات اور شاعری ص۲۱۵

بہ آن شہید کہ تشنہ لب و شکستہ دل
ہوا ہے دشت بلامین ہین اب تلک آثار
قسم ہے میرے تئین ان تمام قسمون کی
کہ تجھ کو علم ہے ان سب کا کیاکرون مین‌شمار

میر کا دور سیاسی ابتری، اخلاقی بےراہ روی اور معاشی بدحالی کا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے گرد و پیش سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہین۔

یہ آرزو ہے میرے دل مین مدتون سے شہا
رہے نہ بعد مرے ہند مین یہ مشت غبار

مندرجہ بالا اشعار مین سودا جیسا طمطراق نہ سہی پھر بھی انہین پڑھتے ہوئے قاری متاثر ہوتا ہے اور اسے ایک باکمال شاعر کے فن کی جھلکیان یہان دکھائی دیتی ہین۔

کلیات میر[۱] مین حضرت علی کی شان مین آٹھ مخمس، تین مسدس اور ایک ہفت بند بھی ملتا ہے۔ مخمس کی مثالین پہلے دی جا چکی ہین۔ ان کے مسدسون مین زمانے کی صورت حال کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ عام آدمی آلام و مصائب مین گھرا ہوا تھا اور ان سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہین دیتی تھی۔ اس پرآشوب دور مین میر حضرت علی کو امداد کے لئے پکارتے ہین اور ان سے مشکلات کا حل چاہتے ہین۔ کسی شخصیت کو اس کے نام سے پکارنا، پکارنے والے کے ساتھ اس کے قرب کا اظہارکرتا ہے چنانچہ میر ان سے اس انداز مین مخاطب ہوتے ہین۔

جاتی ہے شب تارے گنتے، دن کو پھرتا ہون خراب
کب تلک اس خاکدان مین جو بگولا، پیچ و تاب
دل تڑپتا ہے جدا، جی کو جدا ہے اضطراب
ہر گھڑی تازہ تعب ہر دم نیا ہے اک عذاب
یا علی، یا ایلیا، یا بوالحسن، یا بو تراب
حل مشکل، سرور دین، شافع یوم الحساب

---

[۱] مطبوعہ نول کشور ۱۳۲۵ ھ

ایک مخمس میں عرض مدعا یوں کرتے ھیں -

بے اختیار روؤں ھوں ھر صبح اور شام

یعنی کہ شوق در کا تیرے دل کو ھے تمام

مقصد اسی کو جانوں ھوں سمجھا یہی ھوں کام

اے جد پاک حضرت مولیٰ رضا امام

اپنی تو آرزو ھے یہ آگے تیری رضا

امام حسین سے اعانت کے طلبگار یوں ھوتے ھیں -

ھوا ھوں جور فلک سے نپٹ ھی زار و نزار

پہنچیو یا خلف الصدق حیدر کرار

میر کا " نصیری پن ،، بار بار بھڑک کر اپنا رنگ دکھاتا ھے

دوسری مسدس کا ایک بند ملاحظہ کیجیئے-

پردے میں صدا تھی تیرے داؤد کا الحان

شمہ تھا تیرے چشم کا اک نوح کا طوفان

جان بخش دم عیسیٰ میں تو ھی تھا پنہان

تھا ھاتھ ترا معجزہ موسیٰ و عمران

کیا مدح ھے یہ جو تجھے ھم شاہ کہیں ھیں

سچے ھیں وھی لوگ جو اللہ کہیں ھیں

ھفت بند کے شعر پیش خدمت ھیں -

اے چراغ جلوہ نور خاندان مصطفیٰ

اے میرے والی مرے معبود ھم نام خدا

گاہ احمد ، گہ احد گاھے علی پایا تجھے

ھر زمان میں ھر مکان میں شان تھی تیری جدا

ذات تیری جوں خدا کی ذات ہے والا صفات
بے شریک و بے عدیل و بے نظیر و بے قرین
تو ولی ہے تو وصی ہے تو علی ہے تو وہی
جس سے بالا تر تصور کیجئے تو کچھ نہیں

میر سہل ممتنع کے شاعر ہیں۔ سادگی، سلاست اور روانی ان کے کلام کی بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان کی مذہبی شاعری بھی ان اوصاف سے متصف ہے۔ ان کے ہاں ادق تراکیب او ر غیر مانوس تشبیہات اور ناقابل فہم استعارات نہیں ہیں۔ انہوں نے دوسرے قصیدہ گو شاعروں کی طرح اپنے قصیدوں کو بھی مختلف علوم کی اصطلاحوں سے گراں بار نہیں کیا۔

میر نے اہل بیت کی توصیف کے سلسلے میں حضرت علی اور امام حسین کے گھوڑے اور تلوار کی تعریف بھی کی ہے۔ اس طرح سودا نے مدح اہل بیت میں جس روایت کا آغاز کیا تھا میر نے اسے اور مضبوط بنایا اور آئندہ دور کے مرثیہ نگاروں کے لئے سودا نے جو نقش چھوڑا تھا اس کے رنگ کو مزید گہرا کیا۔

قائم چاندپوری (م ۱۲۱۰ھ) : اس دور کے ہر گو اور قادرالکلام شاعر ہیں تاریخ ادب میں ان کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جس پر میر اور سودا کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ وہ سودا کے شاگرد ہیں۔ اس سے پہلے میر درد کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا مگر ان کے ساتھ زیادہ دیر تک نہ چل سکے۔ میر اور سودا برگد کے گھنے پیڑ تھے۔ ان کے نیچے اگنے والا یہ پودا اپنے وسیع امکانات کے باوجود پوری طرح پھل پھول نہ سکا۔ انہوں نے بہت سی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی کلیات میں غزلوں، رباعیوں اور قطعوں کے علاوہ مخمس مسدس، ترجیع بند، مثنویاں، سلام، مرثیے، واسوخت اور قصیدے موجود ہیں۔ ان کی رباعیات، مراثی اور سلام ان کے مذہبی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قصائد میں انہوں نے زیادہ تو امرا کی تعریف کی ہے۔ ایک قصیدہ اپنے استاد مرزا رفیع سودا کی تعریف میں لکھا ہے۔ ایک قصیدہ " در نعت حضرت سرور کائنات،، اور ایک اور قصیدہ " در منقبت جناب مرتضوی،، کے عنوان سے ان کے کلیات میں موجود ہے

ان کی قصیدہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

" سودا کے شاگرد کی حیثیت سے ان کا سب سے اہم کارنامہ قصیدہ ہونا چاہیئے تھا لیکن یہاں بھی مدح و مبالغہ کا وہ زور اور تخیل اور مضمون آفرینی کی وہ شان نہیں ہے جو سودا کا کمال ہے"۔ ۱

قائم کے یہاں قصیدے کے لوازمات تو موجود ہیں۔ ان کے قصیدے ان کی قادرالکلامی کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن وہ فطری تموج ان کے پاس نہیں ہے جو پڑھنے اور سننے والے کو مسحور کردے انہوں نے جو قصیدہ حضرت علی کی منقبت میں لکھا ہے اکاون اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز فلک کج رفتار کے شکوے سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد خوبصورت گریز ہے

ہے چرخ کون کہ جس سے طلب کرے امداد
وہ شخص ہووے جو مداح حیدر کرار

مدح کا انداز یہ ہے

وہ شاہ جس کے غلاموں سے ایک ادنٰی شخص
اس آسمان کو جو دے پنجۂ غضب سے فشار
تو یہ یقین ہے دل پر کہ جس قدر ہیں نجوم
چوئیں زمین پہ مانند دانہ ہائے انار

اس کے بعد ان کے روضے کی تعریف ہے۔ کرم اور بخشش کا ذکر ہے۔ عدل و انصاف کا بیان ہے۔ شجاعت اور بہادری کی داستان ہے، گھوڑے کی تعریف ہے۔ یہ سب تعریفیں کر چکنے کے باوجود شاعر سمجھتا ہے کہ اس سے مدح کا حق ادا نہیں ہوا۔ آخر میں وہ اس طرح دعا گو ہوتا ہے

بس اب خموش ہو قائم کہ غیر عرض دعا
ہے اس مقام پہ اظہار حال کیا درکار
ہمیشہ فیض سے فصل بہار کے جب تک
جہاں کا قسوم و سرسبز ہو گل و گلزار

---

۱ تاریخ ادب اردو حصہ دوم جلد دوم ص ۷۷۶

سوالیون کے سرون پہ ہو سائبان گل سے
نہ ہو نشیمن اعداد سوئے بستر خار

اگرچہ اس منقبتی قصیدے کی تشبیب ، مدح اور دعا کا مضمون عام قصیدون جیسا هے لیکن الفاظ کی در و بست، تراکیب کی جدت و ندرت اور بیان کی تازہ کاری قائم کی شاعرانہ صلاحیتون کی گواهی دے رهی هے اور "اگر میر اور سودا کو تھوڑی دیر کے لئے نظرانداز کر دیا جائے تو قائم اس دور کے بہترین شاعر قرار دیئے جا سکتے هین،، ۔ ص[1]

مــیرحسن (۱۱۵۳ھ تا ۱۲۰۰ھ) : اردو ادب کے دکنی دور مین مثنوی ایک پسندیدہ صنف سخن تھی اور زیادہ تو شاعرون نے اسی مین اپنا رنگ طبیعت دکھایا هے۔ لیکن اس میدان مین جو شہرت اور عظمت میر حسن کا مقدر تھی وہ کسی دوسرے شاعر کے حصے مین نہین آئی۔ میر حسن کا ذکر کرتے هوئے رام بابو سکسینہ کہتے هین کہ

" کلام نہایت سلیس اور صاف هوتا هے۔ معلوم هوتا هے منہ سے پھول جھڑتے هین۔ غزل رباعی ، مثنوی ، مرثیہ خوب کہتے تھے۔ البتہ قصیدہ زوردار نہ تھا ۔ مثنوی مین کمال حاصل تھا ۔ چنانچہ ان کی مثنوی سحرالبیان معروف بہ مثنوی میر حسن اردو مین اپنا جواب نہین رکھتی۔،، ص[2]

سحر البیان کے علاوہ انہون نے گیارہ مثنویان اور لکھی هین جن کے نام یہ هین۔

۱۔ نقل کاونت ۲۔ نقل زن فاحشہ ۳۔ نقل قصاب
۴۔ نقل قصائی ۵۔ مثنوی شادی آصف الدولہ ۶۔ رموزالعارفین
۷۔ مثنوی هجو حویلی ۸۔ گلزار ارم ۹۔ مثنوی تہنیت عید
۱۰۔ مثنوی در وصف قصر خواهر ۱۱۔ مثنوی خوان نعمت

لیکن فنی مہارت اور صناعی کے اعتبار سے سحرالبیان بےمثال مثنوی هے۔ یون محسوس هوتا هے کہ میرحسن نے دیگر مثنویون مین جو فنی تجربے کئے ان کا بہترین سرمایہ یہان استعمال کیا گیا هے۔

اردو مین دکنی دور سے مثنوی نگاری کی روایت یہ رهی هے کہ شاعر حمد ، نعت اورمنقبت سے مثنوی کا آغاز کرتاهے۔ میر حسن نے اکثر مثنویون مین اس روایت کی پاسداری کی هے۔ مثنوی رموز

ص[1] تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ دوم ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۷۷۷
ص[2] تاریخ ادب اردو ۔ ترجمہ مرزا محمد عسکری ص ۱۲۱

العارفین کا آغاز حمد رب جلیل سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد نعت سید المرسلین ہی میں میر حسن نے منقبت کے چند اشعار لکھے ہیں۔

شافع محشر ہے وہ خیرالبشر　　ہو درود اس پر اور اس کی آل پر
وہ جو پیرو اس کے ہیں اور دوستدار　　چار یار و چار یار و چار یار
ان کا ہوں مداح میں یا ذوالجلال　　پنجتن کے فضل سے کر دے نہال

اکثر مثنوی نگاروں نے رسمی انداز میں منقبت کے شعر کہے ہیں۔ میرحسن نے بھی یہاں محض رسم پوری کی ہے۔ مثنوی گلزار ارم اور مثنوی " وصف قصر خواهر، میں بھی اس رسم کو بطریق احسن نبھایا گیا ہے۔ مثنوی سحرالبیان میرحسن کا شاہکار ہے۔ اس میں انہوں نے حضرت علی کے فضائل بیان کرتے ہوئے تیرہ اشعار کہے ہیں اور زیادہ وضاحت کے ساتھ ان کے اوصاف جمیلہ کو بیان کیا ہے اور پھر پنج تن کا ذکر یوں کیا ہے۔

نبی و علی فاطمہ اور حسن　　حسین ابن حیدر یہ ہیں پنجتن
ہوئی ان پہ دو جگ کی خوبی تمام　　انہوں پر درود اور انہوں پر سلام

آل رسول کی مدح میں چند اور اشعار ملاحظہ کریں

علی سے لگا تابہ مہدی دین　　یہ ہیں ایک نور خدائے حسین
انہوں سے ہے قائم امامت کا گھر　　کہ بارہ ستون ہیں یہ اثنا عشر
صغیرہ کبیرہ سے یہ پاک ہیں　　حساب عمل سے یہ بیباک ہیں
ہوا یاں سے ظاہر کمال رسول　　کہ بہتر ہوئی سب سے آل رسول

اس کے بعد اللہ تعالی کے حضور مناجات ہے۔ اس میں بھی اہل بیت رسول اور اصحاب رسول کا مدحیہ تذکرہ ہے ۔

سلاست، سادگی، روانی اور صفائی میر حسن کے کلام کی بنیادی خوبیاں ہیں۔ یہ شاعری مبالغے سے پاک سچے جذبات کی ترجمان ہے۔ حمد و نعت، منقبت اہل بیت اور مدح صحابہ کے علاوہ مناجات ایسے انداز میں لکھی ہے کہ عابد اور زاہد لوگ اسے وظیفے کے دور پر پڑھتے ہیں اور جھومتے ہیں۔

میر حسن کے کلیات میں سب سے پہلا قصیدہ حضرت علی کی منقبت میں ہے جس میں

باسٹھ اشعار ھین۔ اس کا آغاز اس طرح ھوا ھے۔

نہ ھووے حسن سے اس دو کے ھم عنان مہتاب
کہان وہ پنجۂ خورشید اور کہان مہتاب

ممدوح کی مدح مین کہتے ھین کہ یہ اسی کے طفیل ھے جو ماھتاب، ماھتاب نظر آتا ھے اور اگر اس کا مزید کرم شامل حال ھو جاتا تو آفتاب بھی بن سکتا تھا۔ پھر ان کے عدل وانصاف کا ذکر ھے۔ ان کے گھوڑے کی تعریف ھے اور ان اشعار پر قصیدے کا خاتمہ ھوتا ھے

ھے یہ جب تشین دور ستارگان یا رب
ھے ستارون سے جب تک کہ ھم قران مہتاب
حوالیون کے تیرے چشم و دل رھین روشن
نہ جاوین دیکھنے آنکھون سے دشمنان مہتاب
کہ مستفید رھے اس سے جاودان مہتاب

ایک اور قصیدہ حضرت امام حسن کی منقبت مین ھے۔ اس مین تریسٹھ سعر ھین اورپہلے قصیدے سے زیادہ روان ھے۔ اس کا آغاز یون ھوتا ھے۔

گلشن مین جب سے تو نے رکھا ھے نگار پا
بیٹھی ھے باندھ رنگ سے گل کے بہار پا

ممدوح کی مدح اس انداز مین کرتے ھین

یعنی وہ شہسوار حسن ابن مرتضٰی
ھستی کا جس کےحکم سے ھے برقرار پا
سبط نبی و جان علی، جسم فاطمہ
منبر کا جس کے عرش کے ھے پائیدار پا

اس کے بعد گھوڑے کی تعریف اور پھر "عدل و عدالت،، کا بیان ھے جو بڑی لطافت سے کیا گیا ھے۔

یہ قصیدہ بھی دعائیہ اشعار پر ختم ھوتا ھے۔ دعا مین کوئی ایسی بات نہین ھےجس کا خصوصی ذکر کیا جائے۔ میر حسن قصیدہ نگاری مین کوئی بلندپایہ نہین رکھتے۔ یہان دو قصیدون کا ذکر محض اسلئے کیا گیا ھے کہ ان کی منقبت نگاری کا رخ متعین کیا جا سکے۔

میر حسن نے ایک غزل میں نعت و منقبت کے مضمون کو یکجا کیا ہے

کیونکر خدا نہ بخشے گنہ اس غلام کا

بندہ ہوں میں تو دل سے محمد کے نام کا

نعت کے پانچ شعروں کے بعد منقبت کا مضمون شروع ہوتا ہے اس میں بھی پانچ شعر ہیں۔ دو شعر دیکھیئے ۔

برحق ہے بعد اس کے وصی اس کا مرتضیٰ

حق کو نہ مانے جو کوئی ہے وہ حرام کا

میں دوستدار پنج تن و اہل بیت ہوں

بندہ ہوں جان نثار ہوں بارہ امام کا

قطعے میں کہتے ہیں

گر ہو قبول یہ غزل نعت و منقبت

شہرا جہان میں تب ہو حسن کے کلام کا

منقبت نگاری کے دکنی دور میں مخالفین کے خلاف نفرت کا رجحان بھی تھا بلکہ کچھ لوگ تو گالی گلوچ پر اتر آتے تھے۔ مثلاً وجہی نے کہا

علی کا محب نئیں جسکوئی سچ توں جان

حرامی پنے کا وہی ہے نشان

حسن بھی اسی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں

برحق ہے بعد اس کے وصی اس کا مرتضیٰ

حق کو نہ مانے جو کوئی ہے وہ حرام کا

یہ رویہ تنگ نظری اور تعصب پر مبنی ہے۔ جو کسی صورت بھی مستحسن نہیں ہے۔ میر حسن کی غزل گوئی کا ذکر کرتے ہوئے محمود فاروقی لکھتے ہیں۔

" ان کی غزلیات میں ان کا اپنا طرز، سوز و گداز، زبان کی روانی، شگفتگی، برجستگی اور حلاوت ہے۔ میر کا تغزل، سادگی و پرکاری ہے، سودا کی معنی آفرینی، جرأت کی گھلاوٹ اور معاملہ بندی ہے"۔

ظاہر ہے کہ جس شاعر کے یہاں میر اور سودا کے شعری محاسن جمع ہوں اس کا کلام پست درجے کا نہیں ہو سکتا۔

——— مصحفی (۱۱٦۱ھ تا ۱۲۴۰ھ) : ایک صوفی منش انسان تھے۔ جب تک امروھہ مین رھے انھین شیخ عبداللّٰہ مانی چشتی اور میرعبدالرسول قادری جیسے اکابر بزرگون کی صحبت میسر رھی۔ دھلی گئے تو شاہ فخرالدین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان کے حلقۂ ارادت مین بھی داخل ھو گئے۔ اس بزم عرفان و حقانیت سے انھین جو کچھ حاصل ھوا وہ زندگی بھر ان کے لئے شمع ھدایت بنا رھا۔ انھین شاہ فخرالدین سے کس قدر محبت اور عقیدت تھی اس کا اندازہ اس قصیدے سے ھو سکتا ھے جو شاہ صاحب کی وفات حسرت آیات پر مصحفی نے تحریر کیا۔ شاہ صاحب کا انتقال ۱۱۹۹ھ مین ھوا۔ اس وقت مصحفی کو لکھنؤ آئے ایک سال ھو چکا تھا۔ جس وقت انھین اپنے پیر و مرشد کے انتقال کی خبر ملی ان کے جذبات نظم کی صورت مین ابل پڑے۔ اس قصیدے کی تشبیب حالیہ ھے۔ مصحفی نے نہایت عمدگی سے گریز کرتے ھوئے اپنے رخش قلم کو ممدوح کی مدح کی طرف موڑ دیا ھے۔ اس قصیدے کے پردے مین انھون نے لکھنوی زندگی کے خد و خال واضح کرنے کے علاوہ اپنے شیخ سے بےمثال گرویدگی اور معمورہ دھلی سے اپنی بےپناہ محبت کا اظہار کیا ھے۔

مدح کے چند اشعار دیکھئے

جنید وقت ، فخرالدین محمد مولوی صاحب
جنھون کا آفتاب فیض مجھ پر سایہ گستر ھے

اگر اکسیر کی ترکیب پر قادر ھو تھوڑا سا
نگاہ لطف ان کی نسخۂ کبریت احمر ھے

شہان پیوستہ ان کے آستان پر سر کو رکھتے ھین
کہ خاک آستان ان کی شہان کا زیب افسر ھے

کمالات ان کے مین کس منہ سے یارو بیان کرتا
مری فہمید سے ان کا مقام البتہ برتر ھے

مصحفی نے بہت سے قصائد لکھے ھین۔ ان قصائد کے اشعار کی مجموعی تعداد ۲۷۷۲ بنتی ھے۔[۱] ان کی قصیدہ نگاری پر تبصرہ کرتے ھوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ھین

" قصیدہ کے میدان مین مصحفی بھی صف اول مین ھین اور اس سلسلہ مین ان کا نام

---

[۱] مصحفی ۔ حیات و کلام ۔ افسر صدیقی امروھوی ص ۱۵۱

ملک الشعراء نصرتی، سودا، ذوق، منیر، محسن اور ان کے ہم پلہ شعراء کے ساتھ لینا چاہیئے[ص۱] انہون نے رؤساء اور امراء کے قصیدون کے علاوہ مذہبی قصائد پر بھی خصوصی توجہ کی ہے۔ چنانچہ ان کے کلیات مین نعتیہ قصائد کے علاوہ آٹھ قصیدے حضرت علی مرتضی کی شان مین ھین نیز امام حسن، امام حسین اور امام زین العابدین کی مدح مین ایک ایک قصیدہ موجود ہے۔ جناب علی اکبر کی منقبت مین بھی دو قصیدے ھین۔ شاہ فخرالدین کی مدح مین جو قصیدہ انہون نے لکھا اسکا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ حضرت علی کی شان مین جو قصیدے لکھے گئے ھین ان کے پہلے مصرعے یہ ھین

۱۔ طے کر چکی ھے کیا یہ رہ انتظار چشم

۲۔ صورت مین آپ چرخ مدور بنا گرہ

۳۔ گرمی سے مستفیض ہوا عکس آفتاب

۴۔ ڈھا ہے جیسے کہ میرا یہ قصر ہشیاری

۵۔ ہو چکا دور میر اور مرزا

۶۔ گر فیض سخن ہو چمن آرائے طبیعت

۷۔ روز نو روز کرے کیون نہ دلون کو صیقل

۸۔ ـــــ کیا معنی رنگین کی تلاش (پہلا لفظ پڑھا نہین جا سکا)

ان کے علاوہ مذہبی قصائد کے مصرعہ ھائے اولیٰ یہ ھین

زبس تھی الفت زنار بندان دل مین پنہانی

(امام حسن)

خاک چمن نے رنگ نکالا ھے اب کے سال

(امام حسین)

تھی بسکہ بہر خواب عدم بے قرار چشم

(امام زین العابدین)

ھے بیان قلم فکر کی جاگیر ہوا پر

(حضرت علی اکبر)

ص۱ مصحفی اور ان کا کلام ص ۱۱۸

ستارون سے زیبں سقف فلک ساری مجدر ھے

(حضرت علی اکبر)

حضرت علی المرتضی کی شان مین جو قصائد لکھے گئے ھین ان مین حضرت علی کے علم و فضل ، فقر و استغنا ، بہادری اور شجاعت اور عدل و انصاف کے علاوہ ان کے رخش سبک رفتار اور تیغ آبدار کی تعریف کی گئی ھے۔

امام حسن بارہ امامون مین دوسرے امام ھین انھین زھر دے کر شہید کیا گیا۔ انھون نے اپنی دانش مندی کی وجہ سے مسلمانون کے دو گروھون مین جنگ و قتال کو روکا تھا۔ مصحفی نے ان کی منقبت لکھتے ھوئے ان باتون کا خاص خیال رکھا ھے۔

امام ثانی ، حضرت حسن وہ صاحب دانش

رکھے ھے عقل جس کی درک ، عقل کل پہ رجحانی

----- سبز خالق نے جو بھجوایا تھا احمد کو (پہلا لفظ پڑھا نہین گیا)

اشارہ تھا کہ ھو مسموم دین شیر یزدانی

اس قصیدے مین ستر اشعار ھین۔ امام حسین کی مدح مین جو قصیدہ لکھا گیا ھے اس مین سینتالیس اشعار ھین اور اس مین امام حسین کی شجاعت و بہادری ، فیاضی اور سخاوت کے ذکر کے ساتھ ان کے گھوڑے کی توصیف مین کئی اشعار کہے ھین۔

تیری شجاعت اور سخاوت کے وصف مین

میری زبان تو کیا کہ زبان قلم ھے لا ل

ھے یہ جو ذوالجناح تیرا رخش با وقار

مین لکھ سکون گا اس کی ثنا کیا مری مجال

گیسوئے حور نے اسے جعل المتین کہا

جنت مین لے گئی تھی صبا اوس کی دم کا بال

جس جس جگہ زمین پر اوس کا قدم پڑا

راتون کو جلوہ گر ھوئے وان بدر اور ھلال

امام زین العابدین میدان کربلا مین موجود تھے اور انہون نے امام حسین اور دیگر اہل بیت کی شہادت کو اپنی آنکھون سے دیکھا تھا ۔ ان کے دکھ اور کرب کا کون اندازہ لگاسکتا ہے۔

زین العبا کا وصف لکھ اب اے ---- کہ وہ (لفظ پڑھا نہین گیا)
رکھتا تھا غم مین باپ کے نت اشکبار چشم
گریہ نے اوس کے نوح کا طوفان دکھا دیا
یعقوب کی بھی تھین نہ یہ زار و نزار چشم
اے نائب حسین ذرا اس طرف تو دیکھ
کچھ کچھ رکھی ہے تجھ سے یہ امیدوارچشم

مصحفی نے اپنے مدحیہ قصائد مین اپنے ممدوحین کی انفرادی خصوصیات کو ابھارا ہے۔ ان کا قصیدہ پڑھ کر محسوس ہوتاہے کہ ان کا ممدوح کون ہے۔ یہ ان قصائد کو بہت بڑی خوبی ہے سودا نے اپنی تمام فنی مہارت کے باوجود کسی ممدوح کی ذاتی خوبیون کو اجاگر نہین کیا اس لئے ان کے قصائد مین ایک مذہبی شخصیت اور ایک عام ممدوح مین نمایان فرق محسوس نہین ہوتا ۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مصحفی کو سودا پر فوقیت حاصل ہے۔

فنی لحاظ سے مصحفی کا کلام دور ازکار تشبیہات و استعارات، بعید از قیاس مبالغہ اور غیر فطری بیان سے قطعی مبرّا ہے۔ ان کی بندش چست، الفاظ موزون، تراکیب دلکش اور مضامین ارفع و اعلیٰ ہین ۔ ان کے اشعار مین دوسرے منقبت گو شعرا کی نسبت حقیقت کا رنگ زیادہ نمایان ہے اس لئے ان کا اثر دلون پر زیادہ ہوتا ہے۔ مصحفی نے سنگلاخ زمینون مین مناقب لکھے ہین اور عمدہ شعر نکالے ہین۔ ان کی شیرازہ بند ردیفون نے ان کے حسن کلام مین بڑا اضافہ کیا ہے اور ان کی تشبیہات کی تازگی اور ان کے تخیل کی بلندی نے ان کی شاعری کی ساری فضا کو شگفتہ بنا دیا ہے ۔

ـــــ جوشش عظیم آبادی (۱۱۵۰ھ تا ۱۲۱۶ھ) : باپ کا نام جسونت رائے تھا ۔ بچپن ھی سے اسلام سے رغبت تھی۔ سن تمیز کو پہنچے تو مسلمان ھو گئے۔ عظیم آباد مین گھر گھر شاعری کا چرچا تھا ۔ انھین بھی شاعری کا شوق ھوا اور بہت جلد اپنی خداداد صلاحیتون کی بنا پر عظیم آباد کے مایہ ناز شاعرون مین شمار ھونے لگے۔ ان کا شعری اثاثہ ان کا ایک دیوان ھے جسے قاضی عبدالودود نے ترتیب دے کر شائع کر دیا ھے۔ اس دیوان مین کل پانچ قصائد ھین۔ چار مکمل اور ایک نامکمل ۔ پہلا قصیدہ رائیہ، نعتیہ قصیدہ ھے۔ جوشش نو مسلم تھے۔ اس قصیدے مین ایک نومسلم شاعر کے مذھبی جذبات و احساسات کی عمدہ عکاسی ھے۔ اس مین ۳۵ اشعار ھین اور ھر شعر رسالت مآب سے شاعر کی گہری عقیدت کا اظہارکرتا ھے۔ دوسرا قصیدہ لامیہ حضرت علی کی شان مین ھے۔ اس مین کل چونسٹھ اشعار ھین ۔ تشبیب مین آسمان ستم پیشہ کی شکائتین ھین۔ اس کا مطلع ھے۔

صاف طینت نہ کیا چاھئیے گردون کو خیال
عکس رکھتا ھے یہ ھر ایک سے آئینہ مثال

اس قصیدے کی تشبیب مین جوشش نے کمال یہ کیا ھے کہ ھر برج فلک کی رعایت سے آسمان کی شکایت کا مضمون پیدا کیا ھے۔ اس قصیدے مین شاعر نے گریز مین بھی فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ھے آسمان کی شکایت کرنے کے بعد کہتے ھین کہ جس کی ایسی حرکات و سکنات ھون اس کے افعال کیون رقم کئے جائین اور کیون نہ ایک ایسی شخصیت کی مدح کی جائے جس سے دین کو قوت حاصل ھوتی ھو اور کفر تہ تیغ ھوتا ھو۔ اس کے بعد مدح شروع ھوتی ھے۔ اس مین بھی شاعر نے شاعرانہ کمال کا اظہار کیا ھے۔ چند اشعار ملاحظہ ھون ۔

اے شہا کون و مکان دیکھ تیرا جاہ و جلال   دست بستہ ھین شہ ماضی و مستقبل و حال
آستان پر تیرے ھر آن کرین ھین سجدہ   غوث و قطب و ولیٔ عارف ودا تا ابدال
خوشہ چین خرمن عالی کے ھین ارباب علوم   حکماؑ و علماؑ و فضلاؑ و اھل کمال

تیسرا قصیدہ " قافیہ،، جس مین ۷۸ اشعار ھین وہ بھی حضرت علی کی منقبت مین ھے۔ یہ قصیدہ قادرالکلامی، زور بیان، چستی بندش مین پہلے دونون قصیدون پر فوقیت رکھتا ھے۔ اس قصیدے کا آغاز اخلاقی مضامین سے ھوا ھے۔ پھر کچھ تجربات زندگی نظم کئے ھین۔ اس کے بعد قصیدے کا رخ غزل کی

طرف پھیر دیا ہے۔ غزل کے بعد لکھتے ہیں کہ میں فکر اشعار میں محو تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اندر آنے والا فرشتوں سے مشابہ تھا۔ میں نے پوچھا آپ کون ہیں؟ اس کا جواب شاعر کی زبانی ملاحظہ کیجئے۔

سنتے ہی عرض میری یوں کہا مجھ کو ارشاد   راہ توصیف میں خوبان جہاں کی نہ بھٹک
شعر کہتا ہے تو کچھ شان میں تو ایسے کی   فخر سمجھے ہے ثنا جس کی فلک اور ملک
یعنی وہ حیدرکرار، خدا کا مظہر   فیض سے جس کے ہے معمور سما تا بہ سمک

اردو قصیدہ گوئی میں تشبیب کا یہ ڈرامائی انداز ایک انوکھی بات ہے۔

اس کے بعد مدح کا مضمون شروع ہوتا ہے جس میں روایتی انداز میں حضرت علی کی تعریف کی گئی ہے اور قصیدہ اس شعر پر ختم ہوتا ہے۔

فضل سے تیرے یہ جوشش کو ہے امید قوی
وصف کہتا ہی ہے منہ میں زباں ہے جب تک

چوتھا قصیدہ " نونیہ،، ۶۵ اشعار پر مشتمل ہے اور امام حسن کی منقبت میں لکھا گیا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

عطا کیا ہے مجھے حق نے وہ دل روشن
کہ رشک شمع حرم ہے میان ظلمت تن

تشبیب میں پہلے حمدیہ مضمون ہے۔ پھر عشق حق میں شاعر جن غم و آلام کا شکار رہا ان کا ذکر ہے گریز میں پھر ڈرامائی انداز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رات اسی قسم کے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اپنی فکر سلیم سے بدظن نہ ہو اور پریشان گفتگو چھوڑ، اس کے بعد شاعر کی آنکھ کھل جاتی ہے اور دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ واقعی پریشان گفتگو کو چھوڑ کر زبان خامہ پر اس شخصیت کی تعریف لانا چاہیئے جو سرور سینۂ احمد اور فروغ چشم علی ہے۔ اس کے بعد مدح یوں شروع ہوتی ہے۔

سرور سینۂ احمد، فروغ چشم علی   شہنشۂ دو جہان حضرت امام حسن
وہ ہے گل چمن حسن خلق کیونکر نہ ہو   حریف پیرہن یوسف، اس کا پیرہن
ہے اس کے عہد میں قیدی نہ کوئی دیوانہ   رہے ہے خامۂ زنجیر میں صدا شیون

آخر مین شاعر نے اپنی دلی تمنا کا اظہار یون کیا ہے۔

تیری جناب کرامت مآب سے ہے امید کہ بعد مرے کچھ ایسا سبب ہو قبلۂ من

یہ مشت خاک مری خاک ہند مین نہ رہے اگرچہ ہے یہ مرا زاد بوم اور وطن

اسی دیار مین پامال ہو ترا جوشش ہے جس دیار مین مولا مرے، ترا مدفن

جوشش نے اردو کے مذہبی قصائد کو تشبیب کا نیا انداز دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ طرز تشبیب انہین سے شروع ہوا اور انہین پر ختم ہو گیا۔

جوشش اپنے دور کے قادرالکلام شاعرون مین سے ہین۔ انہون نے سودا کی تقلید مین اور انہین کی زمین مین قصیدے لکھے ہین۔ ان کے یہان مضمون آفرینی اور شوکت الفاظ تو موجود ہے لیکن آمد اور زور بیان کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ عشق حقیقی اور تصوف و اخلاقیات کا رنگ ان کے یہان بہت گہرا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہون نے سودا کے راستے سے ہٹ کر بھی سوچنے کی کوشش کی ہے۔ جوشش کے کلام پر ولی کے قصائد کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ ولی کی طرح انہون نے بھی صرف مذہبی قصیدے لکھے ہین۔ دونون نے اس صنف کو دربار سے الگ رکھا اور اسے صرف مذہبی معتقدات و جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ نعت و منقبت مین انہون نے مبالغہ آرائی سے گریز کیا ہے اور صرف وہی باتین کی ہین جن کا جواز قرآن اور حدیث مین موجود ہے۔ جذبات کا خلوص ان کی قصائد نگاری کا امتیازی وصف ہے۔ وہ اپنے ممدوح کے لئے کلیجہ نکال کر رکھ دینا چاہتے ہین۔ ایک قصیدہ اس طرح اختتام پذیر ہوتا ہے۔

یہ جو بکتا ہون تیرے سامنے مین بیہودہ

اس مری ہرزہ سرائی کا شہا ہے یہ مآل

کہ نہ محتاج ہون عالم مین کس و ناکس کا

ملے تیرے ہی خزانے سے مجھے مال و منال

—— مرزا غالب (١٧٩٧ء تا ١٨٦٩ء) : مرزا غالب اہل بیت نبی کے والا و شیدا تھے چنانچہ حالی یادگار غالب مین لکھتے ہین۔

" انہون نے عبادات و فرائض واجبات مین صرف دو چیزین لے لی تھین۔ ایک توحید وجودی اور

دوسرے نبی اور اہل بیت نبی کی محبت اور وہ اسی کو وسیلۂ نجات سمجھتے تھے،، ص۱

غالب اپنے اس مسلک کا اظہار کھلے بندوں کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے مختلف خطوط میں جو انہوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو لکھے اپنے عقیدے کا ذکر کیا ہے۔

" میں علی کا غلام ہوں اور اولاد علی کا خانہ زاد ،، (بنام حکیم سید احمد حسن مودودی)

" غالب ، اثنا عشری حیدری ،، (بنام غلام حسنین قدر بلگرامی)

" خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام یہی ہے مذہب حق والسلام والا کرم ۔ علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر ،، (بنام مہدی مجروح)

" میں موحد خالص ہوں اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں ۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی، یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی السلام ہے۔ ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام ۔ " برین زیستم ہم برین بگذرم ،،

(بنام نواب علاؤالدین احمد خان)

لیکن غالب کی " شیعیت،، صرف اسی حد تک تھی کہ وہ حضرت علی کو دوسرے صحابہ پر ترجیح دیتے تھے۔ " ان کا امتیاز تبرا نہیں بلکہ تولا ہے یعنی وہ دوسرے صحابہ پر تبرا نہیں کرتے بلکہ حضرت علی سے اپنے تولا و محبت کا شدت سے اظہار کرتے ہیں،، ص۲

حضرت علی سے اپنی گہری جذباتی وابستگی کا اظہار غالب نے قدم قدم پر کیا ہے۔ مثنوی ابرگہربار میں منقبت کے باب میں لکھتے ہیں۔

کہ تا کینہ از مہر بشناختم ... بکس غیر حیدر نہ پرداختم

جوانی برین در بسر کردہ ام ... شبے در خیالش سحر کردہ ام

یعنی جب میں نے ہوش سنبھالا اور کینہ اور محبت کے درمیان فرق کرنا سمجھا اسی دن سے حضرت علی

ص۱ ص ۶۷ مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۳۲ء

ص۲ مالک رام : ذکر غالب ص ۲۶۰

کے سوا کسی دوسرے سے سروکار نہین رکھا۔ اسی کے در پر اپنی جوانی کے دن بسر کئے اور اسی کی یاد مین راتین گزار دین ۔

ان غزلون مین بھی اسی قسم کے کئی اشعار موجود ھین جن سے حضرت علی کی محبت کا اظہار ہوتا ھے۔

-- غالب ندیم دوست سے آتی ھے بوئے دوست
مشغول حق ھون بندگئ بو تراب مین

-- مشکین لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
ناف زمین ھے نہ کہ ناف غزال ھے

-- بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ھے
غلام ساقئ کوثر ھون مجھ کو غم کیا ھے

-- اسد جہان کہ علی بر سر نوازش ھو
کشاد عقدہ دشوار کار آسان ھو

فارسی مین بھی اسی قسم کے بےشمار اشعار مل جاتے ھین ۔

از فنای الشیخ مشہودم فنا فی‌اللہ باد
محو گشتم در علی ۔ دیگر سخن کوتاہ باد

نیست از اسما الہی بر زبانم جز علی
بیخودم پاس محبت بر نتابم پیش ازین

غالب نے فارسی مین چونسٹھ قصیدے لکھے ھین جن مین سے بارہ قصیدے حمد و نعت کے علاوہ حضرت علی، حضرت امام حسین، حضرت عباس علم دار اور حضرت امام مہدی کے متعلق ھین۔ فرط جذبات مین وہ کبھی کبھی نصیریون کے ہم خیال معلوم ہونے لگتے ھین اور میر کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ھین۔

یا رب ز یا علی نہ شناسم ۔ قلندرم
یک مے بہ آبگینہ و ساغر برآ درم
در دل بہ جستجو ھمہ ایزد در آدرم
در زلب بہ گفتگو ھمہ حیدر برآدرم

لیکن اردو مناقب مین انہون نے ایسا نہین کیا۔

اردو مین انہون نے صرف دو منقبتی قصیدے لکھے ہین جو حضرت علی کی مدح مین ہین۔ غالب کی قصیدہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے مسعود حسن خان لکھتے ہین ۔

" قصیدہ اگر عبارت ہے دفتر و روایت سے تو یقیناً ذوق اور مومن کے قصیدے اس معیار پر پورے اترتے ہین۔ لیکن اگر قصیدہ نگاری کے حق کو ایک شاعر کے ماتھون مین دیکھنا ہے تو غالب کے ان چار پانچ قصائد کا مطالعہ کیجئے جو منقبت اور شاہ ظفر کی مدح مین لکھے گئے ہین۔ حرف و صوت کا جو آہنگ ان قصیدون مین ملتا ہے ان سے سودا کا " سنگ رنگ ڈھنگ " تک عاری ہے " ص۱

غالب نے یہ منقبتی قصیدے اپنے شاعری کے ابتدائی دور مین لکھے تھے جب وہ طرز بیدل کی پیروی مین مصروف تھے اسلئے ان قصائد پر فارسی کا رنگ غالب ہے۔

پہلے قصیدے کا مطلع یہ ہے ۔

ساز یک ذرہ نہین فیض چمن سے بیکار

سایہٗ لالہ بے داغ سویدائے بہار

نسخہ حمیدیہ مین یہ قصیدہ ۱۱۰ اشعار پر مشتمل ہے مگر عام نسخون مین صرف ۲۸ اشعار درج ہین باقی اشعار بعد ازان غالب نے منسوخ کر دیئے۔ ص۲

اس قصیدے کی تشبیب بہاریہ ہے اور یہان غالب کا کمال فن پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ انہون نے روایتی انداز مین بہار کی منظر کشی نہین کی بلکہ مضمون آفرینی سے کام لیا ہے اور زور تخیل سے نئے نئے مضمون پیدا کئے ہین ۔ کہتے ہین کہ ہر طرف بہار کا فیض جاری ہے۔ چیتے کی جلد کا سیاہ داغ جام زمرد کی طرح سبز ہو گیا ہے اور چنگاری نارنگی کے ریشے کی طرح تر و تازہ نظر آنے لگی ہے۔ مستیٔ ابر ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ اس لئے میری حیثیت گلچین طرب بن گئی ہے۔ سبزے کی کثرت کی وجہ سے پہاڑ اور جنگل بھی بلبلون سے آباد ہین اور پھولون کی کثرت کی وجہ سے سنسان راہین بھی بیدار ہو گئی ہین۔ اس موسم مین اگر کوئی شخص اپنا ناخن کاٹ دے تو قوت نامیہ کی تاثیر سے وہ

ص۱ پیش لفظ شرح قصائد مومن مرتبہ ظہیر احمد صدیقی

ص۲ تفصیل کے لئے دیکھیئے غالب کا منسوخ دیوان ص ۲۲۲ تا ۲۳۶ مرتبہ مسلم ضیائی ادارہ یادگار غالب کراچی (۱۹۶۹ء)

بھی ھلال کی طرح بڑھتے بڑھتے بدر کامل بن جائے۔ اگر تو میخانے میں اپنی پگڑی بھول جائے تو وہ فیض بہار سے موج گل بن جائے۔

اب حسن گریز ملاحظہ کیجئے۔

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحت شاہ
طوطیٔ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

یہاں سبزۂ کہسار کو طوطی فرض کیا ہے اور کہتے ہیں کہ حضرت علی کی تعریف کے لئے سبزۂ کہسار کے طوطی نے لعل سے سرخ چونچ پیدا کی ہے۔

مدح کے اشعار دیکھئے ۔

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیر سدا
چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار
خاک صحرائے نجف جوہر سیر عرفا
چشم نقش قدم، آئینۂ بخت بیدار
ذرہ اس گرد کا خورشید کا آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرام بہار
ہم عبادت کو تیرا نقش قدم، مہر نماز
ہم ریاضت کو تیرے حوصلے سے استظہار
مدح میں تیری نہاں، زمزمۂ نعت نبی
جام سے تیرے عیاں، بادۂ جوش اسرار

آخر میں حضرت کے دشمنوں کے لئے بددعا ہے۔

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ
خاک در کی تیری جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمن آل نبی کی بطرف خانۂ دھر
عرض خمیازۂ سیلاب ہو طاق دیوار

دوسرا قصیدہ بھی حضرت علی کی مدح مین ھے۔ اس کا مطلع ھے۔

دھر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہین

ہم کہان ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبین

عام نسخون مین اس قصیدے کے ۳۳ اشعار ھین لیکن نسخۂ حمیدیہ مین ۲۷ اشعار دیئے گئے ھین ۔ مطلع بھی مختلف ھے۔

ٹوٹے ھے عجز تنگ حوصلہ پر روئے زمین

سجدہ تمثال وہ آئینہ، کہین جس کو جبین

باقی اشعار غالب کے منسوخ دیوان[۱] مین موجود ھین ۔ اس قصیدہ کی تشبیب مین صوفیانہ مضامین کو فلسفیانہ انداز مین پیش کیا گیا ھے۔ کہتے ھین کہ جسے ہم کائنات کہتے ھین وہ دراصل معشوق حقیقی کی ذات کا جلوہ ھے۔ اگر اسے خودنمائی کا شوق نہ ہوتا تو ہم بھی کائنات موجود نہ ہوتی۔ ہم نے دنیا کا تماشا بیدلی اور بےتوجہی سے کیا ھے اسلئے ھمین نہ عبرت حاصل ہوئی نہ کچھ لطف آیا۔ چونکہ ہماری تمنا بھی بےمقصد تھی اس لئے ھمین نہ دنیا ملی نہ دین ملا۔ معرفت ذات کا دعوی سراسر غلط ھے اور چونکہ ہم حصول ثواب کی خاطر عبادت کرتے ھین اس لئے اس کابھی کوئی ذکر نہین ھے۔ حقیقت یہ ھے کہ دنیادار اور دین دار دونون ھی حقیقت سے بیگانہ ھین۔ لوگ کوہکن کو عاشق صادق خیال کرتے ھین وہ تو اپنے رقیب خسرو کے محل کا ایک مزدور تھا اور کوہ بیستون دراصل شیرین کی تغافل شعاری اور بے اعتنائی کی تصویر تھا۔ اس زمانے مین نہ کسی عاشق کی آہ مین تاثیر ھے اور نہ کسی عاشق کے نالون مین کوئی اثر ھے۔ مین دنیا والون کی گفتگو سن تو لیتا ہون مگر مجھ پر ان کا کوئی اثر مرتب نہین ہوتا۔

غالب کا گریز عام طور پر نہایت جاندار ہوتا ھے اور تشبیب اور مدح کے درمیان ایک مضبوط رابطے کا کام دیتا ھے۔ چنانچہ تشبیب سے گریز کرتے ہوئے کہتے ھین ۔ مین بھی کیسی بیہودہ گفتگو کر رہا ہون جو وقار و تمکین کے بالکل منافی ھے ۔

---

[۱] مرتبہ مسلم ضیائی ص ۲۳۶ تا ۲۴۲

کس قدر هرزه سرا هون که عیاذاً باللہ
یک قلم خارج آداب و وقار و تمکین
نقش لاحول لکھ اے خامۂ ھذیان تحریر
یا علی عرض کر اے فطرت وسواس قرین

اس کے بعد مدح کا مضمون شروع ہوتا ہے۔

مظہر فیض خدا، جان و دل ختم رسل
قبلۂ آل نبی، کعبۂ ایجاد یقین
جلوہ پرواز ہو نقش قدم اس کا جس جا
وہ کف خاک ہے ناموس دو عالم کی امین
نسبت نام سے اس کے ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشت فلک، خم شدہ ناز امین
جان پناہا، دل و جان فیض رسانا، شاہا
وصی ختم رسل تو ہے بفتوائے یقین
جسم اطہر کو ترے، دوش پیمبر، منبر
نام نامی کو ترے، ناصیۂ عرش نگین

تلوار کی تعریف یون کی ہے ۔

برش تیغ کا اس کی ہے جہان مین چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہین

حضرت علی کے کمالات اتنے ہین کہ ان کی مدح کا حق کماحقہ ادا نہین کیا جا سکتا۔

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئین
کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس برین

مدح کے بعد دعا کرتے ہین

دے دعا کو مری وہ مرتبہ حسن قبول

کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار امین

غم شبیر سے ہو سینہ یہان تک لبریز

کہ رہین خون جگر سے مری آنکھین رنگین

طبع کو الفت دلدل مین یہ سرگرمیٔ شوق

کہ جہان تک چلے، اس سے قدم اور مجھ سرجبین

دل الفت نسب و سینۂ توحید فضا

نگۂ جلوہ پرست و نفس صدق گزین

دعا مین بھی محبت اہل بیت واضح ہے۔ غم شبیر مانگتے ہین اور دلدل سے اپنی الفت کااظہار کرتے ہین ۔

غالب کی شاعری کا یہ دور ان کی مشکل پسندی کا دور تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ قصیدے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ بات شاعر کے دل سے نکل رہی ہے۔ اس لئے قاری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہین رہ سکتا۔ غالب کے مناقب مین وہ خصوصیت جو انہین دوسرے شعراؑ کے کلام سے ممتاز کرتی ہے وہ آئمہ اہل بیت سے ان کی والہانہ شیفتگی ہے۔ غزل لکھتے ہوئے وہ انا کے پتلے نظر آتے ہین ۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑین گے ہم اپنی وضع کیون بدلین

سبک سر بن کے کیون پوچھین کہ ہم سے سرگران کیون ہو

لیکن منقبت لکھتے ہوئے وہ سراپا نیاز بن جاتے ہین۔ ان کے ذہن و دل پر خود فراموشی اور خودسردگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اظہار عقیدت مین شخصی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

مرزا سے کسی نے پوچھا " آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟

جواب دیا " ہان،علی ابن ابی طالب سے "

منصور نے اناالحق، کہا تھا مرزا " انا اسداللہ" کا نعرہ بلند کرتے ہین۔

فیض دم انا اسد اللہ بر آدر م

منصور لا رہائی بے دار و بے رسن

غالب حضرت علی کی ذات مین فنا ہونے کے مدعی ہین۔

از فنا فی الشیخ مشہودم فنا فی اللّٰہ باد

محو گشتم در علی دیگر سخن کوتاہ باد

متقدمین کی طرح غالب اپنے کلام منقبت مین قرآن اور حدیث کی طرف اشارے کرتےہین لیکن ان کا اصلی رنگ وہان نکھرتا ہے جہان وہ ذاتی محبت کا اظہار کرتے ہین۔ فارسی قصائد کی طرح ان کے اردو قصائد مین بھی جذبے کا خلوص، پرشکوہ الفاظ کے ساتھ مل کر اثرآفرینی کا سبب بنتا ہے۔

ــــــ مومن خان مومن (۱۸۱۰ء تا ۱۸۵۲ء) : مومن کا دور متضاد کیفیات کا حامل تھا۔ سیاسی اور معاشرتی انحطاط کا یہ دور رندی اور مذہب پسندی کا عجیب امتزاج تھا۔ دنیا کی ہوس اور زندگی سے رس نچوڑ لینے کی خواہش، روحانیت، عرفان اور معرفت کے خیالات کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ مومن اس صورت حال کے بڑے عمدہ نمائندہ ہین۔ ان کے یہان صورت پرستی، رندی، شاہد بازی، عشق و عاشقی کے دوش بدوش ان دینی اور مذہبی تحریکون سے دلچسپی بھی ملتی ہے جن کی بدولت اس زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی مین جولانی کی لہر دوڑ گئی تھی اور جن کے پیش نظر مسلمانون کے سیاسی اقتدار کو بحال کرنا، ان کی معاشی حالت کو سدھارنا، ان کی معاشرتی اورتہذیبی زندگی کو نکھارنا اور اس مقصد کے لئے افراد کے دلون مین ولولہ شوق کی بجلیان بھرنا تھا۔ مومن پر اپنے زمانے کے مذہبی ماحول کے اثرات بڑے گہرے تھے۔ وہ سید احمد بریلوی کی شخصیت سے خاص طور پر متاثر ہوئے اور عمر بھر عقائد مین انہین کے متبع اور پیروکار رہے۔ کلیات مومن مین ایک مثنوی جہادیہ ہے جو اس وقت لکھی گئی جب سید صاحب سکھون کے خلاف جہاد کر رہے تھے۔

دو شعر دیکھیئے ۔

جو سید احمد، امام زمان اہل زمان

کرے ملاحدہ، بے دین سے ارادۂ جنگ

تو کیون نہ صفحۂ عالم پہ لکھے سال دغا

خروج مہدی کفار سوز کلک تفنگ

ایک اور مثنوی میں سید صاحب کی تعریف یوں کی ہے۔

وہ خضر طریق رسول خدا — کہ جو پیرو اس کا ہے سو پیشوا

وہ نور مجسم وہ ظل الہ — کہ سائے سے جس کے فجل مہروماہ

زہے سید احمد قبول خدا — سر امتحان رسول خدا

مومن بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے حسن و عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور ترجمانی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ انہوں نے اپنے مذہبی قصائد میں رنگ تغزل شامل کرکے دونوں رجحانات کی نمائندگی کی ہے۔

قصیدہ عام طور پر امراء کی تعریف میں لکھا جاتا تھا۔ مومن نے امراء کی بیجا تعریف سے اپنا دامن آلودہ نہیں کیا۔ شاعر عموماً قصیدے کے آخر میں اپنے ممدوح سے امداد کا طالب ہوتا تھا مگر مومن نے کسی جگہ بھی خوشی گدایانہ کا اظہار نہیں کیا۔ انہوں نے صرف نو قصیدے لکھے ہیں ایک حمد میں دوسرا نعت میں، چار خلفائے راشدین کی منقبت میں ایک امام حسن کی شان میں اور صرف دو قصیدے انہوں نے امراء کے لئے لکھے جن میں سے ایک نواب ٹونک اور دوسرا راجہ اجیت سنگھ کی تعریف میں ہے لیکن وہ بھی کسی صلے کی امید پر نہیں بلکہ اظہار تشکر کے طور پر۔

ان کے نو قصائد میں سے سات کا مذہبی ہونا ظاہر کرتا ہے کہ بعض دوسرے قصیدہ گو شعراء کی طرح انہوں نے حصول زر کے لئے قصیدہ گوئی اختیار نہیں کی بلکہ قصیدہ گوئی سے ان کی غرض حصول ثواب تھی۔ جیساکہ اس عنوان سے ظاہر ہو رہا ہے جو انہوں نے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے بارے میں لکھے جانے والے قصیدے پر جمایا ہے یعنی

" خطبہ خوانی دل و زبان بہ امید ثواب بہ اثبات خلافت امیرالمومنین عمر بن خطاب "

اور دوسرا مقصد عقیدہ اہل سنت کی مخالفت کرنے والوں پر خلفائے ثلاثہ کی افضلیت بیان کرنا تھا۔

اردو قصیدہ گوئی کا ذکر کرتے ہوئے نیاز فتح پوری لکھتے ہیں ۔

" غزل کی طرح اردو میں قصیدہ گوئی بھی فارسی تقلید تھی اور چونکہ فارسی قصیدہ گوئی کا تعلق شاعری سے اتنا زیادہ نہ تھا جتنا اظہار فضل و کمال سے ۔ اس لئے اردو میں قصیدہ گوئی کا یہی رنگ رہا۔ تاریخی و علمی اصلاحات، دقیق و مشکل الفاظ، تخیل کی بلندی، مضمون آفرینی، زوربیان، مبالغہ و تعلی قصیدہ گوئی کی وہ خصوصیات تھیں جو فارسی میں عام طور پر پائی جاتی تھیں

اور جن کا اردو مین بھی تبتـع کیا گیا" ص۱

مومـن عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ طب و نجوم مین کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ تاریخی اور مذھبی تلمیحات سے آگاہ تھے۔ انھون نے قصائد مین اپنے خام مواد کو بڑے حسن و کمال سے استعمال کیا ھے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کا یہ کہنا درست نہین کہ مومن کے قصائد مین الفاظ و تراکیب کی متانت و جزالت نہین بلکہ بعض قصائد مین غزل کی زبان استعمال ہوئی ھے اس لئے ان کا نام قصیدہ گو شعراؑ کے ساتھ نہین لیا جا سکتا۔ البتہ یہ درست ھے کہ مومن نے قصائد مین غزل کی زبان استعمال کی ھے۔ قصائد مین تغزل کا رنگ بھر کر انھون نے اردو شاعریؔ کو ایک ذائقے سے آشنا کیا ھے۔ بقول عبادت بریلوی

" مومن نے قصیدے مین روایتی انداز اختیار نہین کیا ۔ ان کے قصائد عام قصیدون کے مقابلے مین مختلف نظر آتے ھین اور ان مین ایک نئے رنگ و آھنگ کا احساس ھوتا ھے" ۔ ص۲

قصائد مومن کی تشبیب مین اگرچہ شکوہ الفاظ و تراکیب کی وہ کیفیت نہین ھے جو غـالب اور ذوق کے ھان پائی جاتی ھے تاھم ان مین ندرت اور انوکھا پن موجود ھے۔ ان مین تغزل کا رنـگ نمایان ھے۔ وہ غـزل کے عام موضوع کو لیتے ھین اور اپنے زوربیان سے اسے فـن کا اعلیٰ نمونہ بنا دیتے ھین۔ اگر ھم اس رنگ تـغـزل کو دیکھین تو ھمین یہ کہنے مین کوئی تامل نہین ھونا چاھیئے کہ اس باب مین مومـن کی انـفرادیت نمایان ھے۔

نیاز فتح پوری لکھتے ھین

" قصیدے مین تشبیب خاص چیز ھے اور اس پر تمام شعراؑ نے اپنا زور صرف کیا ھے لیکن عرفی کی طرح یہ خصوصیت مومن ھی کو حاصل ھے کہ اکثر قصائد مین انھون نے تشبیب کو اس کے صحیح معنون مین پیش کیا ھے اور پورا رنگ تغزل اس مین بھر دیا ھے" ص۳

مومن نے جو قصیدہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کی مدح مین لکھا ھے اس مین ۱۲۶ اشعار

ص۱ مومن کے قصائد ۔ مومن نمبر نگار پاکستان

ص۲ مومن اور مطالعۂ مومـن ص ۲۶۳

ص۳ مـومـن کے قصائد ۔ مومن نمبر نگار پاکستان

هین ۔ اس کی بحر بہت سادہ ہے اور نعتیہ قصیدہ کی طرح جس کا قافیہ مانوس ، کوس ، طائوس وغیرہ ہے یہان دقیق قافیہ استعمال نہین کیا ۔ اس کی تشبیب مین شکایت زمانہ اور محبوب کی کج ادائی کا ذکر ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق کی مدح کا انداز یہ ہے

خاکساری پسند ، عرش مقام

آدمی صورت و فرشتہ سیر

کیا گنے خوبیان کوئی اس کی

اک سخاوت شمار سے باھر

جب اولی الفضل منکم ، اے حاسد

اس کے حق مین کہے جہاد اور

افضلیت مین کیا سخن ، یہی بات

سب سے بہتر کہ سب سے ہے بہتر

آخر مین شاعر دعا کرتا ہے۔ یہ وھی روایتی انداز ہے جو عام قصیدہ گو شاعرون کے ہان پایا جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دنیوی امرأ کی شان مین لکھے جانے والے قصائد مین اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ممدوح کی درازی عمر اور اس کے مال و منال مین اضافے کی دعا کی جاتی ہے۔ مذھبی قصائد مین ممدوح کے پیروکارون کے لئے نیک خواھشات کا اظہار کیا جاتا ہے اور ان کے مخالفون کے لئے بددعا کی جاتی ہے۔

تیرے احباب نیک بخت مدام

تیرے اعدا ھمیشہ فال اختر

تیرے حاسد ھین غول صحرائی

تیرے پیرو ھون پیشوائے خضر

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کی شان مین جو منقبت لکھی گئی ہے اس مین ٧٥ اشعار ھین۔ اس کا آغاز یون ھوتا ہے۔

جو اس کی زلف کو دون اپنے عقدہ مشکل

جو اس کی زلف کو دون اپنے عقدہ مشکل

تو بوالہوس کا بھی ہرگز نہ کبھی چھوٹے دل

مدح کا انداز یہ ھے

امام اھل یقین شہر یار کشور عدل

امیر لشکر دین و مبارز مقبل

بڑھا یہ پایہ الہام رائے صائب سے

کہ مشورت پہ ہوئی اس کے وحی بھی نازل

یقین کہ راھنمائی ھے پیروی اس کی

نہیں تو سائے سے کیون بھاگتا ھے دیو مضل

ان کی خلافت کا جواز یہ پیش کرتے ھین۔

معاندو، جو کہا خاتم رسالت نے

کہ میرےبعد نبوت کے تھا عمر قابل

یہی خلافت راشدکی اس کو بس ھے دلیل

یہی امامت برحق کی اس کی بس ھے سجل

مومن ممدوح سے لطف و کرم کے طالب بھی ہوتے ھین لیکن یہ دنیوی لطف و کرم نہین ھے

وھان صلہ مین نعیم جنان کی ھے امید

اگر ھو لطف تیرا میرے حال کا شامل

اور اس کے بعد روایتی انداز مین اس منقبتی قصیدے کا اختتام ھوتا ھے۔

خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی کے مدح مین جو قصیدہ لکھا ھے اس مین ۱۲۰ اشعار ھین

اس کا مطلع ھے

ھے یہی حسرت دیدار تو مرنا دشوار

دم شماری کی مری عمر ھے تا روز شمار

مدح کا رنگ ملاحظہ فرمائین

قلزم جود کا وہ جوش کہ پانی پانی

قلزم جود کا وہ جوش کہ پانی پانی
آگے خط ہائے کف دست کے موج انہار
" بہتررومہ ،، کی حکایت مین کہا رضوان نے
سلسبیل اس کے ہےدریائے سخاوت کا کنار
شرط ایمان ہے پیمان خلافت اس کا
وہ مسلمان ہے کیا جس کو ہو اس مین انکار
قصہ " بیت رضوان ،، مین اشارہ ھی یہی
ورنہ کوئی نہین ہم دست رسول مختار

مومن کو اپنی صلاحیتون کا احساس تھا مگر زمانے نے ان کی قدر نہ کی۔ اس صورت حال کا اظہار یون کرتے ھین ۔

موشگافی کی بہت شعر مین پر فائدہ کیا
ہے وہی دست تہی ، شانۂ دست ادبار
نہ صلہ مدح کا پایا ، نہ غزل کا انعام
ہائے ناکامی یاقوت و لب لعل نگار
در نایاب تو کیا خاک سے بھی منہ نہ بھرے
جس کے در پر مین کرون لولوے شاداب نثار

اپنی محرومیون کے اظہار کے بعد کہتے ھین کہ نالہ و فغان سے کچھ حاصل نہین ہے۔ فلک ناھنجار کبھی راہ پر نہین آ سکتا۔ قبولیت کا وقت آ رہا ہے تو اپنی رام کہانی چھوڑو اور اپنےمدوح کے لئے دعا مانگو

تیرے احباب رہین تکیہ زن مسند عیش
تیرے حساد ہون آوارۂ دشت ادبار

جو قصیدہ خلیفہ رابع حضرت‌علی کی شان مین ہے اس کے ۵۹ اشعار ھین۔ اس کا مطلع ہے

کشتی ہے مری تیغ زبان سے زبان تیغ
کیونکر سخن فروش ہون سوداگران تیغ

مدحیہ اشعار دیکھیئے -

آتی ہے لب پہ مدح خداوند ذوالفقار
لے جاؤ منکران کے لئے ارمغان تیغ

شیر خدا علی کہ شجاعت سے جس کی ہے
سر پنجہ اسد پہ زنج زن بنا تیغ

سیف و قلم ہین دونون ستون کافی دین کے
حیران ہون بابعلم کہون یا جہان تیغ

غازی بھی تو شہید بھی تو تیرے دم سےہے
سرگرم جلوہ فصل بہار و خزان تیغ

اور اس کے بعد روایتی اختتام آتا ہے

تاج ظفر ہو زیب وہ فرق دوستان
اعدا کا سر رہے تہ بار گران تیغ

ایک قصیدہ امام حسن کی مدح مین ہے اس مین ۱۷ شعر ہین۔ اس کا مطلع یہ ہے

چاہتا خلق کو صہبا د ضنم سے محروم
ایسی نیت پہ بہشت آپ کو واعظ معلوم

مدحیہ اشعار ملاحظہ فرمائیے

افضل الناس حسن ابن علی سبط نبی
سید و سرور و مولا و مطاع و مخدوم

ابر بازندہ دانش ، گہر فیض کمال
قلزم حسن عمل ، منبع دریائے علوم

شبہ کیا عصمت لخت جگر احمد مین
جب مسلم ہوگہ معصوم ہے جزو معصوم

آج کہ دے تیرے قاتل کی سزا ، داور حشر
تو عجب کیا ہے کہ جاتی رہے تاثیر سموم

مدد غیب پہ کی، لشکر مغلوب سے صلح
کہ مسلمان نہ ہوں معتقد طالع شوم

آخری دعائیہ شعر اسی روایتی انداز کا ہے

تیرے احباب مطاع اور تواب‌ع رہیں شاد
تیرے حساد خراب اور تیرے اعدا مغموم

ان مثالوں سے مومن کی قصیدہ نگاری پر مجموعی لحاظ سے روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ ان کے تمام قصیدوں میں تشبیب کی یکسانیت کے باوجود انداز بیان کا حسن موجود ہے اور غزل کا لوچ اور گھلاوٹ بھی۔ اردو قصیدہ نگاری میں یہ ایک نیا تجربہ ہے جس سے مومن بڑی کامیابی سے گزرے ہیں۔ بعض نقادوں[1] کو مومن کا یہ تجربہ پسند نہیں آیا اور انہوں نے بطور قصیدہ گو شاعروں کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مومن نے چونکہ امراء کی شان میں قصیدے نہیں لکھے، انہوں نے غلو اور مبالغے سے کام لیتے ہوئے اپنے ممدوح کو مافوق الفطرت شخصیت بنا کر پیش نہیں کیا، انہوں نے چیونٹی کو ہاتھی اور ذرے کو آفتاب نہیں بنایا وہ روایتی انداز کے قصیدہ گو نہیں ہیں۔ ان کی زبان میں سلاست ہے، روانی ہے، متانت ہے لیکن وہ طمطراق اور بلند آہنگی نہیں ہے جسے قصیدے کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔ ان کے ہاں بول چال کا لہجہ ہے جو کبھی بلند اور کبھی دھیما ہو جاتا ہے۔

مدح کے میدان میں مومن کا قلم موتی بکھیرتا ہے۔ وہ روایتی طرز کے مداح نہیں ہیں ۔ وہ اپنے ممدوح کی وہی خوبیاں بیان کرتے ہیں جن سے وہ واقعی متصف ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مذہبی شخصیات کے بارے میں مبالغہ بھی جائز ہے کیونکہ عقیدت غلو اور اغراق کو برداشت کر لیتی ہے لیکن مومن نے خلیفہ راشدین اور حضرت امام حسن کا ذکر کرتے ہوئے بھی غلو اور اغراق سے دامن بچائے رکھا ہے۔ وہ خلیفہ اول کا ذکر کرتے ہوئے ان کی سخاوت کا خلیفہ دوم کے عدل و انصاف کا، خلیفہ سوم کی حیا اور بہتر رویہ و بیعت رضوان کے واقعہ کا اور خلیفہ چہارم کی بہادری اور ان کے علم و فضل کا تذکرہ

ص[1] عبدالسلام ندوی کی رائے ہے کہ مومن نے غزل کی زبان استعمال کی ہے اسلئے ان کا نام قصیدہ گو شاعروں کے ساتھ نہیں لیا جا سکتا۔

ص[2] اصول انتقاد ادبیات ۔ عابد علی عابد ص ۲۵۷

کرتے ہیں۔ ان بزرگوں کے بارے میں وہ ان خصوصیات کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے جن کا ذکر قرآن اور حدیث میں آیا ہے۔ مومن کا کمال یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں اصحاب رسول کی مدح میں بھی ثنائے رسول کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے وہ حمد بھی لکھیں تو ثنائے رسول کو نہیں بھولتے۔ مومن بلندپایہ شاعر ہیں لیکن شریعت کی حدبندیوں کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ سید امتیاز احمد لکھتے ہیں کہ

"مومن نے شریعت اور شاعری دونوں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا،، ص[1]

مذہبی قصیدہ نگاری کے مقصد کا ذکر کرتے ہوئے سید امداد امام اثر کہتے ہیں کہ

جاننا چاہیئے کہ قصیدہ کی اصل یہ ہے کہ شاعری کے پیرایہ میں مسائل اخلاق و معاشرت و تمدن و معاش و معاد وغیرہ کی تعلیم دینی و دنیوی نصیب ہو یا حمد خدا و نعت محمد مصطفی اور منقبت علی المرتضی و ائمہ باصفا سے شاعر کو ثواب عقبی حاصل ہو اور سامعین کو ذکر خدا و رسول و ائمہ سے توفیق عبادت پیدا ہو۔ ص[2]

اگر حمد خدا، نعت رسول اور منقبت علی المرتضی و ائمہ و بزرگان دین ہی تقاضائے قصیدہ گوئی ٹھہرے تو شاید ہی کوئی شاعر مومن سے زیادہ کامیاب ہوا ہو۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ قصیدے اردو قصیدے کی روایت میں خوبصورت اضافہ ہیں ۔

—— بہادر شاہ ظفر (۱۷۷۵ء تا ۱۸۶۲ء) : بہادر شاہ ظفر کی زندگی محرومیوں اور نارسائیوں کی المیہ کہانی ہے۔ وہ بظاہر شاہی تخت پر متمکن تھا لیکن اندر سے ٹوٹا ہوا انسان تھا۔ وہ فرمان روائے اقلیم ہند تھا لیکن دور شہزادگی سے لے کر آخری سانس تک آفات و مصائب ہی اس کا مقدر تھے۔ جب انسان کو مایوسیوں اور ناکامیوں کی آندھیاں گھیر لیتی ہیں تو مذہب اسے ایک مضبوط پناہ گاہ فراہم کرتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی کیفیت بھی یہی تھی۔ اس کے اوقات کا بڑا حصہ اوراد و وظائف میں صرف ہوتا تھا۔ سجادہ و مصلی اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ اس سے اس کا دل رنجور

ص[1] مضمون حکیم مومن خان مومن اور ان کی شاعری ; مطبوعہ مومن نمبر نگار پاکستان

ص[2] کاشف الحقائق جلد دوم ص ۱۹۶

تسکین پاتا تھا۔ تن کی دنیا تو مٹ گئی مگر من کی دنیا ناقابل تسخیر تھی۔ یہان نہ ملکہ وکٹوریہ کا گزر تھا نہ لارڈ کیننگ کا۔ اس دنیا مین سکون تھا، عافیت تھی، آسودگی تھی۔

مذہبی معاملات مین وہ بڑا خوش عقیدہ تھا اور جن مذہبی تقریبات مین وہ حصہ لیتا تھا ان کی مذہبی اور شرعی حیثیت کے بارے مین بھی غور نہین کرتا تھا۔ آخری چھارشنبہ حضرت علی کا دسترخوان، غوث پاک کی نیاز وغیرہ رسومات مین بڑے اہتمام سے شرکت کرتا تھا۔ وہ مشائخ کی درگاہون پر حاضری دیتا تھا۔ اسی طرح مرحوم و مغفور مشائخ کے مزارات پر جوش ارادت سے سرشار ہو کر جاتا۔ زرپاشی کرتا، فاتحہ پڑھتا اور نذر و نیاز پیش کرتا۔ حضرت شاہ فخرالدین کے خاندان سے بہادر شاہ ظفر کو بڑی عقیدت تھی۔ لال قلعہ کے اکثر لوگ ان کے حلقہ ارادت سے وابستہ تھے۔ اس نے بچپن مین ان کو دیکھا تھا۔ لیکن عقیدت کا نقش اتنا گہرا تھا کہ زندگی بھر نہ مٹ سکا۔ شاہ فخرالدین کے سجادہ نشین شاہ غلام قطب الدین تھے۔ ان سے بھی وہ دلی ارادت رکھتا تھا بلکہ ان کی بیعت بھی تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ظفر نے ان کے صاحب زادے اور سجادہ نشین غلام نصیرالدین عرف کالے میان سے تجدید بیعت کی تھی۔ حضرت کالے میان سے اسے والہانہ عقیدت تھی۔ وہ ان کی بارگاہ مین ایک خادم کی طرح حاضر ہوتا تھا اور ان کی خدمت مین گران بہا تحائف پیش کرتا تھا۔ اس کی عقیدت و ارادت کا ایک واقعہ قلعہ کی خاتون نے یون بیان کیا ہے۔

" ایک دفعہ بادشاہ سلامت حضرت سے کچھ رنجیدہ ہو گئے۔ حضرت کو کیا پڑی تھی جو لال قلعہ جاتے۔ مگر بادشاہ سلامت بھی بادشاہت کے گھمنڈ مین سلام کے لئے حضرت کی حویلی مین کئی دن تک حاضر نہ ہوئے۔ آخر بادشاہ سلامت کو خدا نے سمجھ دی اور یہ سمجھے مجھ سے غلطی ہوئی جو مین مرشد کی خدمت مین حاضر نہ ہوا مگر اب جانا چاہیئے۔ خود بدولت ہاتھی پر سوار ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خان صاحب وزیر کو ساتھ لیا۔ جب حضرت کے دروازے پر پہنچے تو حکیم صاحب سے کہا کہ رومال سے میرے ہاتھ باندھ دیجیئے۔ اطلاع کروائی بہادر حاضر ہے حکم ہو تو روبرو حاضر ہو۔ جواب ملا شوق سے حاضر ہون۔ جب بادشاہ میان صاحب کے سامنے رومال سے ہاتھ باندھے پہنچے تو کہا

پسرد آمد بندہ بگر ریختہ

آبروئے خود بعصیان ریختہ

اور دھاڑین مار کر رونے لگے۔ میان کالے صاحب نے اٹھ کر بادشاہ سلامت کے ھاتھ کھول دیئے اور گلے سے لگا لیا۔" ص۱

غالب نے اس فقیر منش بادشاہ کے بارے میں غلط نہین کہا تھا :۔

شبلی از منبر دھد آواز عشق

شاہ ما تخت گوید راز عشق

شاہ ما دارد در رہروی

خرقۂ پیری و تاج خسروی

شاھی و درویشی این جا باھم است

بادشاہ ھہند قطب عالم است ص۲

بہادر شاہ ظفر کو شاعری سے ھمیشہ دلچسپی رھی۔ بچپن سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک شعر و سخن مین مصروف رھا۔ اپنے شعر سناتا، دوسرون کے شعر سنتا اور داد لیتااور داد دیتا۔ یہان تک کہ وہ خود اساتذہ فن مین شمار ھونے لگا۔ اس نے سنگلاخ زمینون مین بھی شعر کہے ھین۔ بے لطف قافیون اور خشک ردیفون کو بھی خوش اسلوبی سے باندھا ھے۔ اس نے دنیا کو ایک صوفی کی نظر سے دیکھا اور دنیا کی بےثباتی، شان و شوکت کی ھیچ مقداری اور انسان کی بےبسی و مجبوری کی بھرپور تصویرکشی کی ھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے جرأت کی طرح معاملہ بندی کا شوق بھی ھےاور اس میدان مین وہ کسی سے پیچھے نہین رھا۔ لیکن یہ مضمون محض رسمی ھے۔ اس مین اس کی ذاتی مشارکت نہین ھے۔ اس کو زندگی کے حادثات نے گرفت مین لئے رکھا، وہ دکھ اٹھاتا رھا اور اپنے خون جگر سے اپنی شاعری کی آبیاری کرتا تھا۔ اسی لئے اس کی شاعری مین آپ بیتی کا رنگ نمایان ھے۔

یا مجھے افسر شاھانہ بنایا ھوتا یا میرا تاج گدایانہ بنایا ھوتا

ص۱ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد :۔ رئیس احمد جعفری، کتاب منزل لاھور ص ۱۵۲

ص۲ دیباچہ مہرنیم روز

اس غزل مین کرب کی وہ لہر جھلک رہی ھے جو اس کی پوری شاعری پر محیط ھے۔

سکون کی تلاش مین وہ کبھی کبھی اس جزیرے مین آ نکلتا ھے جہان حضرت علی اور خواجہ اجمیری کے علاوہ اس کے مشائخ آباد ھین۔ یہ جزیرہ محبت کا جزیرہ ھے یہان آرام ھے، چین ھے اطمینان ھے۔ یہان فخر عالم فخرالدین ھین، شاہ قطب الدین ھین، نصیرالدین کالے صاحب ھین جن کا ذکر شفا ھے۔ جن کی نظر اندوہ ربا ھے۔ جن کی محبت روح افزا ھے۔ ان کے سامنے وہ اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ھے۔ اپنے دکھون کا اظہار کرتا ھے اور اپنی ناتوانی کو ان کی مدد سے توانائی مین تبدیل کرنے کی خواھش رکھتا ھے۔

یہ منقبتی غزلین ملاحظہ ھون :۔

مرشد پاک روان فخرالدین | قبلہ و کعبہ جان فخرالدین
اک جہان فخرجہان کہتا ھے | پر ھے فخر دو جہان فخرالدین
مین گدا ھون تیرے دروازے کا | جاؤن اس در سے کہان فخرالدین
موجزن ھے تیرا دریائے کرم | از کران تابہ کران فخرالدین
ھے مدد تیری توانائی بخش | مین ھون بےتاب و توان فخرالدین
رکھ ظفر ھر نفس و ھر ساعت | شغل دل، ورد زبان فخرالدین

مرید قطب الدین ھون خاکپائے فخرالدین ھون مین
اگرچہ شاہ ھون ان کا غلام کمترین ھون مین
نہ کعبہ سے غرض مجھ کو نہ میخانے سے کچھ مطلب
ھمیشہ گھستا ان کے آستانے پر جبین ھون مین
رھون مین رند میکش پر رھون ان کی محبت مین
نہین خواھش مجھے یہ صوفی خلوت نشین ھون مین
مجھے تو خانقاہ و میکدہ دونون برابر ھین
ولیکن یہ تمنا ھے کہ ان کا ھون کہین ھون مین

بہادر شاہ مرا نام ہے مشہور عالم میں
و لیکن اے ظفر ان کا گدائے رہ نشین ہوں میں

نظام خانۂ فخر جہاں تمہیں تو ہو
قیام سلسلہ و خاندان تمہیں تو ہو
نہ کیوں کر تم سے ہوں ظاہر صفات قطب الدین
خدا رکھے تمہیں ، ان کا نشان تمہیں تو ہو
نثار تم پہ ہیں پروانہ سان ہزاروں دل
کہ شمع محفل صاحبدلاں تمہیں تو ہو
مجھے ہے تم سے امید اعانت دو جہان
معین میرے یہاں اور وہاں تمہیں تو ہو
صفا ہو دل میں تو بہتر ہے وہ کدورت سے
سنا تمہیں سے ہے، کرتے بیان تمہیں تو ہو
ظفر کو چاہیئے نصرت تمہیں نصیرالدین
کہ اس کے یار و مددگار ہاں تمہیں تو ہو

ان غزلوں میں جس شاعر کی شبیہہ ابھرتی ہے وہ واقعی غلام، کمترین اور گدائے رہ نشین ہے۔ یہ بزرگان دین ہست ہیں اور ان کے سامنے وہ نیست ہے۔ یہ موجود ہیں وہ لاموجود ہے۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ بزرگوں کے سامنے اپنی ذات کی نفی، پیری مریدی کے سلسلے کی پہلی سیڑھی ہے۔

ظفر سے بہت پہلے شاہان دہلی بزرگان دین کے آستانوں سے وابستہ رہے اور ان کی دعاؤں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ لیکن ان کے شاہی طمطراق میں کبھی فرق نہیں آیا اور ان کے اندر کا حاکم وقت ہمیشہ زندہ رہا۔ وہ اگر راتوں کو بندگان عاجز ہوتے تھے تو طلوع صبح کے ساتھ ہی ان کا شاہی کرّوفر لوٹ آتا تھا۔ مگر ظفر اندر سے شکستہ انسان تھا۔ اس کے دن اور اس کی

راتین یکسان تھین۔ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب اس کے لئے ایک جیسا تھا۔ اس لئے اس کی ذھنی کیفیت مین وقت کے ساتھ کوئی بڑی تبدیلی رونما نہین ھوتی تھی۔

ان منقبتی غزلون سے اس حقیقت کی نشاندہی بھی ھوتی ھے کہ ظفر آشوب تنہائی کا شکار تھا۔ وہ حالات کے سمندر مین اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا تھا۔ اس کرب انگیز صورت حال مین بھی بزرگ اس کا سب سے بڑا سہارا تھے اور انہین سے وہ اعانت کا طلب گار ھوتا تھا۔

ظفر نے خلیفہ رابع حضرت علی کی منقبت بھی لکھی ھے ۔

زور بازوئے مصطفی ھے علی　　صفدر عرصہ وغا ھے علی
میری کشتی کا ناخدا ھے علی　　مرا ھادی ھے رھنما ھے علی
میرا حامی ھے پیشوا ھے علی
میرے ھر درد کی دوا ھے علی

تھا ابوبکر یار غار نبی　　تھا عمر گرم کاروبار ھنی
اور عثمان ھے جانثار نبی　　اور علی وہ کہ راز دار نبی
میرا حامی ھے پیشوا ھے علی
میرے ھر درد کی دوا ھے علی

حضرت علی شیر خدا ھین۔ شہر علم کا دروازہ ھین۔ مشکلات مین محصور لوگون کے مشکل کشا ھین۔ سلاسل صوفیا کے منبع و مبدا ھین۔ حکمت و دانش مین بےمثال ھین۔ ایثار و قربانی مین لاجواب ھین۔ فقر و استغنا مین فرد ھین۔ میدان شجاعت کے مرد ھین۔ اوصاف حمیدہ مین سے کون سا وصف ھے جو اس ذات گرامی مین موجود نہین ھے۔ اخلاق جمیلہ مین سے کونسا خلق ھے جس سے یہ عظیم ھستی آراستہ نہین ھے۔ لیکن دل دردمند دوا کا متلاشی ھے۔ مصائب مین گھرا ھوا انسان آسودگی چاھتا ھے۔ شکست خوردہ ذھن زور بازو کی خواھش کرتا ھے اور بساط حکومت کا پٹا ھوا مہرہ صفدر عرصہ وغا کا طلب گار ھے۔ بہادر شاہ ظفر نے حضرت علی کی ھمہ جہت شخصیت کے انہین پہلوؤن کو نمایان کیا ھے جو اس کمزور و ناتوان شہنشاہ کو قوت عطا کر سکین اور اس کی ڈوبتی ھوئی کشتی کو پار لگا سکین۔

مبالغہ شاعری کی روح ھے ۔ اس کے بغیر شاعری کے خاکے مین رنگ نہین بھرا جا

سکتا۔ لیکن یہ مناسب حد تک رہے تو آرائش فن ہے۔ اگر حد سے بڑھ جائے تو شاعری اصلیت سے دور ہوکر اپنا کیف و سرور کھو دیتی ہے۔ صداقت اظہار بہادرشاہ ظفر کی نمایاں صفت ہے۔ اس کا جام شعر سلامت اور اصلیت سے لبریز ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہاں ایک غنائی کیفیت بھی ہے جو قاری کے دل میں اتر جاتی ہے۔ بہادرشاہ ظفر قلعۂ معلّیٰ کا مکین تھا اور قلعۂ معلّیٰ روز مرّہ اور محاورہ کی ٹکسال تھا۔ چنانچہ اس نے اس زبان کو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اپنے اشعار میں محفوظ کر لیا ہے۔

ہے نقد سخن رائج عالم میں ظفر اپنا
منہ کھول دیئے ہم نے مدت سے خزانوں کے

شاہ فخرالدین دہلوی، خواجہ غلام قطب الدین اور نصیرالدین کالے صاحب کی شان میں جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں شاعر نے غزل کی ہیئت استعمال کی ہے اور اپنے ممدوحین کے ساتھ گہری محبت کا اظہار کیا ہے۔غزل کے علائم و رموز بھی موجود ہیں اور تغزل کی فضا بھی پر پھیلائے ہوئے ہے۔ شاعر نے اپنے مشائخ کے مقام اور مرتبے کا بھی خیال رکھا ہے اور منقبت کو نعت یا حمد کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی۔ بات اس کے دل سے اٹھی ہے اور اس کی شاعری عقیدت کی چوکھٹ پر جھک گئی ہے۔

حضرت علی کی شان میں جو نظم لکھی گئی ہے اس کے لئے مسدّس کی ہیئت استعمال ہوئی ہے۔ اس میں عام طور پر حکمت آموز مضامین اور مراثی لکھے جاتے ہیں۔ لیکن بیانیہ اور مدحیہ نظموں کے لئے بھی یہ ایک مرغوب صورت ہے۔ ظفر نے اسی نقطۂ نظر سے اس کا انتخاب کیا ہے۔ بیان تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے، زبان میں سلاست اور روانی ہے، تراکیب اعلیٰ ہیں، مضمون ارفع ہے۔ پہلے چار مصرعوں میں شاعر ایک مضمون بیان کرتا ہے۔ پانچواں اور چھٹا مصرعہ ٹیپ کا شعر ہے جو چار مصرعوں کے بعد دہرایا جا رہا ہے، جس کی گونج پوری نظم میں سنائی دے رہی ہے اور نظم کے تاثر کو گہرا کرتی ہے۔

ظفر نے ایک منقبت خواجہ معین الدین چشتی کی شان میں بھی لکھی ہے۔

تم ہو اے خواجہ، معین سروران حق پرست
تم ہو رمز آگاہ کن، اور واقف سر الست

تم مددگار ظفر ہو، کیوں ظفر کو ہو شکست
پھر فلک کی دیکھ گردش کانپتے ہیں پاؤ دست

یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است

ظفر سے پہلے ان کے اجداد میں سے اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب بھی خواجہ اجمیری سے عملی طور پر عقیدت کا اظہار کر چکے تھے اور اس عقیدت کی یادگار مسجد اکبری، مسجد جہانگیری، مسجد شاہجہانی اور مسجد عالمگیری ہیں جو مزار شریف کے احاطہ کے اندر واقع ہیں اور اس کے علاوہ وہ دو دیگیں بھی جو مغل شہنشاہوں نے تبرک پکانے کے لئے درگاہ شریف کو نذر کی تھیں ۔

ظفر کا یہ اظہار عقیدت ایک ایسے بے کس اور مجبور انسان کا اظہار عقیدت ہے جو فلک کی گردش کو دیکھ کر کانپ رہا ہے ۔ جس کے اردگرد ظلمتوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ہر قدم پر ایک گڑھا ہے جس میں گرنے کا خوف اس کے ذہن پر محیط ہے۔ وہ راستہ کھو چکا ہے اور پریشانی کے عالم میں خواجہ کو پکار رہا ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کی خوبی، الفاظ کی در و بست تراکیب کی سحرکاری، تشبیہات و استعارات کی دلکشی نے مل کر اس نظم کو پرتاثیر بنا دیا ہے۔ یہاں وہ کسک اور چبھن بھی موجود ہے جو بہادرشاہ ظفر کے مخصوص حالات کی پیداوار ہے اور جو اس کی شاعری کا بنیادی وصف ہے ۔

ــــــ داغ (۱۸۳۱ء تا ۱۹۰۵ء) کو ارباب نشاط کا شاعر کہا جاتا ہے۔ عشق و محبت ان کا خاص مضمون ہے اور معاملہ بندی ان کا مخصوص انداز شاعری ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مذہب سے بیگانہ نہ تھے۔ وہ صوم و صلواۃ کے پابند تھے۔ شراب سے ہمیشہ گریزاں رہے۔خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کو سلطان الہند کہا جاتا ہے۔ شاہ و گدا سب ان کے آستانہ عالیہ پر سر جھکاتے ہیں۔ یہاں مسلم اور غیرمسلم کی کوئی قید نہیں۔ داغ بھی خواجہ اجمیری کے والا و شیدا تھے۔ ان کا کہنا ہے

" مجھے تمام عمر میں پانچ عشق ہوئے ہیں جن میں سے دو اب تک میرے رگ و ریشے

مین سمائے ہوئے ہین۔ ایک ہی منی حجاب کا اور دوسرا عشق خواجہ معین الدین چشتی کا "[صا]

داغ کی پرورش قلعہ معلّی مین ہوئی تھی۔ اس لئے وہ یہان کی درباردار یان دیکھے اور برتے ہوئے تھے۔ چنانچہ نواب کلب علی خان والئی رام پور جن کی ملازمت مین داغ تھے جب کہین جاتے توداغ کو بھی ساتھ لے جاتے۔ نواب صاحب جب نومبر ۱۸۷۲ء مین حج کو روانہ ہوئے تو داغ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ خانہ کعبہ کے زیر سایہ داغ نے اپنی مشہور غزل کہی جس کے دو شعر یہ ہین۔

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے
دل بے مدعا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

حج کے بارے مین کہتے ہین۔

ہزار شکر ہمین داغ حج نصیب ہوا
قصور وار گئے بے قصور ہم آئے

نواب کلب علی خان کے انتقال کے بعد ریاست مین بدنظمی پیدا ہوئی۔ داغ نے رام پور چھوڑ دیا اور حیدرآباد کا عزم کیا۔ راستے مین اجمیر شریف بھی رکے اور مزار خواجہ پر حاضری بھی دی۔

داغ کے مجموعہ کلام " مہتاب داغ " کا آغاز ایک ایسی غزل سے ہوتا ہے جو حمد، نعت اور منقبت کا خوبصورت سنگھم ہے۔

مین کلمہ گو ہون، خدا و رسول کا
آیا ہے بام عرش سے مژدا قبول کا
وہ پاک، بے نیاز، تجسم سے ہے بری
محتاج فوق و تخت، نہ وہ عرض و طول کا

صا دیباچہ مثنوی فریاد داغ از تمکین کاظمی ص ۷۱ آئینہ ادب لاہور

دونوں جہاں میں ہوئے محمد ہے عطر بیز
کونین میں ہے رنگ فقط ایک رسول کا
یہ داغ ہے صحابہ عظام کا مطیع
یہ داغ جاں نثار ہے آل رسول کا

ایک اور غزل میں بھی حمد و نعت کا مضمون یوں باندھا ہے

ایمان کی کہیں گے ایمان ہے ہمارا
احمد رسول تیرا ، مصحف کلامؐ تیرا
شمس الضحی محمد ، بدر الدجی محمد
ہے نور پاک روشن ، ہر صبح و شام تیرا

بزرگان دین سے اعانت طلبی منقبت کا خاص مضمون ہے۔ اس کے پیچھے یہ عقیدہ کارفرما ہے کہ یہ بندگان الہی اطاعت احکام خدا اور رسول کے سبب خالق دو جہان کے مقرب بن جاتے ہیں اور وہ ان کو بےپناہ قوتوں سے نوازتا ہے جس سے وہ عام ضرورت مند کی امداد کرتے ہیں۔ ان کے سامنے جھولی پھیلانے والا کبھی محروم نہیں رہتا۔ داغ نے دو منقبتی غزلیں خواجہ معین الدین چشتی کی مدح میں لکھی ہیں جن میں ان سے اعانت کی درخواست کی گئی ہے۔ ان غزلوں کی تخلیق کا دور غالباً وہ ہے جب داغ عازم حیدرآباد ہوئے اور راستہ میں اجمیر شریف حاضری کے لئے رکے۔ ان دنوں داغ پریشانیوں کا شکار تھے اسلئے وہ خواجہ اجمیری سے مدد کے طالب ہوتے ہیں ۔

یا خواجہ معین الدین چشتی	سلطان الهند ، غریب نواز
یا واقف راز جلی و خفی	سلطان الهند ، غریب نواز
فریاد تمہیں سے ہے میری	تکلیف سہی ہے کیسی کیسی
ہو داد طلب کی داد رسی	سلطان الهند ، غریب نواز
لائی ہے مجھے امید کرم	اس خاک کی اس درگہ کی ہے قسم
آیا ہوں پئے حاجت طلبی	سلطان الهند ، غریب نواز

یہ داغ کہاں تک رنج سہے — تم سے نہ کہے تو کس سے کہے

تم آل نبی، اولاد علی — سلطان الہند، غریب نواز

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی شان میں ایک اور غزل کے چند اشعار یہ ہیں ۔

مظہر نور دین ، معین الدین

آفتاب زمین ، معین الدین

ہیں تیرے آستان کا خاک نشین

تو مرا دلنشین، معین الدین

المدد، المدد کہ تیرے سوا

کوئی میرا نہیں، معین الدین

صحابہ کرام اور ائمہ اہل بیت کے بعد جس بزرگ شخصیت کے مناقب سب سے زیادہ لکھے گئے ہیں وہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی ذات گرامی ہے۔ وہ تمام اولیاٴ کے سرخیل ہیں اسلئے انہیں پیران پیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے دین کا احیاٴ کیا اسلئے وہ محیالدین کہلائے ان کے روحانی تصرفات کے بےشمار واقعات مشہور ہیں۔ ان کے فیوض و برکات نے گمراہوں کو راستہ دکھایا اور چوروں کو قطب کر دیا۔

داغ نے ان کی مدح میں بھی غزل لکھی ہے۔

یہ دل محبوب سبحانی کے صدقے

محیالدین جیلانی کے صدقے

تمہاری ذات سے ہے نظم عالم

جہان بانی کے سلطانی کے صدقے

نثار قبۂ انور مہ و مہر

فرشتے قبر نورانی کے صدقے

سبک روحی مین کب ھے لذت درد
دم بسمل گران جانی کے صدقے
یہ دل ھو اور جوش قلزم عشق
یہ کشتی موج طوفانی کے صدقے
فدائے شمع پروانہ ھو، اے داغ
ھم اپنے قطب ربانی کے صدقے

داغ کی مذھبی شاعری مین کچھ سلام بھی شامل ھین -

سلام اس کو کہا جس نے نام چار طرف
اسی کے دام درود و سلام چار طرف

ان کو مجرا، تھے جو زیر آسمان بیٹھے ھوئے
بھوکے پیاسے بے وطن بے خانمان بیٹھے ھوئے

اردو ادب کے دکنی دور مین اور شمالی ھند مین میر اور سودا کے عہد مین منقبت نگار اپنے مناقب کے لئے قصیدہ کی صنف استعمال کرتے رھے - بعض شاعرون کے ھان اگرچہ جستہ جستہ منقبتی اشعار غزلون مین مل جاتے ھین لیکن عام طور پر بزرگان دین کی خدمت مین عقیدت کے پھول پیش کرنے کے لئے قصیدے کی ھیئت استعمال کی- قصیدہ کسی ممدوح کی مدح کے لئے مخصوص ھے - غلو اور مبالغہ، شکوہ الفاظ، رفعت تخیل، ندرت تراکیب، جدت تشبیہہ و استعارہ کے علاوہ علمیت کے اظہار کے لئے شاعر مختلف علوم و فنون کی اصطلاحین بھی استعمال کرتے ھین- لیکن غزل عشق و محبت کے جذبات کا وسیلۂ اظہار ھے- شاعر اپنے اظہار جذبات مین جتنا زیادہ پرخلوص اور سچا ھو گا اتنی ھی اس کے اشعار مین تاثیر زیادہ ھوگی- یہان تصنع اور بناوٹ کی گنجائش بہت کم ھوتی ھے داغ نے قصیدے بھی لکھے ھین لیکن پیران پیر اور خواجہ اجمیری کے ساتھ اپنی شیفتگی کے بیان کے لئے اس نے غزل کو ترجیح دی ھے- اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ اس نے یہ اشعار محض رسمی طور پر نہین لکھے بلکہ ان مین اس کا خون جگر بھی شامل ھے جو خلوص اور صداقت کی دین ھے- حمد اور نعت

مین بھی انھون نے کوئی قصیدہ نہین لکھا۔ ان کی حمدیہ اور نعتیہ غزلون کے علاوہ منقبتی غزلون مین تغزل کی پوری فضا موجود ہے۔

تنقیدی جائزہ

اس دور مین اردو شاعری نے ارتقاء کی کئی منزلین طے کین۔ اسلام کی دینی اور تہذیبی اقدار اور روایات بےتکلفی سے اردو زبان اور خصوصاً شاعری مین داخل ہو گئین۔ آیات قرآنی اور احادیث نبوی کو کلی یا جزوی طور پر اشعار مین سمو کر لفت شعر کا دامن وسیع کیا گیا۔ بحور کا تنوع اورقافیون اور ردیفون کی رنگینی اس زمانے کے شاعرون کی جودت ذہنی اور کاوش فکری کا ایک اور ثبوت ہے۔ مشکل قافیون اور سنگلاخ زمینون کا استعمال بھی اس دور کی شاعری کا عام رجحان ہے۔ لیکن اساتذہ فن نے اپنی قادرالکلامی کے زور سے انہین اس طرح صاف کیا ہے کہ ان مین تصنع اور اجنبیت کا احساس نہین ہوتا۔ ہندی بحرون کی بجائے فارسی یا عربی بحرین رائج ہوئین۔ میر۔ سودا۔ مصحفی۔ قائم میر حسن اور دیگر شعراء کی کاوشون سے اردو زبان سے دکنی، گجری، ہریانوی، پنجالی الفاظ کے اثرات ختم ہوئے اور اردو نے ایک شستہ زبان کا درجہ حاصل کر لیا۔ تھوڑی ہی مدت مین نہ صرف فارسی کے بیشتر اسالیب و اصناف منتقل ہو گئے بلکہ ان مین نئی نئی ایجادات و اختراعات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اس وقت فارسی لسانی اور ادبی اعتبار سے اوج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ اہل اردو نے بالکل نئے تجربے کرنے کی بجائے اپنی زبان مین ان مضامین اور اسالیب کو جگہ دی جو پہلے سے فارسی مین رائج ہو چکے تھے۔ اس سلسلے کا اعتراف میر نے اپنے ایک شعر مین اس طرح کیا ہے۔

تبعیت سے فارسی کے جو مین نے ہندی شعر کہے
سارے ترک بچے اب ظالم پڑھتے ہین ایران کے بیچ

اس دور مین غزل، قصیدہ اور مثنوی کی طرف شعراء کی خصوصی توجہ رہی۔ میر اور سودا کا عہد اردو شاعری کی تاریخ مین غزل کا زرّین دور ہے۔ اس دور کے شاعرون نے عشق مجازی کی واردات کے ساتھ تصوف اور اخلاقیات کے مضامین کو بھی غزل کا موضوع بنایا۔ نیز حمد، نعت اور منقبت کے لئے بھی غزل کی ہیئت استعمال کی گئی۔ اس دور کی دوسری مقبول صنف سخن قصیدہ تھی۔ گرد و پیش کی فضا اگرچہ قصیدے کی صنف کے لئے کچھ ایسی سازگار نہ تھی اور بادشاہ کا دربار یا امراء کی مجلسین

شاعرپروری کا بار نہین اٹھا سکتی تھین۔ پھر بھی بعض مخیر امرأ کی بدولت قصیدے کا بازار گرم رہا لیکن شعرأ نے دنیاوی ممدوحون کے علاوہ مذہبی شخصیات کو بھی اپنا موضوع بنایا اور نعت و منقبت مین معرکتہ الآرأ قصیدے لکھے۔ قصیدے کی صنف صلہ طلبی کے علاوہ قادرالکلامی کا اظہار بھی تھی۔ اس لئے اس دور کے شاعرون نے شکوہ الفاظ، آرائش بیان، نازک خیالی، جدت طرازی، زور بیان، مضمون آفرینی اور بلند پروازی کی طرف زیادہ توجہ کی۔ ان قصیدہ گوٗون مین سودا سب سے کامیاب نظر آتے ہین۔ میر کی دردمندی اور دل شکستگی، زوربیان اور شکوہ الفاظ کی متحمل نہین ہو سکتی تھی۔ جب دہلوی شعرأ ہجرت کرکے فیض آباد اور لکھنؤ پہنچے تو انہون نے پرتکلف اسلوب کو آگے بڑھایا۔ ان شعرأ مین مصحفی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔

مثنوی اردو شاعری کی ایک اور اہم صنف ہے جس مین بہت سے شاعرون نے طبع آزمائی کی۔ لیکن جو شہرت میرحسن کی مثنوی سحرالبیان کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کا مقدر نہ بن سکی۔ اس مثنوی مین ایک عشقیہ کہانی بیان ہوئی ہے لیکن یہ اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ مثنوی کا آغاز حمد، نعت اور منقبت کے مضامین سے ہوا ہے۔ یہ روایت دکنی ادب مین موجود تھی جس کا تفصیلی ذکر تیسرے باب مین ہو چکا ہے۔ یہ روایت بھی دیگر شعری روایات کی طرح فارسی ادب سے اردو مین منتقل ہوئی۔

ان اصناف سخن کے علاوہ شعرأ نے دیگر اصناف شاعری مثلاً مسدس، مخمس، ترجیع بند، ترکیب بند، ہفت بند وغیرہ مین بھی طبع آزمائی کی اور داد سخن دی۔

اردو شاعری کے دکنی دور مین منقبت نگاری کے تین رجحانات کی نشاندہی کی گئی ہے

۱۔ خلفائے راشدین کی منقبت

۲۔ اہل بیت کی منقبت

۳۔ مشائخ طریقت کی منقبت

اردو شاعری کے اس دور مین یہ تینون رجحانات موجود ہین۔ سودا نے اہل بیت کی مدح مین زوردار قصیدے لکھے ہین۔ میر کا موضوع بھی آل رسول ہی ہے۔ انہون نے ان کی مدح کے لئے قصیدہ، غزل، مخمس، مسدس اور ہفت بند کی کئی اصناف سخن مین طبع آزمائی کی ہے۔ مصحفی اور قائم چاندپوری نے قصیدے مین اور میرحسن نے مثنوی اور غزل مین اپنی شیفتگی اور محبت کا اظہار

کیا ہے۔ غالب بھی اہل بیت کے والا و شیدا ہیں۔ انہوں نے اپنی عقیدت کا اظہار قصیدے اور غزل میں کیا ہے۔ مومن نے خلفائے راشدین کی مدح کے علاوہ سید احمد بریلوی کی منقبت بھی لکھی ہے اور اس کے لئے قصیدہ اور مثنوی کی ہیئت استعمال کی ہے۔ جوشش عظیم آبادی نے اہلبیت کو خراج نیاز مسدس ادا کرنے کے لئے قصائد لکھے ہیں۔

داغ غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اہل بیت کے علاوہ حضرت غوث پاک اور خواجہ معین الدین چشتی سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار غزل میں کیا ہے اور بہادرشاہ ظفر نے خلفائے راشدین کے علاوہ خواجہ معین الدین چشتی اور شاہ فخرالدین کے مناقب کے لئے غزل اور مخمس کا پیمانہ استعمال کیا ہے۔

اس دور کی منقبت نگاری کی ایک واضح خصوصیت یہ ہے کہ منقبت کی شخصیات میں سے اہل بیت ہی زیادہ تر شاعروں کا موضوع رہے ہیں اور انہیں کے ساتھ دلی وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے جبکہ دکنی دور کی روایت منقبت نگاری میں خلفائے راشدین اور بزرگان دین زیادہ تر موضوع منقبت رہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اہل بیت کے ساتھ محبت مسلمانوں کا اجتماعی مسلک ہے جبکہ خلفائے راشدین اور مشائخ کے ساتھ اظہار وابستگی تمام مسلمانوں کا مسلک نہیں ہے۔ دکنی دور میں زندگی بڑی پرسکون تھی۔ اس میں کوئی مدو جزر نہیں تھا۔ جبکہ شمالی ہند بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ رہی۔ انسانی خون ارزاں ہوا۔ احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کی لشکر کشی نے لوگوں کا سکھ چین لوٹ لیا۔ مرہٹوں۔ جاٹوں اور روہیلوں نے نیندیں حرام کردیں۔ چنانچہ جب زندگی ابتلا کا شکار ہوئی تو اہل بیت جنہوں نے خود مصائب و آلام مردانہ وار برداشت کئے تھے۔ شاعری کا موضوع بن گئے۔ چنانچہ عوام کی روحانی بحالی اور ان کا مورال بلند کرنے کے لئے منقبت کے لئے یہ بہترین موضوع تصور کیا گیا۔

بـــــا ب پـــنـجـم

نظیر اکبر ابادی (متوفی 1830ء)

اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے والوں نے اردو شاعری کے دو اہم مرکزوں کی نشاندہی کی ہے ۔ انہیں دو مرکزوں کے نام پر دو دبستان شاعری معرض وجود میں آئے ۔ ایک دبستان دہلی کہلایا اور دوسرے نے دبستان لکھنؤ کا نام پایا ۔ یہ دونوں دبستان الگ الگ خصوصیات رکھتے ہیں ۔ اور یہاں تخلیق ہونے والی شاعری انہیں خصوصیات کی بنا پر پہچانی جاتی ہے ۔ نظیر اکبر آبادی ان دونوں مرکزوں سے دور رہے اس لئے ان کی شاعری کی درجہ بندی کرتے ہوئے مشکل یہ پیش آتی ہے کہ انہیں کس دبستان کے شعراء کے ساتھ رکھا جائے ۔ ان کی زبان دونوں دبستانوں سے الگ ہے ۔ ان کے موضوعات مختلف ہیں ۔ ان کے اظہار و بیان کے طریقے اپنی جگہہ منفرد حیثیت رکھتے ہیں ۔ وہ اپنی ذات میں ایک عہد ہیں ۔ اس لئے ان کا ذکر الگ کیا جا رہا ہے ۔

نظیر اکبر آبادی اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہے ۔ آزاد منشی اور قلندری ان کا مسلک تھا ۔ اگرچہ وہ ایک معزز مسلم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ۔ مگر غیر مسلموں سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے اہل ہنود کے ساتھ طویل رفاقت کی بنا پر نظیر کی شاعری کے موضوعات بھی متاثر ہوئے ۔ دیوالی ۔ ہولی ۔ راکھی ۔ بسنت جیسے موضوعات پر ان کی نظمیں ان کے اپنے شوق اور ذاتی دلچسپی کے علاوہ صحبت کے اثر کی ترجمان بھی ہیں ۔ نظیر کے بہت سے بہن بھائی تھے ۔ جو عالم طفلی ہی میں فوت ہو گئے اس لئے وہ آشوب تنہائی کا شکار ہو گئے رد عمل کے طور پر نظیر زندگی میں وارفتگی شوریدہ سری اور ہنگامہ پروری کو پسند کرنے لگے اس لئے ان کے ہاں ان تقریبات کا ذکر ملتا ہے جن میں گہما گہمی اور رونق زیادہ ہو ۔

نظیر کو کسی مذہب کے ساتھ خاص وابستگی نہ تھی ان کا تعلق اپنے گرد و پیش میں بسنے والے تمام انسانوں سے تھا ۔ جن میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے ۔ چنانچہ تمام مذاہب کے بزرگ نظیر کیلئے محترم تھے ۔ انہوں نے اگر سرور کائنات ، حضرت علی اور صوفی بزرگ خواجہ سلیم چشتی کی مدح میں اشعار کہے ہیں ۔ تو سری کرشن جی اور بابا گورونانک کو بھی منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے ۔ امیرالمومنین حضرت علی کی شان میں منقبتی خمسہ کا آغاز نعتیہ اشعار سے ہوتا ہے ۔

کروں کیا وصف میں ان کا الم ناک ــــ کہ جن کی شان میں آیا ہے لولاک
پھرا جو عرش اور کرسی پہ چالاک ــــ کہاں وہ اور کہاں میرا یہ ادراک
چہ نسبت خاک را با عالم پاک

محمد رحمتہ للعالمین ہے   حبیب حق شفیع المذنبین ہے

رسول پاک ختم المرسلین ہے   کوئی ایسا خدائی میں نہیں ہے

لگا تحت الثریٰ سے تا بہ افلاک

اس کے بعد حضرت علی کی شان میں وہی عام مضمون ہے کہ علی وہ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار، جو امیر المومنین ہیں ۔ شیر خدا ہیں ۔ جو میدان جنگ میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں جن کے خوف سے آسمان کانپتا ہے ۔ اور جن کے بارے میں سرور کائنات نے جسمک جسمی ۔ لحمک لحمی اور روحک روحی فرمایا ہے ۔ اور اس کے بعد وہ پنجتن پاک کے وسیلے سے اپنے لئے دعا مانگتے ہیں ۔

کہ ہوں یاں جبتلک رکھ میری عزّت   مروں تو کچھ نہ ہو مجھ کو اذیت

پھر آئے جس گھڑی روز قیامت   نظیر اپنے کی واں بھی رکھیو عزّت

خدا وندا بہ حق پنج تن پاک

تمام بزرگان دین حضور ختمی مرتبت کے ساتھ تعلق کی بنا پر محترم ہیں ۔ دین اور دنیا میں انہیں جو مقام حاصل ہے وہ صرف اس سبب سے ہے کہ وہ رسول اکرم کے محبوب لوگ ہیں اور ان کے متبع ہیں ۔ نظیر نے حضرت علی کی منقبت لکھتے ہوئے اس بنیادی نقطے کو پیش نظر رکھا ہے ۔ اسی لئے ان کا قلم فرط عقیدت سے مبالغے اور غلو کے راستے پر گامزن نہیں ہوا ۔ انہوں نے نعت اور منقبت کے مضمون میں کہیں بھی عقیدت مندانہ بد اعتدالی سے کام نہیں لیا اور رسول اکرم اور دیگر بزرگان دین کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے ۔

کلیات نظیر[1] میں حضرت علی کی شان میں دو خمسے موجود ہیں پہلے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے

علی کی یاد میں رہنا عبادت اس کو کہتے ہیں

علی کا وصف کچھ کہنا سعادت اس کو کہتے ہیں

علی کی مدح کا پڑھنا کرامت اس کو کہتے ہیں

علی کے نام کا لینا ، حلاوت اس کو کہتے ہیں

علی کی حب میں مرجانا شہادت اس کو کہتے ہیں

---

۱ ۔ مطبوعہ مطبع نامی نول کشور لکھنؤ 1922ء ص299 ، 300

اس خمسے میں سات بند ہیں ۔ مضمون عام سا ہے جس میں کوئی جدت نہیں کہ حضرت علی کو سورج نے سجدہ کیا ، حضور اکرم نے لحمک لحمی ۔ دمک دمی فرمایا ۔ ان کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی نے ان سے ایک اونٹ مانگا تو انہوں نے سینکڑوں اونٹ دے دیئے ۔ اگر کسی نے سونے کی خواہش کی تو اس کا گھر بار بھر دیا اگر وہ نماز کیلئے دشت میں آئیں تو جبرئیل ان کے پیچھے اقامت کہے ۔ حور و ملک و غلمان ۔ جن و انس صفیں باندھے کھڑے ہوں اور ہر سجدے میں وصل حق نصیب ہو ۔ وہ شجاعت میں یکتا اور بہادری میں بے بدل ہیں ۔ انہوں نے ایک ہی حملے میں باب خیبر کو گرا دیا ۔ آخری بند یہ ہے ۔

نظیر اوے وہ دن جو شاہ کو سب دوستاں دیکھیں
تو پھر حسنین کے صدقے سے ان کو ہم بھی واں دیکھیں
اور اب دنیا میں آنکھوں سے نجف کا آستاں دیکھیں
سروں پر اپنے وہ دامان عالی سائبان دیکھیں
قسم ایمان کی ہم عین راحت اس کو کہتے ہیں

دوسرا خمسہ جس کا عنوان "در منقبت امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ" ہے اس طرح اغاز ہوتا ہے ۔

نور ظہور خالق اکبر کو کیا لکھوں
روح روان جسم پیمبر کو کیا لکھوں
دریائے معرفت کے شناور کو کیا لکھوں
دونوں جہاں کے گوہر انور کو کیا لکھوں
حیرت میں ہوں کہ حیدر صفدر کو کیا لکھوں

گر نور اس کا دیکھ کہوں شمس اور قمر
وہ اس کا ذرہ نو کا وہ اس کا فیض بر
تارے تو جو ستارے ہیں اس نثر یا اویر

اور قطب بھی اس سے ہی قائم ہیں بے خطر

حیرت میں ہوں کہ حیدر صفدر کو کیا لکھوں

اس نظم میں چھ بند ہیں جن میں نظیر نے حضرت علی کی دینی اور روحانی فضیلتیں بیان کرنے کی ان کی جسمانی خوبیوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے ۔

اس شاہ کے اگر لب و دندان کی صفا

کہوے کوئی کہ لعل و گوہر ہیں یہ بے بہا

سو وہ تو صدقے ہو کے رہا خاک میں گڑا

اور یہ بھی ہو نثار سدا آب میں رہا

حیرت میں ہوں کہ حیدر صفدر کو کیا لکھوں

ایک اور نظم شہنشاہ اکبر کے دور کے مشہور صوفی بزرگ اور ولی اللہ حضرت سلیم چشتی کی مدح میں ہے ۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن سے شہنشاہ نے اولاد نرینہ کے لئے دعا کی درخواست کی تھی اور بچے کی پیدائش پر انہی کے نام پر اس کا نام سلیم رکھا تھا یہ بچہ بعد میں جہانگیر کے نام سے سریر آرائے سلطنت ہوا ۔ اس کا ابتدائی بند یہ ہے ۔

ہیں دو جہاں کے سلطاں حضرت سلیم چشتی

عالم کے دین و ایماں حضرت سلیم چشتی

سر دفتر مسلماں حضرت سلیم چشتی

مقبول خاص یزداں حضرت سلیم چشتی

سردار ملک عرفاں حضرت سلیم چشتی

اس نظم میں گیارہ بند ہیں ۔ حضرت سلیم چشتی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے نظیر کہتے ہیں کہ آپ

نمبر کلیات نظیر مطبوعہ نول کشور لکھنؤ 1922ء ص301

وہ ولی ھیں جن کے فیض سے عالم باغ و بستان کا منظر پیش کرتا ھے ۔آپ بادشاھوں کے بادشاہ ھیں عام لوگوں کے رھنما ھیں ۔ صاحب سخا ھیں ۔ محبوب کبریا ھیں ۔ آپ کا نام شہروں اور بنوں میں مشہور ھے ۔ جسم میں جو روحیں ھیں وہ آپ کو یاد کرتی ھیں ۔ تمام پھولوں میں آپ کے خلق کی خوشبو ھے۔ اور جنت کے جور و غلمان آپ کی خدمت کرتے ھیں ۔ آپ وقت کے سلیمان ھیں ۔ تمام جہاں کی سلطنت آپ کے زیر فرمان ھے ۔ فغفور اور خاقان آپ کے نوکر ھیں ۔ تمام خلقت آپ ھی کے خوان کرم سے فیضیاب ھوتی ھے ۔ اور تمام جنوں ، پریوں اور انسانوں پر آپ کا حکم چلتا ھے ۔

آخری بند یوں ھے ۔

عالم ھے سب معطر تیرے کرم کی بو سے
حرمت ھے دوستوں کو حضرت تمہارے رو سے
یہ چاھتا ھوں اب میں سو دل کی آرزو سے
رکھیو نظیر کو تم دو جگ میں آبرو سے

اے موجد ھر احسان حضرت سلیم چشتی

بزرگوں کا عرس رونق اور گہما گہمی کا منظر پیش کرتا ھے ۔ یہاں ھر طرف تقدس کی فضا ھے اور پاکیزگی کی پھوار پڑتی ھے ۔ نظیر اکبر آبادی نے حضرت سلیم چشتی کے عرس پر بھی ایک نظم کہی ھے ۔

باغ جنت ھے آج یہ درگاہ پھول پھولے ھیں فیض سے دلخواہ
دیکھ رضواں بہاریاں کی واہ دل میں کہتا ھے دمبدم واللہ
رشک ھے گلشن بہشتی کا
عرس حضرت سلیم چشتی کا

عرس میں شریک ھونے والوں میں ھر طرح کے لوگ شامل ھیں ۔

کتنے واں سیم تن بھی پھرتے ھیں غنچہ لب ۔ گلبدن بھی پھرتے ھیں
شوخ گل پیرھن بھی پھرتے ھیں دل ربا دل شکن بھی پھرتے ھیں

رشک ہے گلشن بہشتی کا

عرس حضرت سلیم چشتی کا

جہاں تک زبان کا تعلق ہے نظیر جب مسلمان بزرگان دین کی تعریف میں لب کشائی کرتے ہیں تو وہ زبان استعمال کرتے ہیں ۔ جو مسلمان گھرانوں میں استعمال ہوتی ہے ۔ اور جس میں ہندی کے بجائے عربی اور فارسی الفاظ و تراکیب کی رم جھم دکھائی دیتی ہے - اس سے ان کی ذہانت و فطانت اور موقع شناسی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس جب وہ غیر مسلم اکابرین کے بارے میں قلم اٹھاتے ہیں تو ہندی کے الفاظ اس بے دریغ انداز میں استعمال کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ اس زبان کو لکھنے والا وہ نہیں ہے ۔ جو مسلم اکابرین کے مناقب لکھنے والا تھا ۔

سری کرشن جی کے بارے میں ایک بند ملاحظہ ہو !

یارو سنو ، یہ دودھ کے لٹیا کا بالپن   مدھ پورنی نگر کے بسیا کا بالپن

موہن سروپ کرت کریا کا بالپن   بن بن کے گوال گوون چریا کا بالپن

ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن

کیا کیا کہوں میں کشن کنیا کا بالپن

ل----

نظیر نے نظم کی زبان موضوع کے اعتبار سے اختیار کی ہے چنانچہ نظیر کی کلیات کا مطالعہ کرنے والا شخص مختلف قسم کی زبانوں کے حلقے دیکھے گا ۔ جو موضوع کی مناسبت سے اس نے گرد کھینچے گئے ہیں ۔ [نمل]

نظیر اپنے ماحول اور معاشرے کے سچے ترجمان ہیں ۔ عام رسم و رواج سے لیکر میلوں ٹھیلوں اور قومی تقریبات کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی بول چال بھی نظیر نے اپنی شاعری میں سمیٹ لی ہے ۔ وہ اپنے دور کے فصحاء کے نزدیک غیر معتبر اور غیر فصیح ٹھہرے ۔ ان پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ان کی زبان ٹکسالی نہیں ہے اور وہ ادبی روایات کی پاسداری نہیں کرتے ۔ مگر وقت نے بہت جلد ان کے

نمل = مختصر تاریخ ادب اردو ڈاکٹر اعجاز حسین ، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ص114

ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کر دی ہے ۔اور اج وہ ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے اردو شاعری میں ممتاز مقام کے حامل ہیں ۔

بـــاب شــشـــم

دبستان لکھنؤ

سیاسی، سماجی اور مذہبی ماحول

ناسخ - منیر شکوہ آبادی - اردو مرثیہ میں منقبت کے پہلو

میر ضمیر - میر انیس - مرزا دبیر

امیر مینائی - عزیز لکھنوی

دبستان لکھنؤ کی منقبت نگاری کا جائزہ

سیاسی، سماجی اور مذہبی ماحول

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت زینہ زینہ زوال کی طرف بڑھنے لگی۔ ۱۷۱۲ء میں اس کا پوتا جہاندار شاہ تخت نشین ہوا جس کی عیش پسندی کی وجہ سے اس دور میں طوائفون ڈومون اور میراثیون کو غیرمعمولی فروغ حاصل ہوا۔ اس کی حکومت کو ایک سال نہ گزرا تھا کہ اس کے بھتیجے فرخ سیر نے سید عبداللہ خان اور سید علی حسین کی مدد سے اسے شکست دے کر قتل کر دیا اور خود تخت حکومت پر قابض ہو گیا۔ لیکن عملی طور پر اقتدار سید برادران کے ہاتھ رہا۔ جب فرخ سیر نے ان سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی تو اسے اندھا کرکے مروا دیا گیا۔ چھ ماہ کے عرصے مین سیّد برادران نے تین بادشاہون کو یکے بعد دیگرے تخت نشین کرایا۔ اس لئے انھین " بادشاہ گر سید" کہا جانے لگا۔ ۱۷۱۹ء مین انھون نے محمد شاہ کو جو اپنی تعیش پسندی کی وجہ سے رنگیلا کے نام سے مشہور ہوا تخت پر بٹھایا۔ محمد شاہ نے بعض مخلص امراؑ کی مدد سے سیدبرادران کا تو خاتمہ کرا دیا لیکن فرائض سلطنت سے عہدہ برا نہ ہو سکا۔ چنانچہ امراؑ مین نسلی بنیادون پر علیحدہ علیحدہ جماعتین بن گئین جن مین تورانی اور ایرانی دو جماعتین خاص طور پر نمایان تھین۔ تورانی سنی العقیدہ تھے جبکہ ایرانی شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔

ایرانی سردارون مین محمد امین نیشاپوری پنج ہزاری منصب پا کر نواب سعادت خان برہان الملک کے نام سے اودھ کا گورنر بنا۔ اس کے بعد اس کا داماد اور بھانجا صفدر جنگ اور نواسہ شجاع الدولہ یکے بعد دیگرے اودھ کے گورنر بنے ۔

اودھ کے پہلے صوبدار اپنی تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت مین مغل پایۂ تخت دھلی کے رنگ مین رنگے ہوئے تھے۔ اس لئے اودھ مین جس نئی تمدنی اور ثقافتی روایت کی اساس پڑی وہ قدرتی طور پر دھلوی نقوش رکھتی تھی اور وہ بھی محمد شاہ رنگیلے کی دھلی کے۔ جب مغلون کی شان و شوکت ختم ہو گئی تو اس کی جگہ نمود و نمائش، تن آسانی اور لہو و لعب نے لے لی اور لوگ فنون حرب کی بجائے فنون لطیفہ سے دل بہلانے لگے۔ اودھ کا ماحول خوش گوار تھا، فضا پرامن تھی۔ چنانچہ اس زوال پذیر تہذیب و تمدن کو پروان چڑھنے کا خوب موقع ملا۔ عیش و عشرت کا بازار گرم ہوا اور رنڈیون اور ڈیرہ دار طوائفون نے معاشرتی زندگی مین محوری حیثیت اختیار کر لی اور شجاع الدولہ کے بیٹے نواب

آصف الدولہ کی داد و دہش نے ان رنگینیوں میں اور اضافہ کر دیا۔

نواب آصف الدولہ نے لہو لہب میں مشغول رہنے کے باوجود مذہب تشیع کی اشاعت میں بڑی کوشش کی۔ اس کا نائب حسن رضا خان بھی مذہبی آدمی تھا۔ اس کی کوشش سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہو گئے اور ان کو جاگیریں ملیں اور جو اپنے مسلک پر قائم رہے ان سے ان کی پرانی جاگیریں بھی چھین لی گئیں۔ نواب غازی الدین حیدر کی بیگم نے امام العصر کی چھٹی کی رسم شروع کی۔ نواب امجد علی شاہ ایک متقی نواب تھا۔ اس کے زمانے میں حکومت علماء اور مجتہدین کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ واجد علی شاہ عیش پرست حاکم تھا لیکن اپنے عقیدے میں غلو سے کام لیتا تھا۔ ان سب کی کوششوں سے یہ مذہب لکھنوی تہذیب کا نمایاں عنصر بن گیا۔ [ص۱]

نادر شاہ کے حملے نے سلطنت مغلیہ کی بنیادیں ہلا دیں۔ عوام و خواص ذہنی انتشار اور خوف و ہراس کا شکار ہو گئے۔ دلی ایسی تباہ ہوئی کہ پھر شرمندۂ تعمیر نہ ہوئی۔ ارباب علم و فضل شہر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ دلی کا سہاگ لٹا تو دوسرے شہروں نے رونق پائی۔ انہیں شہروں میں فیض آباد اور لکھنو بھی شامل تھے۔ یہیں شعر و شاعری کی وہ محفل جمی جو لکھنوی دبستان شاعری سے موسوم ہوئی۔ دہلوی شعراء کے آنے سے پہلے لکھنو میں کوئی مقامی شاعر نمایاں نہ تھا مگر ان شعراء کے آنے کے بعد لکھنو کے شاعروں نے بھی شاعری میں فکر و کاوش کی۔ انہوں نے اپنی شاعری میں امتیازی شان پیدا کرنے کے لئے اہل دہلی کے طرز سے جداگانہ اسلوب اختیار کیا۔ دہلی کی شاعری اگر جذباتی اور داخلی تھی تو یہاں لفظی اور خارجی بن گئی۔ دہلوی شاعری کے مضامین میں تصوف کو بڑی اہمیت حاصل تھی لیکن لکھنو کے مذہبی ماحول میں تصوف کے نشوونما پانے کا کوئی امکان نہ تھا لہذا یہاں کی شاعری میں تصوف راہ نہ پا سکا۔ عیش و عشرت اور فراغت نے مردانہ جذبات و خیالات کو کمزور کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کے خیالات اور زبان پر نسائیت غالب آ گئی اور ریختہ کے مقابلے میں ریختی کو ترقی دے کر بےحیائی کی داستانیں بڑی ڈھٹائی سے بیان ہونے لگیں۔

لکھنو کے سربرآوردہ شاعروں نے یہاں کے معصیت آلود معاشرے میں اخلاقی انحطاط کو

ص۱ لکھنؤ کا دبستان شاعری : ابواللیث صدیقی ص ۳۶

روکنے کے لئے مذہبی شاعری کا چراغ روشن کیا ۔ چنانچہ حمد ، نعت اور منقبت کے علاوہ مرثیہ اور سلام نگاری کو فروغ حاصل ہوا ۔ تکلف اور تصنع لکھنوی تہذیب و معاشرت کا حصہ بن چکا تھا ۔ اس کا اثر شاعری پر بھی پڑا اور شعراً نے اپنی تمام تر توجہ شعر کی ظاہری صورت کو خوبصورت بنانے میں صرف کر دی ۔ شعر کی ظاہری صورت کو خوبصورت بنانے میں شعراً نے بڑی بڑی جدتوں سے کام لیا ۔ ان میں سے ایک صنعت رعایت لفظی ہے ۔ لکھنو کے ہر شاعر نے اس کی تھوڑی بہت چاشنی سے اپنے کلام کی رونق بڑھائی ہے ۔ تشبیہات و استعارات پر خصوصی توجہ دی گئی اور نئی تشبیہیں اور استعارے وضع ہوئے ۔

ـــــ ناسخ (م ۱۲۵۴ھ) : لکھنوی شعراً کے طبقہ اول میں ناسخ کو استاد سمجھا جاتا ہے ۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ " انہوں نے ہی سب سے پہلے دلی اور لکھنو کے دبستان شاعری کو مستقل حیثیت سے علیحدہ کیا اور لکھنو کی زبان و شاعری کو قواعد و ضوابط کی سد /دی ۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے مجوزہ اصولوں کو حتی الوسع ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ۔ زبان کی حک و اصلاح میں ان کا بڑا درجہ ہے ۔ بقول امداد امام اثر " اگر جناب شیخ کو اصلاح زبان کی طرف توجہ نہ ہوتی تو زبان حال کی صورت پیدا نہ ہوتی ،، ۔ ناسخ سے پہلے اردو زبان اور غزل دونوں کو ریختہ کہتے تھے ۔ ناسخ نے غالباً سب سے پہلے زبان اور غزل کو علیحدہ علیحدہ اردو اور غزل کے نام سے رواج دیا ۔ سنسکرت کے ثقیل الفاظ اور پرانے ہندی محاورات نکال کر ان کی جگہ عربی ، فارسی الفاظ داخل کئے اور بندش میں بھی اساتذہ فارسی کے نمونوں سے فائدہ اٹھایا ۔ غزل کی زمینوں میں تصرف پیدا کیا اور موضوع کے اعتبار سے اس میں وسعت پیدا کی ،، [ط۱]

ناسخ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ۔ انہوں نے چند رباعیات اور قطعات بھی لکھے ہیں ۔ ایک مثنوی حدیث مفصل کے ترجمہ میں ہے اور ایک مولود شریف ہے لیکن بقول صاحب گل رعنا

" دونوں نظمیں ان کے منہ پر نہیں کھلتیں ،، [ص۲]

لکھنؤ کی شاعری پر لکھنؤ کے امامیہ مذہب کا بہت اثر تھا چنانچہ ناسخ کے مطبوعہ دیوان کی پہلی غزل یہ ہے ۔

ص۱ لکھنو کا دبستان شاعری : ابواللیث صدیقی ص ۲۰۵ ، ۲۰۶

ص۲ ایضاً ص ۲۱۹

بلبل ہون بوستان جناب امیر کا

روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

یہ پوری غزل حضرت علی کی منقبت مین ہے۔ مقطع ہے

ناسخ کا ادعا ہے یہی روز باز پرس

مین ہون غلام شاہ رسل کے وزیر کا

دوسری غزل بھی منقبت علی مین ہے۔ اس کے علاوہ اور غزلون مین متفرق اشعار حضرت علی ہی کی شان مین لکھے گئے ہین۔

لوح محفوظ اک نگینہ ہے علی کے نام کا

عرش کہتے ہین جسے زینہ ہے اس کے نام کا

شاہ مردان سے نہین مخفی کوئی راز جہان

ہین ملک ہرکارے ان کے ہر طرف کو ڈاک ہے

حروف مہر نبوت ہین نقش پائے علی

یہی کھدا ہے، سلیمان کا نگین دیکھو

اقرار نبوت کا ہے اقرار خدا کا

انکار امامت کا ہے انکار خدا کا

رجعت خورشید اور شق قمر سے ہے عیان

ہے نبی مالک لیالی کا، علی ایام کا

ناسخ نے اپنے اکثر مقطعون مین حضرت علی یا دیگر ائمہ اہل بیت کی مدح کی ہے۔

وہ خدا کا دوست ہے اور دوست ہے اس کا خدا

کیون نہ ہو ناسخ محبت حیدر کرار کی

ناسخ اٹھین گے حشر مین وہ لوگ سرخ رو
دنیا مین جو محب ھین پیمبر کی آل کے

عندلیب روح ناسخ اڑ کے پہنچی خلد مین
ھو پر پروانہ الفت جعفر طیار کی

مدح علی المرتضی کے ساتھ ساتھ دلدل اور تلوار کی تعریف مین ناسخ نے شعر کہے ھین۔

فیض دلدل سے سمند طبع یان چالاک ھے
آج ھے جو صید مضمون، بستہ فتراک ھے

بندۂ مرتضٰی ھون مین ناسخ
سجدہ گہ نقش پائے دلدل ھے

غلام حیدر کرار ھون مین اے ناسخ
مرا عدو جو ھوا، زیر ذوالفقار ھوا

ہے گمان ھے برق خاطف ذوالفقار حیدری
لشکر اعدائے دین گو خس و خاشاک ھے

دیوان ناسخ کی جلد دوم مین پانچ غزلین حضرت علی کی ولادت پر ھین -

آج دنیا مین امام انس و جان پیدا ھوا
یعنی ابن عم شاہ مرسلان پیدا ھوا

آج مولد ہے جناب حیدر کرار کا

ہو گیا بازو زبردست احمد مختار کا

ہو مبارک کہ ہوئے حیدر و صفدر پیدا

شہر علم ازلی کا یہ ہوا در پیدا

ہو مبارک قائم آل عبا پیدا ہوا

مہدی و ہادی امام ماسوا پیدا ہوا

مژدہ باد اے دل امیر المومنین پیدا ہوا

عرش کے کرسی نشین کا جانشین پیدا ہوا

بعض منقبت نگار شعرأ نے مدح اہل بیت کے ساتھ ساتھ مخالفین اہل بیت پر دشنام طرازی بھی کی ہے۔ ناسخ نے بھی اس روایت کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

برسے لعنت دشمنان مرتضی کی خاک پر

ہر برس باران رحمت کا وہاں امساک ہے

شہر ہے ہر سو یہاں [illegible]

دشمن شیر [illegible] ہر سنگ [illegible] ہے

اہل بیت رسول مقربین خدائے ذوالجلال ہیں اور اس کی عطا کردہ قوتوں سے پکارنے والوں کی امداد کرتے ہیں۔ اس عقیدے سے منقبت نگاری میں اعانت طلبی کا مضمون پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں ناسخ کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

منت رضوان کرے کیا ناسخ اے باب علوم
باب جنت کو برنگ باب خیبر کھول دے

جسم ناسخ خاک سرداب مین هو مرنے کے بعد
التجا هے بادشاہ کربلا کے سامنے

نجات ناسخ عاصی بھی کیجیو مولا
تمھین تو امتین بخشو گے سب رسولون کی

منیر شکوہ آبادی (۱۲۲۹ھ تا ۱۲۹۷ھ) : انیسوین صدی عیسوی کے ادبی رجحانات اور معیار سخن کا جائزہ لین تو منیر شکوہ آبادی اور ان کا کلام اپنی بلندپایہ قدرون کے لحاظ سے ممتاز نظر آتا هے۔ ان کے ادبی کارنامے یادگار بن کر اپنے عهد کا قابل قدر خزینہ اور همارے لئے ادب کا قابل فخر سرمایہ هو گئے هین۔ وہ غدر کے سلسلے مین پکڑے گئے۔ ابھی رهائی نہ هوئی تھی کہ نواب جان طوائف کا قتل هوا اور اس کا الزام منیر کے سر آیا۔ غدر کے سلسلے مین سرکار برطانیہ منیر سے بدظن تھی۔ قتل کے الزام مین ان کو سزائے حبس دوام هوئی اور انڈیمان بھیج دیئے گئے۔ منیر کو انڈیمان مین ذهنی اور جسمانی سینکڑون تکلیفون کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر نواب یوسف‌علی خان والئ رام‌پور کی کوششون سے نجات ملی۔

منیر، ناسخ اور رشک کے شاگرد تھے۔ مرزا دبیر سے بھی رشتہ تلمذ تھا۔ انهون نے غزلون اور قصیدون کے علاوہ دو مثنویان بھی لکھی هین۔ یعنی حجاب زنان اور معراج المضامین۔

حجاب زنان ایک عشقیہ مثنوی هے۔ لیکن معراج المضامین ایک مذهبی مثنوی هے جس کا سبب تالیف بیان کرتے هوئے منیر لکھتے هین کہ " ایک دن چند مخلص احباب کی محفل مین غازی پور کے رهنے والے الطاف حسین صاحب نے مجھ کو فکر سخن مین مصروف اور قصیدہ گوئی کی طرف مالوف دیکھ کر میری مذهبی قصیدہ نگاری کی تعریف کی اور کہا کہ آئمہ کرام کے مختلف فضائل اور معجزات جو مختلف قصائد مین بکھرے پڑے هین اگر یکجا کر دیئے جائین اور ساتھ هی عام زبان مین اختصار

کے ساتھ ان مطالب کو بیان کر دیا جائے تو بہت اچھا ہو،،[1]

منیر کو ان کا یہ مشورہ پسند آیا۔ چنانچہ منیر نے یہ مہم سر کرنے کی ٹھانی۔

پسند آیا مجھے ان کا اشارہ
قدم اس راہ میں یہ کہہ کے مارا
دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا
توکلت علی اللہ تعالے

اس کا آغاز مثنوی کی روایت کے مطابق حمد ، نعت اور منقبت علی المرتضٰی سے ہوتا ہے اور پھر اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں اور بارہ اماموں کی تعریف، ان کی ولادت ، وفات معجزات کا تذکرہ تفصیلاً نہایت عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں۔ واقعات کے بیان میں بڑا محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے ہاں صرف ان باتوں کابیان ہے جو قرآن، حدیث اور دیگر مذہبی کتب میں ملتی ہیں۔ منیر نے اس مثنوی میں مختلف ائمہ کی امتیازی خصوصیات کو بیان کیا ہے اور نئے انداز سے بات نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ان کی نکتہ دانی اور رنگین بیانی واضح ہوتی ہے۔ زبان میں روانی سلاست اور فصاحت و بلاغت کا لحاظ ہر قدم پر رکھا گیا ہے۔ الفاظ کی نشست ، محاورات کی برجستگی اور تراکیب کی ندرت ایسی ہے کہ سخن فہم تحسین پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

حمد و نعت کے بعد منقبت علی المرتضٰی کا مضمون ملاحظہ ہو

علی نور خدا ، نفس پیمبر
علی یعسوب دین ، صدیق اکبر
علی فاروق اعظم ، فیض سرور
علی دست احد، بازوئے احمد
علی مسند نشین ہل اتٰی ہے
علی نقش نگین انما ہے
نبی اولی تو حیدر بھی ہے اولا
یہی ہے معنی من کنت مولا

---

[1] منیر شکوہ آبادی، سوانح حیات و کلام پر تبصرہ ۔ ڈاکٹر زہرہبیگم یاسمین ص ۱۹۶ تا ۱۹۷
نسیم بکڈپو لکھنو ۱۹۷۰ء

علی ہے موج سب عالم سفینہ

علی ہے علم کا باب مدینہ

علی ہارون ہے، موسی پیمبر

پیمبر شہر علم حق علی در

اس کے بعد سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرہ کی منقبت ہے۔ عام طور پر شاعرون نے اصحابہ کرام یا ائمہ عظام کو تعریف مین اشعار لکھے ہین۔ سیدۃ النساء یا امہاۃ المومنین کی شان مین بہت کم شاعرون نے طبع آزمائی کی ہے۔ محمد باقر آگاہ کی تحفۃ النساء اور سودا کے قصیدے کے بعد یہ پہلی اہم منقبت ہے جو سیدۃ النساء کے حضور ہدیہ عقیدت پیش کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔

جناب فاطمہ صدیقہ پاک

گرامی دختر سلطان لولاک

جگر بند نبی، محبوبہ حق

فلک کی روشنی، جنت کی رونق

خدا و مصطفےٰ کرتے تھے خاطر

فرشتے خدمت اقدس مین حاظر

یہی ہے ہم غلامون کا ذریعہ

کہ محشر مین ملے ایسی شفیعہ

کریمہ، طاہرہ، مخدومہ، زہرا

شفیعہ، صادقہ، معصومہ، زہرا

شاعر رنگین بیان ہو اور ذکر کسی خاتون کا ہو (خواہ وہ کیسی ہی محترم اور مکرم شخصیت کی مالک ہو) تو قلم کے بہک جانے کے امکانات رد نہین کئے جا سکتے۔ لیکن منیر اپنی ممدوحہ کے مقام اور مرتبے کے آشنا ہے۔ اس لئے اس کے قلم نے لغزش نہین کھائی اور سیدۃ النساء کے احترام اور تقدس کو مجروح نہین ہونے دیا۔ اس کے بعد دیگر ائمہ کا ذکر بڑی تکریم کے ساتھ کرتے ہین اور ایسا کرتے ہوئے دامن اعتدال کو ہاتھ سے نہین چھوڑتے۔ جہان کہین ان کا قدم ڈگمگایا ہے وہ ان کے عقیدے کی دین ہے۔ شاعرانہ موشگافیون کا نتیجہ نہین ہے۔

" ہمارے قصیدہ نگاروں میں سودا پہلے شخص ہیں جنہوں نے فارسی قصیدہ نگاری کے مقابلہ پر اردو قصیدہ کو اہمیت دینے کی کوشش کی اور اس صنف کی بدولت اپنا نام روشن کیا۔ اس کے بعد ذوق نے اس شمع کو روشن رکھنے اور اس صنف ادب کو مزید خصوصیات اور زوربیان کا حامل بنانے میں اور قصیدہ کو علمی اور ادبی رنگ دینے میں نام حاصل کیا۔ غالب اور مومن نے کچھ وقتی ضروریات کے لحاظ سے اور کچھ اس خیال سے کہ قصیدہ گوئی کی مشق نہ ہونا شاعر کی علمی اور فنی کمزوری خیال کیا جاتا تھا قصیدہ گوئی کی مشق جاری رکھی۔ اس کے بعد جس شخص نے مجموعی حیثیت سے قصیدہ کی سب خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے اس صنف میں کمال دکھایا وہ منیر شکوہ آبادی ہیں "[ص۱]

منیر نے کل ۲۹ قصیدے لکھے ہیں جن میں دس مذہبی ہیں۔ دو قصیدے سرورکائنات کی شان میں ہیں، دو میں حضرت علی المرتضی کے مناقب بیان ہوئے ہیں۔ ایک قصیدہ سیدۃ النساء کی مدح میں ہے۔ ایک حضرت علی اکبر کی منقبت میں ہے۔ ایک ایک قصیدہ حضرت خامس آل عبا اور حضرت علی موسی رضا کی شان میں اور دو قصیدے امام مہدی کی منقبت میں ہیں ۔

منیر کے قصائد کا ذکر کرتے ہوئے جلال الدین احمد جعفری لکھتے ہیں

" مضامین و تخیل کے لحاظ سے منیر نہایت کامیاب قصیدہ گو ہیں ۔ طبیعت کی روانی ہر موقع پر اپنا خاص اثر دکھاتی ہے۔ ان کی قادرالکلامی مسلم الثبوت ہے۔ تشبیب و تمہید بہت پسندیدہ ہوتی ہے۔ چونکہ منیر کی عمر کا اکثر حصہ پریشانی اور آوارہ گردی میں گزرا ہے اسلئے ان کے بعض قصائد ان واردات قلبی کا آئینہ ہیں۔ انہوں نے نہایت وضاحت سے اپنے واقعات قید و الم لکھے ہیں اور مذہبی زاویہ نگاہ سے نعت و منقبت میں اپنے درد دل کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا "[ص۲]

حقیقت یہ ہے کہ منیر شکوہ آبادی کی قصیدہ گوئی شکوہ الفاظ، جوش بیان، بلندئ فکر اور جدت تراکیب سے عبارت ہے۔ اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون کی اصطلاحیں بھی ان کی قصیدہ گوئی کا امتیازی وصف ہیں۔ ان کے قصائد میں روایتی مضامین مدح کے علاوہ تاریخی اور معاشرتی حالات کی طرف

ص۱ منیر شکوہ آبادی۔ سوانح حیات و کلام پر تبصرہ : ڈاکٹر زہرہ بیگم یاسمین ص ۲۱۰

ص۲ تاریخ قصائد اردو ص ۵۹

اشارے بھی ملتے ہیں۔ نیز ان کی اپنی زندگی کے غیرمعمولی واقعات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ منیر نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شان میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں روایتی مدحیہ اشعار کے بعد اپنی پریشانیوں سے نجات کے لئے ان سے اعانت کے طلب گار ہیں۔

اے خطیب منبر اوج سلونی اے امام
عالم علم لدنی، شہر علم دین کے باب
خلعت امن و امان دو اس قصیدے کے عوض
ھند سے باغ نجف میں مجھکو بلواؤ شتاب
ہر طرف سے جلد اطمینان کلی بخشیئے
نقش پا سے دیجئے تعویذ دفع اضطراب
اے مرے مولا، خدا و مصطفی کے واسطے
رحم فرماؤ، نہیں ہے اب شکیبائی کی تاب

سیدۃ النساء کی منقبت میں بھی منیر اسی طرح طالب امداد ہوتا ہے۔

یا سیدہ، منیر حزین کی مدد کرو
یہ تیرہ روزگار بھی جویا ہے نور کا
مطلب یہ ہے کہ رنج و مصیبت سے دو نجات
مشتاق مہر فیض سے ذرا ہے دور کا

جو قصیدہ امام حسن کی شان میں لکھا گیا ہے اس کا مطلع ہے ۔

رشک زلیخا ہوئے بحر صفت جوش زن
غرق ہوا نیل میں یوسف گل پیرہن

اس میں منیر نے اصطلاحات ، استعارات و کنایات کا غیرمعمولی استعمال کیا ہے۔ اس قصیدے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ منیر اور مولانا فضل حق انڈیمان میں اکٹھے تھے اور اکثر و بیشتر علمی صحبتیں رہتی تھیں۔

مولوی بے نظیر فضل حق اسم شریف
دھلی سے تالکھنؤ مشتہر و موتمن

قید مین، مین اور وہ رہتے تھے ایکی جگہ

عین سمندر مین تھے غرقہ بحر محن

کہنے لگے ایک دن کچھ سبب اس کا بتا

شاعر اردو زبان اس مین ہون نو یا کہن

مصطحات عجم اور کنایات فرس

کس لئے کرتے نہین زینت نظم سخن

مولانا نے منیر کو قصیدہ کی چند خوبیون کی طرف متوجہ کیا اور قصیدہ نگاری کے نئے رجحانات اور نئے زاویون سے آشنا کیا۔ اس کا مفصل ذکر اس قصیدے مین موجود ہے۔ منیر کے مذہبی قصائد کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان مین سے اکثر قید و بند کی صعوبتون کے دوران لکھے گئے ہین شاعر انتہائی کرب کے ساتھ اپنے مصائب کا ذکر کرتاہے اور اپنے ممدوح سے امداد کا طالب ہوتاہے اس یقین کے ساتھ کہ اس کی نظر عنایت اس کی مشکلات کی زنجیرین کاٹ دے گی۔

منقبت امام علی موسی رضا مین شاعر عرض پرداز ہے

خدا کے واسطے امداد کیجئے جلدی

کہ ضیق رزق سے ہون مبتلائے کرب عظیم

نجات کا مرے دل کو یقین دو ایسا

کہ تا ہو گرمی امید برق و من بہم

منیر کو فطرت کی طرف سے جودت طبع، علوئے خیال اور فکر رسا ودیعت ہوئی تھی۔ اسی لئے ان کے قصائد مین جدت اور ندرت ہے۔ لطیف اور معنی خیز اشعار کی کثرت ہے۔ انہون نے فارسی شعراؑ کے قصائد کا گہرا مطالعہ کیا اور ان کی زمینون مین زوردار قصیدے لکھے۔ انہون نے کئی ایسی زمینین بھی اختراع کین جن کی طرف ہمارے قصیدہ نگارون نے توجہ نہین کی تھی اور ان مین انہون نے بڑے عمدہ شعر نکالے۔ انہین اپنی شاعرانہ عظمت کا خود بھی احساس تھا۔ چنانچہ کہتے ہین ۔

کمتر نہ پائین سب سے قصیدہ منیر کا

انصاف سے نہ کھینچین جو دانش فشار ہاتھ

مدح حاضر مین سناوے کوئی مطلع ایسا

انور زرد هو رنگ اڑنے لگے شوکت کا

واقعہ نگاری ، مسائل حاضرہ کے تذکرے ، خود ان کی اپنی زندگی کے حالات ، صاف ستھری نکھری زبان ، علمی اصطلاحات ، تلمیحات ، اشارات و کنایات ان کی قصیدہ نگاری کی نمایان خوبیان هین - قصائد مین اپنے مسائل اور اپنے دور کی ایسی واضع جھلکیان منیر شکوہ آبادی کا اجتهاد هے -

اردو مـــــرثـیہ

دوسری اصناف سخن کی طرح اردو مرثیہ کا آغاز بھی دکن سے ہوا۔ دکن کے عادل شاہی، قطب شاہی اور نظام شاہی حکمران مجالس عزا اور رسومات محرم کی سرپرستی کرتے تھے۔ اس لئے مرثیہ کے لئے سازگار فضا پیدا ہو گئی۔ اس دور مین جو مرثیے لکھے گئے ان مین ذاتی تاثر اور جذبہ خطابت غالب ہے۔ کہین کہین واقعہ نگاری اور بعض جگہ مکالمہ بھی موجود ہے۔ گویا محرکات داخلی کے ساتھ ذوق داستان سرائی اور تمثیل نگاری کے دھندلے دھندلے نقوش بھی یہان تلاش کئے جا سکتے ہین۔

شمالی ہند مین شاعری اور مرثیہ گوئی باقاعدہ طور پر محمد شاہ کے عہد سے شروع ہوئی۔ اس سے پہلے مجالس عزا مین جو مرثیے پڑھے جاتے تھے وہ عموماً فارسی، دکنی، گوجری یا ملتانی زبان مین ہوتے تھے۔ شمالی ہند کے بعض شاعر اپنی مقامی بولیون مین بھی نوحے، سلام اور مرثیے لکھتے تھے جن کی ادبی حیثیت زیادہ مستحکم نہین ہے۔ لیکن جب خالص ریختہ گویون کا پہلا دور شروع ہوا تو ادبی مرثیے بھی لکھے جانے لگے جن مین سے مصطفٰی خان یک رنگ کے وہ چند اشعار محفوظ ہین جو میرتقی میر نے نکات الشعرا مین نقل کئے ہین۔ ان اشعار کا فنی پایہ شمالی ہند کے ادبی معیار کے مطابق ہے۔ زبان، اسلوب بیان اور تخیل سب مین لطافت موجود ہے جس سے احساس ہوتا ہے کہ دکن اور گجرات کے بعد جب مرثیہ شمالی ہند آیا تو اس کا ادبی معیار گرا نہین بلکہ کچھ بلند ہو گیا۔ گریہ و بکا مرثیے کا بنیادی مقصد سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے ایسے شعرا کا کلام زیادہ مقبول سمجھا جاتا تھا جو عام فہم کہتے تھے خواہ ان کا مرثیہ ادبی اور فنی معیار پر پورا اترے یا نہ اترے۔

میر اور سودا نے جس طرح اردو شاعری کی دوسری اصناف کو اوج کمال تک پہنچایا اسی طرح مرثیے نے بھی ان کے ہاتھون فروغ حاصل کیا۔ مرثیہ نگاری مین سودا کو اولیت حاصل ہے۔ ان کے مرثیون مین اقسام نظم اور مضامین دونون اعتبار سے تنوع پایا جاتا ہے۔ مقدار کے اعتبار سے بھی اتنے مرثیے شمالی ہند مین ان سے قبل کسی شاعر نے نہین کہے۔ ان کے یہان خلوص وعقیدت ندرت خیال، شاعرانہ انداز بیان اور واقعہ نگاری کے خاصے وافر نمونے ملتے ہین مگر جگر کو خون کرنے والی کیفیت ان کے یہان نہین ملتی۔ اس لئے بعض لوگون نے ان کے مرثیون کو بےکیف قرار دیا ہے۔ سودا

اپنے قصائد میں تشبیب لکھنے کے عادی تھے۔ اپنے مرثیوں میں بھی انہوں نے بعض جگہ مختصر مگر برجستہ اور بعض جگہ طویل مگر شگفتہ تمہیدیں لکھی ہیں۔ اس طرح انہوں نے مرثیہ کو چہرہ سے متعارف کرا کے مرثیہ گوئی کا ایک نیا انداز دیا۔

میر ذاتی طور پر غم اور دکھ کا شکار رہے۔ اس لئے میر کا مرثیہ سوز و گداز سے لبریز ہے۔ میر کے تمام مراثی میں مانوس لب و لہجہ اور دلکش اسلوب نے تازگی اور تاثیر پیدا کر دی ہے۔ میر پہلے شاعر ہیں جنہوں نے محتشم کاشی کی زمین میں ترکیب بند کیا ہے۔ غرض میر نے بھی سودا کی طرح مرثیے کا فنی اور ادبی پایہ بلند کیا اور اپنے ہم عصر اور بعد آنے والے مرثیہ گویوں کو اعلی ادبی معیاروں سے روشناس کرا کے ترقی کے امکانات روشن کئے ہیں ۔

لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے دور میں مجالس عزا کو فروغ حاصل ہوا۔ عاشورہ خانہ آصفی تعمیر ہوا۔ غفران مآب نے عزاداری میں ایران اور عراق کی بعض مروجہ رسوم شامل کرکے محرم کو ایک منفرد تقریب کی شکل دے دی۔ مذہبی انہماک آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں کئی امام باڑے، کربلائیں اور آئمہ معصومین کے روضوں کی نقلیں تعمیر ہو گئیں اور مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی تعزیئے نکالتے، عزاداریاں کرتے، مرثیے پڑھتے اور سوزخوانی کرتے۔ اس مذہبی ماحول نے مرثیہ گو شاعروں کی ایک کثیر جماعت پیدا کر دی جن میں میر ضمیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میر ضمیر :۔ ضمیر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے مرثیہ کو جدید شکل دی اور اس کے منتشر اجزاؑ کو مربوط کرکے بہت سی رزم اور بزم کی خصوصیات اس میں سمودیں۔ ضمیر نے اپنی اولیت کا دعویٰ اس بند میں کیا ہے۔

جس سال لکھے وصف یہ ہمشکل نبی کے
سن بارہ سو انچاس تھے ہجر نبی کے
آگے تو یہ انداز سخن تھے نہ کسی کے
اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرز نئی کے
دس میں کہوں، سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا
جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا

ضمیر کی اولیات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں ۔

۱) ضمیر پہلے شاعر ہیں جنہوں نے شاعرانہ کمال کے ساتھ پہلی مرتبہ اپنی تمام کوشش مرثیہ گوئی کی فنی ترقی میں صرف کی ۔

۲) ان سے پہلے مراثی کے جو نمونے ملتے ہیں وہ مختصر ہیں۔ ضمیر کے کلام میں ۸۰، ۹۰ بند کے مرثیے تو بکثرت ہیں۔ اکثر مرثیے ۱۰۰ بند سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں۔ اس پرگوئی کے باوجود ان کا کلام رطب و یابس سے پاک ہے۔

۳) مرثیے میں پہلے صرف واقعات شہادت کے بیان پر اکتفا کی جاتی تھی۔ انہوں نے مختلف موضوعات کو علیحدہ علیحدہ فنی خصوصیات کے ساتھ باندھا ۔ مثلاً سراپا ، گھوڑے کی تعریف ، تلوار کی تعریف وغیرہ ۔

۴) لکھنوی شاعری میں اخلاقی شاعری کو مستقل حیثیت سے داخل کرنے کی یہ پہلی کامیاب کوشش ہے ۔

۵) وہ مرثیہ گوئی میں پہلے صاحب فن اور صاحب طرز ہیں اور ان کے ہاں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو بعد میں انیس اور دبیر کے ہاں ملتی ہیں ۔[۱]

حضرت علی اکبر کا سراپا ملاحظہ ہو ۔

مانند دعائے سحری قد رسا ہے
ماتھا ہے کہ دیباچۂ انوار خدا ہے
در زلف نے اک چاند سا منہ گھیر لیا ہے
وصل شب قدر و شب معراج ہوا ہے

در زلفیں ہیں ، رخسار دل افروز بھی دو ہیں
یاں شام بھی دو ہیں یہ خدا روز بھی دو ہیں

سراپا مداحی کی ایک صورت ہے ۔ یہ ممدوح کی خارجی تصویر ہے۔ مرثیہ گو شاعروں نے آئمہ معصومین کے سراپا کو مرثیہ کا حصہ بنا کر اس میں منقبت کا نقش ابھارا ہے۔ اگرچہ منقبت عام طور پر ممدوح سے عقیدت و محبت کا اظہار، اس کے فیوض و برکات کے تذکرے، اس کے فضائل کے بیان ، اس کی بہادری شجاعت اور صبرواستقلال کی تعریف اور دکھ درد میں اس سے امداد طلب کرنے کا نام ہے۔ لیکن لکھنو

۱۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۲۳۵

کی مخصوص ادبی فضا میں جس میں داخلیت کی بجائے خارجیت اور جذبات کی بجائے لفظیات پر زیادہ زور دیا جا رہا تھا، منقبت نگاری کو ایک نیا انداز ملا - اب منقبت نگاری ممدوح کے فضائل و مکارم اخلاق، اس کے صبر و برداشت، اس کی شجاعت اور بہادری کے ساتھ ساتھ اس کے جمالِ ظاہری کا بیان بھی بن گئی-

میر انیس (۱۸۰۲ء تا ۱۸۷۴ء)

میر انیس اردو مین مرثیہ گویان اہل بیت کے قافلہ سالار ہین۔ انہون نے واقعہ کربلا کو جس خلوص و صداقت اور ندرت زبان و بیان کے ساتھ پیش کیا ہے اس کا جواب عربی اور فارسی زبانون مین بھی نہین ہے۔ ان کا ذوق مرثیہ نگاری کچھ تو ماحول کا تقاضا تھا اور کچھ ان کے گھر کی فضا بھی مرثیہ کے لئے بڑی سازگار تھی۔ ان سے پہلے ان کے آباؤ اجداد اس فن مین نام پیدا کر چکے تھے اور اس طرح مرثیہ گوئی انہین ورثے مین ملی تھی۔ چنانچہ انیس کہتے ہین

نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہین سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہین وہ رنگین ہے عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی مین
پانچوین پشت ہے شبیر کی مداحی مین

اس ثناخوان کے بزرگون مین ہین کیا کیا مداح
جد اعلی سے نہ ہوگا کوئی اعلا مداح
باپ مداح کا، مداح ہے دادا مداح
ہم ذی قدر ثناخوانون مین یکتا مداح
جو عنایات الہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

میر انیس تک آتے آتے مرثیہ فنی لحاظ سے تکمیل پا چکا تھا۔ اس کا نقشہ مکمل ہو چکا تھا اور بنیادین بھری جا چکی تھین۔ میر انیس نے انہین بنیادون پر ایک سربفلک عمارت کھڑی کردی اب مرثیے کا پایہ اتنا بلند ہو گیا کہ اس کے سامنے شاعری کی دوسری صنفین بے حقیقت نظر آنے لگین۔

یہان مثنوی کا بیانیہ انداز، غزل کا سوز و گداز اور قصیدے کا شکوہ الفاظ سبھی کچھ موجود ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہین کہ

" معنوی حیثیت سے یا تاثرات کے اعتبار سے شاعری کی جتنی قسمین ہو سکتی ہین انیس کے مرثیے ان سب پر حاوی ہین۔ شاعری، جذبات کی ترجمانی ہو یا خیالات کی، وجدان کی تعبیرہو یا حیات کی، تخیل کی جولانگاہ ہو یا محاکات کی، اس کا مقصد فنی حسن کی تخلیق ہو یا انسانی اخلاق کی تکمیل، سکون قلب کی تحصیل ہو یا کسی پیغام کی تبلیغ، مختصر یہ کہ شاعری کی جتنی تعریفین کی گئی ہین، اس کے جو محاسن قرار دیئے گئے ہین، اس کے جو مقاصد بیان کئے گئے ہین، ان سب اعتبار سے انیس کے مرثیون کا شمار اعلی درجے کی شاعری مین ہو گا۔ ایسی جامع صنف سخن انیسی مرثیے کے سوا اور کون ہے؟ "[1]

انیس مرثیہ گوئی کو " شبیر کی مداحی " سمجھتے ہین۔ مصائب اور فضائل ایک ہی تصویر کے دو پہلو ہین۔ ذکر مصائب درحقیقت فضائل کی شان رکھتا ہے کیونکہ مصائب کے ہنگامون سے جرأت، شجاعت اور صبر و رضا کے ساتھ گزر جانا فضیلتون کو ظاہر کرتاہے۔ اسی طرح انیس ذکر فضائل سے مصائب کی طرف متوجہ ہوئے ہین۔ سامعین جب یہ سوچتے ہین کہ ایسے برگزیدہ لوگون نے اتنی سختیان اٹھائین تو ان کا مصیبت و آزمائش کا تصور شدت کے ساتھ رقت انگیز ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے بےشمار نمونے کلام انیس مین ملتے ہین۔ ایک مرثیے کے چند بند ملاحظہ ہون ۔

عرش اعظم کو ہلاتی تھین دعائین ان کی
وجد کرتے تھے ملک سن کے صدائین ان کی
وہ عمامے وہ قبائین وہ عبائین ان کی
حورین لیتی‌تھین بصد شوق بلائین ان کی
ذکر خالق مین لب ان کے جو ہلے جاتے تھے
غنچے فردوس کے شادی سے کھلے جاتے تھے

کیا جوانان خوش اطوار تھے سبحان اللہ
کیا رفیقان وفادار تھے سبحان اللہ
صفدر و غازی و جرار تھے سبحان اللہ

[1] انیس ایک مطالعہ: ڈاکٹر اعزاز نقوی ص ۵۱۷

صفدر و غازی و جرار تھے سبحان اللہ
زاہد و عابد و ابرار تھے سبحان اللہ
زن و فرزند سے فرقت ہوئی مسکن چھوڑا
مگر احمد کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

زہد میں حضرت سلمان کے برابر کوئی
دولت فقر و عبادت میں ابوذر کوئی
صدق گفتار میں عمار کا ہمسر کوئی
حمزہ عصر کوئی، مالک اشتر کوئی
ہوں گے ایسے ہی محمد کے جو شیدا ہوں گے
پھر جہاد ایسا نہ ہوگا نہ وہ پیدا ہوں گے

موم فولاد ہو آوازوں میں وہ سوز و گداز
اپنے معبود سے سجدوں میں عجب راز و نیاز
سر تو سجادوں پہ تھے عرش معلی پہ نماز
شیر دل، منتخب دہر، وحید و ممتاز
چاند شرمندہ ہو چہرے متجلی ایسے
نہ امام ایسا ہوا پھر، نہ مصلی ایسے

اک طرف اکبر مہر وسا جوان نایاب
کچھ جو بچپن تھا تو کچھ آمد ایام شباب
روشنی چہرے پہ ایسی کہ خجل ہو مہتاب
آنکھیں ایسی کہ رہا نرگس شہلا کو حجاب
جس نے ان گیسوؤں میں رخ کی ضیا کو دیکھا
شب معراج میں محبوب خدا کو دیکھا

شور ساوات میں تھا یا شہ مردان مددے
کعبۂ دین مددے، قبلۂ ایمان مددے
قوت بازوئے پیغمبر ذی شان مددے
دم تائید ہے اے فخر سلیمان مددے

تیسرا فاقہ ہے طاقت میں کمی ہے، مولا
طلب قوت ثابت قدمی ہے، مولا

مندرجہ بالا بندوں میں تین واضح خصوصیات ملتی ہیں۔ اہل بیت کے اوصاف جمیلہ کا ذکر، ان کے خد و خال اور قد و قامت کی خوبی کا بیان اور مشکلات میں ان کو مدد کے لئے پکارنے کا رجحان۔ یہی تینوں خصوصیات لکھنوی منقبت نگاری کا خصوصی وصف ٹھہریں اور میر انیس کے بعد آنے والے لکھنوی شاعروں نے انہیں اوصاف حمیدہ سے اپنی شاعری کا ایوان روشن کیا۔ اس طرح میر انیس لکھنوی طرز منقبت نگاری کے امام ٹھہرے۔

انیس نے مرثیے کی زبان کو بھی بہت وسعت دی۔ ہزاروں الفاظ اور محاورے جو صرف اہل زبان کی بول چال میں آتے تھے انہیں اس خوش اسلوبی سے برتا کہ وہ شاعری کی زبان بن گئے۔ اس سلسلے میں حالی کہتے ہیں

" آج کل یورپ میں شاعر کے کمال کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاتا ہے کہ اس کے اور شعراء سے کس قدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کئے ہیں۔ اگر ہم بھی اس کو معیار کمال قرار دیں تو بھی میر انیس کو اردو شعراء میں سے سب سے بہتر ماننا پڑے گا۔ اگرچہ نظیر اکبرآبادی نے شاید میر انیس سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں مگر اس کی زبان کو اہل زبان کم مانتے ہیں بخلاف اس کے میر انیس کے کہ اس کے ہر لفظ اور ہر محاورے کے آگے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے۔" صا

زبان کی فصاحت اور کلام کی بلاغت کے لحاظ سے بھی انیس کے مرثیے اردو ادب کا قابل

صا مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۶۷

فخر سرمایہ ھین ــــــــ مولانا شبلی کہتے ھین

" فصاحت کے مدارج مین اختلاف ھے۔ بعض الفاظ فصیح ھین بعض فصیح تر۔ بعض اس سے بھی فصیح تر ۔ میر انیس کے کلام کابڑا خاصہ یہ ھے کہ وہ ھر موقع پر فصیح سے فصیح تر الفاظ ڈھونڈ کر لاتے ھین " [1]

ندرت تشبیہہ ، جدت استعارہ ، سلاست ، روز مرہ و محاورہ، متانت لب و لہجہ کے علاوہ الفاظ کی چستی اور مضمون کی بلندی بھی کلام انیس کی خاص خوبی ھے ۔

---

[1] موازنہ انیس و دبیر ص ۳۲

مـرزا دبـیـر (۱۲۱۸ھ تا ۱۲۹۲ھ)

دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شعرأ مین سے ھین ۔ شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی ان کا آبائی شعار تھا اسلئے مرثیہ کی طرف آ گئے۔ مرثیے کے علاوہ سلام ، خمسے ، رباعیات ، قطعات ، مناجات اور نوحہ جات کہے ۔ ایک مثنوی بھی لکھی جس مین چہاردہ معصومین کے حالات ولادت ، فضائل اور معجزات و کرامات کا بیان ھے۔ دبیر نے اردو شاعری کو سب سے زیادہ مزائیہ سرمایہ مہیا کیا اور ھر پہلو سے تبلیغ واقعات اھل بیت کا حق ادا کیا۔

دبیر کو عربی ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ فارسی کی اعلی تصنیفات بھی زیرنگاہ رھتی تھین۔ اس لئے عربی اور فارسی ترکیبون اور شکوہ کلام نے ان کی شاعری کو ایک خاص آھنگ عطا کر دیا تھا احادیث اور آیات قرآنی کے حوالے بھی ان کے شعرون مین ملتے ھین۔ چنانچہ کہتے ھین

ھے استفادہ مجھ کو حدیثون کی سیر سے
واللہ ننگ و عار ھے مضمون غیر سے

دبیر ان شعرأ مین سے ھین جنھین موقع محل کے مطابق زبان کے استعمال کا سلیقہ ھوتا ھے ۔ چنانچہ کہتے ھین

ھے رزم سراپا تو زبان اور ھی ھے
اور بین کے مابین بیان اور ھی ھے
کس درجہ بلند ھے تیری فکر دبیر
کہتی ھے زمین یہ آسمان اور ھی ھے

ان کے کلام کا بنظرغائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ھوگا کہ وقت کے ساتھ دبیر کی زبان اور طرز بیان مین بھی تبدیلیان ھوتی رھی ھین۔ ابتدائی نوحون مین جو مرثیہ نما ھین سلیس اور سادہ زبان استعمال ھوئی ھے لیکن جیسے جیسے زور بیان مین اضافہ ھوتا گیا کلام کی آرائش کا التزام بڑھتاگیا رجز اور مدح مین یہ رنگ زیادہ گہرا ھوتا ھے اس کے برعکس مبکیہ حصہ مین صاف اور سادہ زبان استعمال کرتے ھین ۔

دبیر کے دور مین مرثیہ کے مقاصد کا ذکر کرتے ھوئے ڈاکٹر مظفر حسن ملک لکھتے ھین

" مرثیہ کا بنیادی مقصد مجالس عزا کی مانگ کو پورا کرنا تھا۔ جو مرثیہ سب سے زیادہ ماتم اور سینہ کوبی کا باعث ہوتا وہی کامیاب ترین سمجھا جاتا۔ مرثیہ کا دوسرا بڑا مقصد مدح شہ کربلا و متعلقین ہے۔ " وصف،، کے لئے شکوہ الفاظ ، تشبیہہ و استعارہ کا فنکارانہ استعمال اور مبالغہ لازمی اجزا ہین،، ص[۱]

ہمین یہان یہ دیکھنا ہے کہ دبیر مدح سرائی کے فریضہ سے کس طرح عہدہ برا ہوتے ہین۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ دبیر دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر تھے۔ خارجی خدوخال کا بیان لکھنوی شاعری کی خاص پہچان ہے لہذا ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے تو اس کے جمال ظاہری کا ذکر ضرور کرتے ہین -

امام حسین کی مدح مین یہ بند ملاحظہ کیجئے -

آئینہ کہا رخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی
صنعت وہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی
وان خاک نے صیقل یہان قدرت نے جلا کی
طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی
ہر آئینہ مین چہرۂ انسان نظر آیا
اس رخ مین جمال شہ مردان نظر آیا

کیا خلق حسن تھا حسن زیب قبا مین
کیا خوب فضائل تھے شہ ارض و سما مین
سر سجدۂ حق مین تو قدم راہ وفا مین
دل یاد خدا مین تو زبان ذکر خدا مین
ان کے لئے قرآن تھا وہ قرآن کی خاطر
سینہ سپر حفظ تھا ایمان کی خاطر

ص[۱] اردو مرثیے مین دبیر کا مقام ص ۲۱۵

لکھا ہے سر پاک سے تا سینہ انور
محبوب الہی سے مشابہ تھا وہ سرور
اور سرخ و سپید آپ کا تھا رنگ مطہر
گردن کی صفا طلعت خورشید سے بہتر
رخسار سے نسبت نہین کچھ شمس و قمر کو
اک شب کو نثار اس پہ کرون ایک سحر کو

× مرثیون مین منقبت کا یہ انداز صرف ظاہری پیکر کی مدح سرائی نہین ہے۔ شاعرون نے یہان اپنا خون جگر شامل کر کے داخلیت کے عمدہ نمونے تخلیق کئے ہین ۔

کر مدحت حسین اسی مین نجات ہے
دنیائے بےثبات کو ان سے ثبات ہے
بے عیب حق کی ذات ہےیا ان کی ذات ہے
حکم ان کا اور کلام مجید ایک بات ہے
کس منزل نیاز کے سالک حسین ہین
جب تک خدا کا ملک ہےمالک حسین ہین

باران و قطرہ ، باغ و گل و معدن گہر
صحرا و ذرہ برج و نجوم آتش و شرر
طور و کلیم، آب بقا ، خضر نامور
ظلمات و نور، شہرو بیابان و خشک وتر
قائل ہین سب کہ ثانی مولا محال ہے
اور ہے تو آئینہ مین انہین کا جمال ہے

سیدۃ النساء کی منقبت مین چند اشعار دیکھیئے۔

بلقیس پاسبان ہے یہ کس کی جناب ہے
مریم درود خوان ہے یہ کس کی جناب ہے
شان خدا عیان ہے یہ کس کی جناب ہے
دھلیز آسمان ہے یہ کس کی جناب ہے

کرسی زمین سے لیتی ہے گوشے پناہ کے
بیٹھا ہے عرش سایہ مین اس بارگاہ کے

باغون مین خلد نہرون مین کوثر ہے انتخاب
قبلون مین کعبہ مصحفون مین آخری کتاب
تارون مین آفتاب ہین پھولون مین ہین گلاب
سو عورتون مین فاطمہ مردون مین بوتراب

شاہ زنان وقت مسیحا کی مان ہوئین
زہرا ہرایک عصر مین شاہ زمان ہوئین

ان اشعار مین مذہبی جذبات سے قطع نظر مدح کی بنیاد محض قلبی خلوص ہی پر رکھی جائے تو بھی مدح کے حسن و خوبی مین کوئی فرق نہین پڑتا۔

جب اردو کی شعری روایت لکھنؤ پہنچی تو وہان کی طرز زندگی اور پرتکلف اور پرتصنع معاشرت نے ادبی تخلیقات کو بھی متاثر کیا اور صنائع بدائع کا استعمال بےاعتدالی سے ہونے لگا۔ اس دور مین یہی رنگ مقبول تھا اور ہر چھوٹا بڑا شاعر اسی راستے پر گامزن تھا۔ چنانچہ شاعر کو "مرصع ساز" اور شاعری کو "نگون کا جڑنا" قرار دیا گیا۔ دبیر بھی اس عام روش سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔

ان کے کلام مین محسنات شعر کا اہتمام و التزام پورے عروج پر ملتا ہے لیکن کمال یہ ہے کہ انہون نے ان تکلفات کو اس حسن و خوبی سے استعمال کیا ہے کہ ان کی کثرت کے

باوجود کلام کی دلآویزی مین کمی نہین آئی حالانکہ شاید ہی لفظی و معنوی صفت ایسی ہو جو ان کی دست برد سے محفوظ رہی ہو۔ صنعت تجنیس، صنعت اشتقاق و شبۂ اشتقاق، ردالعجز علی‌الصدر، صنعت ایہام، مراعاۃ النظیر، لف و نشر، حسن تعلیل کونسی ایسی لفظی و معنوی خوبی ہے جس سے کلام دبیر مزیّن نہین ہے -

------

امیر مینائی (۱۲۴۲ھ تا ۱۳۱۸ھ)

امیر مینائی مشہور صوفی بزرگ مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن کا مزار لکھنؤ میں مرجع خاص وعام رہا ہے۔ ان کے والد کرم احمد مینائی ظاہری اور باطنی علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی تربیت والد ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے علمائے فرنگی محل سے بھی کسب علم کیا۔ شاعری میں انہوں نے مظفر علیخان اسیر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جو لکھنوی شاعری کے عام رنگ یعنی رکاکت اور ابتذال سے بہت بلند تھے۔

واجد علی شاہ کی معزولی اور ۱۸۵۷ء کی پریشانی نے دیگر شرفائے لکھنؤ کی طرح امیر مینائی کو لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ کچھ عرصے کے لئے کاکوری چلے گئے۔ یہاں انہیں محسن کاکوروی کی صحبت میسر آئی جس نے امیر کے فطری ذوق نعت گوئی کو جلا بخشی۔ چنانچہ محسن کاکوروی کے مشہور قصیدہ " ابیات نعت ،، کی تضمین جو امیر نے کی وہ اسی فیض صحبت کا نتیجہ ہے۔

نعت امیر مینائی کا خاص میدان ہے۔ " محامد خاتم النبین ،، ان کے نعتیہ کلام کا تاریخی نام ہے۔ محسن کاکوروی نے اس کی تاریخ نکالی ہے

سروش غیب نے تاریخ کیا کہی محسن
کہ یاد مصطفیٰ سچا وسیلہ ہے شفاعت کا

اس مجموعے میں غزلوں ، رباعیوں ، ترجیع بندوں ، تضمینوں اور مناجاتوں کے علاوہ قصائد بھی موجود ہیں۔ ایک قصیدہ حضرت علی کی منقبت میں ہے۔ ایک حضرت امام حسین کی شہادت پر کہا گیا ہے اور دو غزلیں حضرت غوث پاک کی مدح میں لکھی گئی ہیں۔ حضرت علی کی منقبت میں جو قصیدہ ہے اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے

کیونکر نہ کروں ملک معانی کو میں تسخیر
خامہ ہے مرا دست یداللہ کی شمشیر

تشبیب میں شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے

آئے جو تعلّی پہ مری ہمت عالی
دشوار نہیں قلعۂ افلاک کی تسخیر

دل صاف، زبان صاف، سخن صاف ہے میرا
موتی کی لڑی ہے کہ مسلسل میری تقریر

امیر مینائی کے قصائد کی ایک خوبی گریز کی خوبصورتی ہے

یہ عزو شرف اس کی غلامی سے ہے حاصل
جو صاحب قنبر ہے ولا جس کی ہے اکسیر

لکھنوی شاعرون نے اپنے ممدوحین کی اخلاقی اور روحانی سربلندیون کے ساتھ ساتھ ان کے جمال ظاہری کی تعریف بھی کی ہے۔ اس کی جھلک بھی امیر کے ہان ملتی ہے

پیوستہ وہ ابرو نہین بالائے رخ صاف
مومن سے ہے مومن سحر عید بغلگیر

ابرو ہے حرم، چاہ ذقن، چشمۂ زمزم
رخ صورت قرآن، خط شب رنگ ہے تفسیر

تنویر جبین، روشنیٔ چہرۂ ایمان
گردن کی بلندی صفت نعرۂ تکبیر

حضرت علی کے عدل و انصاف کا یہ عالم ہے

خون ریزی انسان تو کہان، خوف ہے ایسا
سیماب کو کشتہ نہ کرین، صاحب اکسیر
مظلوم سے ہے نرم جہان تک دل ظالم
پنبے سے شرر، سنگ سے شیشہ ہو بغلگیر

ان شعرون سے یہ معلوم نہین ہوتا کہ ممدوح حضرت علی ہین۔ ایسے اشعار سودا نے دنیاوی ممدوحون کی شان مین کہے ہین نیز جن اشعار مین حسن ظاہری کی تعریف کی گئی ہے ان سے بھی ممدوح کا مذہبی شخصیت ہونا واضح نہین ہوتا۔

عدل و انصاف کے تذکرے کے بعد تلوار، گھوڑے اور تیروں کی تعریف ہے۔ اختتامیہ اشعار سے (ابتدائی اشعار کی طرح) اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضرت علی کی منقبت ہے

یا شیر خدا، دست خدا، بازوئے احمد

میں بھی ہوں تمہارا سگ در صورت قطمیر

ہو روز قیامت نظر چشم عنایت

کوثر کا ملے جام، جناں میں ملے جاگیر

یہاں ممدوح کے سامنے اپنی ذات کی نفی کی ہے اور روز قیامت اس سے نظر عنایت کی درخواست کی ہے ۔

ایک قصیدے میں حضرت امام حسین کی شہادت کا ذکر ہے۔ اس کا آغاز زمانے کی ستم رانیوں سے ہوتا ہے کہ اس نے تمام اچھے لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

علی الخصوص شہیدوں کا بادشاہ حسین

کہ تخت عرش ہے جس کے لئے مقام جلوس

چراغ کعبۂ دین شہسوار دوش رسول

امام سجدۂ خاصان ایزد قدوس

ان دو قصیدوں کے علاوہ تین نعتیہ قصیدے بھی امیر نے لکھے ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق ان کے مذہبی قصائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

" وہ غزل کے استاد سہی لیکن قصیدہ میں بھی وہ اردو کے بہترین شعرأ میں شمار ہوں گے۔ ان کی علمی استعداد، پرشکوہ الفاظ، شاندار تمہیدیں، دلفریب گریز اور مناسب دعائیہ سب کا سب استادانہ ہے،،[1]

غزل امیر مینائی کا خاص میدان ہے۔ انہوں نے حضرت غوث الثقلین کی مدح میں دو غزلیں بھی کہی ہیں۔ پہلی غزل کا مطلع ہے

---

[1] اردو کی نعتیہ شاعری ص ۳۰۲

اے فلک میرے مددگار ہیں غوث الثقلین

غم مجھے کیا مرے غمخوار ہین غوث الثقلین

مقطع یہ ہے

عرض حاجت کی بھی حاجت نہین اس در پہ امیر

حال سے تیرے خبردار ہین غوث الثقلین

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے

کیا غم مری مدد پہ اگر غوث پاک ہین

اللہ بھی ادھر ہے جدھر غوث پاک ہین

مقطع یہ ہے

پرواہ نہین جو کوئی نہین قدردان میرا

صد شکر قدردان ہنر غوث پاک ہین

" مراۃ الغیب ،، امیر کے عاشقانہ کلام کا مجموعہ ہے اور ان کے مطبوعہ عاشقانہ دواوین مین سب سے پہلا دیوان ہے ۔ یہان بھی امیر کے کلام کی نمایان خصوصیت حمد ، نعت اور منقبت کے مضامین ہین۔

سامان عفو کیا مین کہون قصہ مختصر

بندہ گنہگار تھا خالق کریم تھا

کرتا مین دردمند طبیبون سے کیا رجوع

جس نے دیا تھا درد ، بڑا وہ حکیم تھا

روشن ہین آفتاب سے اعجاز مصطفٰی

اونگلی اٹھی کہ ماہ فلک پردونیم تھا

کب مجھ سے مثل سایہ چھٹے پنج تن کریانون

پانچون سوارون مین مین بزیر گلیم تھا

ان کا مذہبی رجحان ان کی مشہور مثنوی ابرکرم سے بھی واضح ہوتا ہے۔ اس کا آغاز

حمد ، نعت اور منقبت سے ہوتا ہے۔ سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

بزرگوں کے ہوں کچھ احوال تحریر
بعینہ صاف بے تبدیل و تفسیر
کہ بعد مرگ زاد آخرت ہوں
بچوں دوزخ سے وجہ مغفرت ہوں

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد کسب معاش کی تلاش امیر کو دربار رام پور لے گئی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں۔

" دہلی اور لکھنؤ کی ویرانی کے بعد یہی ایک دربار تھا جہاں ہر فن کے کامل اور امام موجود تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کو ایک ہی محفل میں دادسخن دینا پڑی ۔ قدرتی طور پر ایک نے دوسرے سے فائدہ اٹھایا۔ علاوہ اور شعراء کے جلال کے کلام سے اس کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ پہلا دیوان قدیم رنگ میں ہے لیکن دوسرے دیوان میں وہ انداز نمایاں ہے جسے داغ کا رنگ کہا جاتاہے۔ یہ اثر امیر مینائی کے کلام میں سب سے نمایاں ہے اور اس حیثیت سے امیرمینائی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے لکھنوی شاعری کو اس کی قدیم روایات کی بندش سے آزاد کرایا "۔ص[1]

اس لحاظ سے انہیں لکھنوی دبستان میں مجدد کا درجہ حاصل ہے۔ لکھنوی شعراء کی تمام تر توجہ کلام کو ظاہری خوبیوں سے آراستہ کرنے پر صرف ہوتی تھی۔ رعایت لفظی اور ضلع جگت ذہن کو کسی اور طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی تھی۔ امیر کے یہاں عاشقانہ کلام میں بھی خیال کی گہرائی اور فکر کی بلندی پائی جاتی ہے۔

ص[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۲۴۳

عزیز لکھنوی (۱۸۸۲ء تا ۱۹۳۵ء)

عزیز لکھنوی اردو کے منقبت گو شعرا مین ایک نمایان مقام رکھتے ھین۔ ان کے قصائد کا مجموعہ " صحیفۂ ولا "، جہان ان کے عشق رسول کا مظہر ھے وھان آئمہ اہل بیت سے ان کی وارفتہ نیاز مندی اور خلوص و محبت کا آئینہ دار بھی ھے۔ " مذھبی نظمون کا کوئی مجموعہ بلندی افکار، دلکشی، زبان و بیان، جوش عقیدت، حسن ترتیب اور حسن طباعت کے اعتبار سے اس کتاب کا مقابلہ نہین کرتا "۔[1]

عزیز ذھین اور طباع شاعر تھے۔ انہون نے لکھنؤ کی خارجی شاعری مین داخلیت کا رنگ شامل کرکے لکھنوی شاعری کو نئی جہتون سے آشنا کیا۔ ان کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب ان کا علمی تبحر، عربی اور فارسی زبانون پر عبور، قدرت کلام، طبیعت کی تازگی اور رنگینی تھا۔ لیکن ایک اھم بات اس سلسلہ مین یہ بھی تھی کہ وہ اپنے دور کے تقاضون کو سمجھتے تھے اور ان کی تکمیل کو ضروری خیال کرتے تھے۔

عزیز کے زمانے مین مجالس عزا کے ساتھ ساتھ آئمہ کے یوم ولادت منانے کا آغاز ھو چکا تھا اس سلسلہ مین منقبتی مشاعرے منعقد ھوتے تھے جن مین شعراؑ آئمہ اہل بیت کی ولادت اور ان کے فضائل پر نظمین پیش کرتے تھے۔ " صحیفۂ ولا " کی کئی مدحیہ نظمین اسی موقع کے لئے لکھی گئین اور ان مشاعرون مین داد و تحسین کی مستحق ٹھہرین۔

عزیز اپنا سب سے بڑا کمال یہ سمجھتے ھین کہ وہ مداح آل مصطفی ھین اور میکدۂ نجف کے شرابی ھین۔ چنانچہ " صحیفۂ ولا " کے مقدمہ مین لکھتے ھین -

خدا جانے نظر مین اپنی کیا ھون
مگر مداح آل مصطفی ھون
فقیر مست باب میر کوثر
جیسے موج شراب ناب رہبر
وفور نشہ مین آنکھین گلابی
نجف کے میکدے کا اک شرابی

---

[1] ڈاکٹر صفدر حسین = رزم نگاران کربلا ص ۳۰۹

جسارت ہو گی حیدر کی غلامی
مجھے کافی ہے قنبر کی غلامی
یہ مجموعہ کہ ہے جنت در آغوش
کرم گستر، عطا پوش و خطاپوش
مکافات عمل کا اک ذخیرہ
حجابات گناہان کبیرہ

انہوں نے آئمہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف واقعات پر الگ الگ مناقب لکھے ہیں
عزیز کے مدحیہ قصائد کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ ہر قصیدہ ایک نام رکھتا ہے۔

ریزہ ، انقلاب ہستی، خورشید جہان تاب ، سجادیہ ، آفتاب معاد ، کاشف الحقائق، سر معرفت مہدویہ ، نغمہ ولا ، لعل شب چراغ ، نہال طوبی، بہار خضرا ، سرحقیقت ، نرگس شہلا ، تجلی ، رحیق ریحانی ، سبحۂ مرجان ، بادۂ گلرنگ ، عقیق مذاب، عقد پروین ، یاقوت احمر ، لعل بدخشان ، دریمین ، بادۂ شفق، ثمر بہشت، موجۂ کوثر ، موجۂ نسیم اور آتش پارہ

یہ نام استعارے ہیں اور ان سے بڑے لطیف مطالب نکلتے ہیں۔ عزیز کی معنی آفرینی دیکھ کر اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔

سخن میں اور تو اہل تمیز ہی ہیں فقط
شہید جلوۂ معنی عزیز ہی ہیں فقط

عزیز کی قصیدہ گوئی کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا رنگ تغزل ہے۔ قصیدہ عقیق مذاب کے یہ اشعار دیکھئے۔ یہ غزل کے اشعار سے کیونکر الگ سمجھے جا سکتے ہیں۔

کوئی آسان نہیں ہے کام لینا ضبط پنہان سے
دھوان اٹھتا رہےگا حشر تک خاک شہیدان سے
مرے اک اک نفس میں سودۂ برق جہندہ ہے
ذرا اے آسمان ہشیار رہنا آہ سوزان سے

یہ حالت دامن دشت و جہل کی ہو نہین سکتی

تباہی لے گئی ہے قرض میرے قلب ویران سے

ایک اور قصیدہ " سر معرفت ،، مین تغزل کا رنگ ملاحظہ کیجئے

سمیۂ روز بزم افروز نے جب اپنے دامان کو

کواکب کے چراغون نے کیا روشن شبستان کو

وہ شب جو رونق رخسار لیلیٰ ہے زمانے مین

وہ شب ہے رشک جس پر سرمۂ چشم غزالان کو

وہ شب جس کی سیاہی دیکھ کر گھبرا گئے عاشق

جلایا شام ہوتے ہی چراغ داغ سوزان کو

عزیز نے آئمہ کی توصیف و تعریف مین وہی باتین کہی ہین جن کا ذکر احادیث یا دیگر مذہبی روایات مین ملتا ہے۔ مثلاً حضرت علی کی شان مین جو مخمس لکھا ہے اس مین کہتے ہین -

وہ زہد زندگی بسر تمام نان جو پہ کی

وہ علم جس کا معترف ہر ایک فلسفی نبی

وہ جود جس کے سامنے خفیف ہے ہر اک سخی

وہ خلق جس سے دب گئی مخالفون کی سرکشی

صفات سب یہ جمع ہین علی سے ذی وقار مین

فقیہ وہ کہ حاملہ کو رجم سے بچا لیا

جوان وہ کہ حق نے خود خطاب لافتی دیا

خطیب وہ فصاحت رسول کو دکھا دیا

شجاع وہ کہ رستمون کو جنگ مین بھگا دیا

ظفر قدم کے ساتھ تھی ہر ایک کارزار مین

عزیز شیعہ مسلک رکھتے تھے۔ انھین جہان موقعہ ملا اپنے عقیدے کا اظہار ضرور کیا ہے یہ ان کے قصائد منقبتی کا وصف خاص ہے۔

کسی کو برتری نہین ہے شوہر بتول سے
تفوق آپ دیتے ہین بھلا یہ کس اصول سے
علی کا نسبتاً شرف صحابۂ رسول سے
حواس کو مناسبت ہو جس طرح عقول سے
حواس بھی ہمیشہ جو معطل اپنے کار سے

ڈاکٹر غلام مصطفی خان اس انداز فکر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہین۔

" ایک شاعر کو اس قسم کی چوٹ کرنے کی ضرورت نہین تھی کیونکہ اس کا کلام کسی ایک فرقے کے لئے نہین ہوتا اور خصوصاً اس زمانے مین اس قسم کے طنز سے اور زیادہ احتراز کرنا چاہیئے جبکہ غیر قومین جن مین اتحاد کا سبق ہی مفقود تھا متحد ہو رہی ہین اور پھر بھی ہم کو شرم نہین آتی ،، ۔ ص۱

لیکن ایسے ایک دو موقعون کے علاوہ جہان کہین بھی عزیز نے اپنے مخصوص عقائد کا اظہار کیا ہے وہ شاعرانہ انداز مین ایسا چھپا ہوا ہے کہ جن لوگون کو ان کے عقائد سے تعلق نہین ہے وہ بھی متاثر ہوتے ہین۔ وہ اپنی بات کو خوبی سے کہتے ہین اور یہ ان کی ذہانت کی دلیل ہے۔

عزیز نے جن بزرگون کی تعریف کی ہے ان کے حفظ مراتب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ چونکہ ان کے یہ قصائد دولت کی طلب اور مادی صلہ کے لوث سے پاک ہین اس لئے مدح اور حسن طلب دونون مین خوشگوار اعتدال پایا جاتا ہے۔

عزیز کے قصائد کی ایک اور خوبی تلمیحات کا استعمال ہے جس سے وہ اپنے قصائد کو آراستہ کرتے ہین ۔

انہین کے باب مین ہے زینوا اجمالکم
انہین کا ذکر ہے رونق فزائے ہر محفل

ص۱ مضمون عزیز لکھنوی کے قصائد ، قصیدہ نمبر صریر خامہ ـ جامعۂ سندھ

انہین کی ضربت واحد عبادۃ الثقلین

انہین کا ذکر عبادات مین ہوا شامل

صبغتہ اللہ کی بنیاد نہ قائم رہتی

گریز یہ ستم آرا سے یہ کرتے بیعت

اردو منقبت نگاری کی تاریخ مین عزیز کی عطا یہ ہے کہ انہون نے قصیدے کی فضا کو تغزل سے ہم آہنگ کیا۔ لکھنو کی خارجی شاعری مین داخلیت کی رنگ آمیزی کی۔ موضوعات مین تنوع پیدا کیا ۔ اردو شاعری کو ایک نیا راستہ دکھایا اور ان کے شاگردون مین جگت لال روان نے رباعی مین، حکیم آشفتہ لکھنوی نے مرثیہ مین، اثر لکھنوی نے اپنے موضوعات کے تنوع سے اور جوش ملیح آبادی نے سیاست و انقلاب کی ترجمانی سے مخصوص کرکے لکھنوی ادب کو نئی سمتون سے آشنا کیا۔

عزیز کے کلام مین تصنع اور بناوٹ کا سامان نہین ہے۔ انہون نے اکثر اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن مذہبی قصیدہ گوئی ان کا خاص میدان ہے۔ شکوہ الفاظ، معنویت اور علو تخیل ان کے ہر قصیدہ مین موجود ہے۔ "عزیز کے اشعار مین الفاظ اس خوبی سے نظم ہوتے ہین کہ خودبخود ایک ترنم پیدا ہو جاتا ہے جس سے کلام کی دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ طرز ادا کی ندرت اور خیال آفرینی کا ہر قدم پر خیال رہتا ہے"۔ [ص۱]

ص۱ مختصر تاریخ ادب : ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۱۸۵

دبستان لکھنو کی منقبت نگاری کا جائزہ

اردو منقبت نگاری کی تاریخ مین دبستان لکھنؤ کی منقبت نگاری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ دھلی کی تباھی کے بعد لکھنؤ ھی وہ شہر تھا جوادبا و شعرا کا ملجا و ماویٰ بنا۔ آھستہ آھستہ مقامی شاعرون نے بھی اپنا رنگ جمانا شروع کیا اور انہون نے اپنا الگ تشخص قائم کرنے کے لئے شاعری کو ایک نیا انداز دیا۔ ناسخ اس رنگ کے استاد تھے۔ چند ھی دنون مین ان کے نئے سکے نے پرانے سکون کو بازار سخن سے نکال باھر کیا۔ شاعری مین اثرآفرینی کی جگہ مضمون آفرینی اور جذبات نگاری کی جگہ خیال آرائی نے لے لی۔ خارجی رنگ داخلیت پر حاوی ھو گیا اور شعرا اپنا سارا زور شعر کی ظاھری نوک پلک سنوارنے مین لگ گئے۔

لکھنو کے سیاسی، معاشرتی اور مذھبی ماحول نے مذھبی شاعری کے فروغ کے لئے راہ ھموار کی۔ چنانچہ اس دور مین مرثیہ نے ارتقا کی منزلین طے کین اور شاعری مین اس کا اخلاقی درجہ اور ادبی حیثیت تسلیم کی گئی۔ اگرچہ انیس اور دبیر کے بعد مرثیہ کا وہ فنی معیار برقرار نہ رہ سکا تاھم مرثیہ کی روح نے لکھنؤ کی شاعری مین وہ گداز پیدا کر دیا جس سے یہ شاعری مدتون سے محروم چلی آتی تھی۔

میر ضمیر نے مرثیہ کے موضوع کو وسعتون سے ھم کنار کیا اور اس مین سراپا کو شامل کرکے جو دراصل مداحی ھی کی ایک شکل ھے مرثیہ اور منقبت کو یک جا کر دیا۔ اس دور مین عزاداری کے علاوہ آئمہ اھل بیت کے میلاد منانے کا بھی آغاز ھوا۔ چنانچہ شعرا نے محافل میلاد مین پڑھنے کے لئے مدحیہ اشعار لکھے۔ ناسخ جو بنیادی طور پر غزل کے شاعر ھین ان کے دیوان مین بھی علاوہ جستہ جستہ مدحیہ شعرون کے پانچ ایسی غزلین موجود ھین جو حضرت علی کے یوم ولادت پر لکھی گئی ھین اور جن مین علی المرتضیٰ کی ولادت پر مسرت و بہجت کا اظہار کرنے کے علاوہ ان کے مناقب بھی بیان ھوئے ھین۔

منیر شکوہ آبادی لکھنوی انداز فکر کے قصیدہ گو شاعرون مین ایک معتبر نام ھے۔ انہون نے زیادہ تر مذھبی قصائد لکھے ھین۔ یہ قصیدے عام قصائد سے اس لحاظ سے مختلف ھین کہ ان مین شاعر نے اپنے گرد و پیش کے مسائل کے علاوہ اپنی ذاتی تکلیفین اور پریشانیان بھی تفصیل سے رقم کی ھین۔ اعانت طلبی کا مضمون مذھبی قصیدہ نگارون کے ھان ایک عام سا مضمون ھے لیکن منیر کے مخصوص حالات کے پس منظر مین یہ زیادہ زوردار اور موثر بن گیا ھے۔

امیر مینائی کے کلام مین دھلی کی تاثیر اور لکھنؤ کی صفائی زبان دونون موجود ھین۔ اس لحاظ سے وہ شعرائے لکھنؤ مین امتیازی حیثیت رکھتے ھین۔ وہ بنیادی طور پر نعت گو شاعر ھین۔ حضور اکرمؐ کی ذات اقدس سے بےپناہ محبت کرتے ھین اور اسی حوالے سے اھل بیت اور دیگر بزرگان دین سے رشتۂ نیازمندی رکھتے ھین۔

عزیز لکھنوی نے لکھنؤ کی خارجی شاعری مین داخلیت کا رنگ بھرا اور لکھنوی شاعری کو نئے ذائقے سے آشنا کیا۔ انھون نے ھر قصیدے کا ایک نام رکھا۔ یہ نام استعارہ ھے جو بڑی خوبصورتی سے قصیدے کے مفہوم کو واضح کرتا ھے۔ انھون نے قصیدے مین غزل کے نقش ابھارے ھین اور اس طرح تغزل اور رنگینی ان کے قصائد کی ایک خوبی بن گئی ھے۔

بحیثیت مجموعی اس دور مین منقبت نگاری کو فروغ حاصل ھوا۔ قصائد کا موضوع اھل بیت رھے کیونکہ لکھنؤ کی مخصوص مذھبی فضا اسی کا تقاضا کرتی تھی ۔

بـاب هـفـتـم

عصر جدید کی منقبت نگاری

مولانا احمد رضا خان

حسرت موہانی

علامہ اقبال

✓ حفیظ جالندھری

جوش ملیح آبادی

جمیل مظہری

برصغیر کا سیاسی، معاشرتی اور مذہبی ماحول

۱۸۵۷ء کا سال برصغیر کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے اقتدار کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا اور انگریزوں کے پاؤں برصغیر کی سرزمین پر مضبوطی سے جم گئے۔ نئے حکمرانوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اسلئے وہ ملکی معاملات میں ان پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے " تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو " کے اصول کو اپنایا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ الگ کیمپوں میں تقسیم کرکے ان کے مذہبی اختلافات کو ہوا دینی شروع کی۔ اب مسلمان دو پاٹوں میں پسنے لگے۔ ایک طرف انگریز تھے اور دوسری طرف ہندو۔ رجعت پسند علماء نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کے قریب نہ جانے دیا۔ کاروبار اور تجارت کا شوق ان میں نہیں تھا۔ چنانچہ سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ معاشی و معاشرتی اور اخلاقی زوال بھی شروع ہو گیا۔ اس شکست خوردہ قوم کی جذباتی بحالی اور کارزارحیات میں اس کو مصروف کار رکھنے کے لئے سرسید اور ان کے ساتھیوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں اور انگریزوں کی غلط فہمیاں دور کرائیں بلکہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے علیگڑھ میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا جو ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا یونیورسٹی کی صورت میں آج بھی علم کی روشنی بانٹ رہا ہے۔

انگریزی تعلیم کے زیراثر تعقل پسندی کا دور شروع ہوا۔ توہمات اور ضعیف الاعتقادیوں سے لوگ پیچھا چھڑانے لگے۔ اس سے شاعری بھی متاثر ہوئی۔ حالی نے اصلاح شاعری کی تحریک شروع کی اور مبالغہ، تصنع اور تکلف کی جگہ اصلیت اور سادگی نے لے لی۔ انگریزی تعلیم نے افراد کی آزادی اور ان کی اہمیت کے مسائل کو واضح کیا اور فرد اور معاشرے کے تعلق کو سمجھایا اور اس طرح برصغیر کا معاشرے میں جو اپنے انحطاط کے انتہائی نقطہ کی طرف تیزی کے ساتھ حرکت کر رہا تھا ٹھہراؤ پیدا ہوا اور سرسیّد ، حالی، شبلی، محسن الملک، وقار الملک اور دیگر اکابرین کی کاوشوں سے مسلمانوں کی حیات نو کا آغاز ہوا ۔

مولانا احمد رضا خان (۱۲۷۲ھ تا ۱۳۴۰ھ)

مولانا احمد رضا خان ایک جامع الکمالات شخصیت تھے۔ وہ مفسر، محدث اور علوم فقہی کے ممتاز عالم تھے اور ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ انھون نے اپنا سارا زور کلام نعت و منقبت کے میدان مین صرف کیا اور اپنی زبان کو کبھی کسی دنیادار کی مدح سے آلودہ نہین کیا۔

کرون مدح اہل دول رضا، پڑے اس بلا مین مری بلا

مین گدا ہون اپنے کریم کا، مرا دین پارۂ نان نہین

مولانا کا تعلق علمائے دین کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ علوم ظاہری کے علاوہ فقر اور درویشی بھی انہین ورثے مین ملی تھی۔ ان کے گھر مین میلاد کی محفلین منعقد ہوتی تھین۔ اس لئے عالم طفولیت ہی سے ان کے دل مین حب رسول کا جذبہ موجزن ہو گیا تھا۔

حدائق بخشش ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔ حب رسول کے حوالے سے ان کے موضوعات کو تین حصون مین تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا موضوع نعت کا ہے جس مین سرورکائنات سے فرط عقیدت اور وفور محبت اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہے۔ دوسرا موضوع حضور اکرم کے اصحاب اور اہل بیت سے شیفتگی کا اظہار ہے اور تیسرا جہاد و اعزاء رسول کے بدخواہون کے خلاف نفرت کا جذبہ ہے۔

دوسرا اور تیسرا موضوع آپس مین اس طرح گھل مل گیا ہے کہ اسے ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مولانا نے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق، خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق، سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، پیران پیر غوث الاعظم جیلانی اور مولانا سید احمد نوری میان کے مناقب لکھے ہین۔ ان مناقب کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری جو پہلا تاثر قبول کرتا ہے وہ مولانا کی علمی وجاہت ہے۔ مولانا اردو منقبت نگاری کی تاریخ مین واحد شخصیت ہین جنھون نے اپنے وسیع مطالعہ کو پوری طرح اپنی شاعری مین استعمال کیا ہے۔ انھون نے اپنے ممدوحین کی تعریف مین قرآن و حدیث سے لے کر ہیئت و نجوم، ہندسہ، طب، منطق، مابعدالطبیعات وغیرہ علوم و فنون کی مختلف مصطلحات کو بڑے سلیقے سے برتا ہے۔

ذیل مین چند اشعار دیئے جاتے ہین جن سے مولانا کی ذہانت اور ان کے علمی مقام و مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق کے بارے مین

یہی ھین اکرمکم اور یہی ھین اتقیٰ کم

یہی ھین ثانی اثنین از ھما فی الغار (قرآن مجید)

حضرت عائشہ صدیقہ کے بارے مین

تیرے جلوے سے رھی مسند افتا روشن

عہد صدیق سے تا دور حیات حیدر (تاریخ)

منقبت عمر فاروق کا ایک شعر

نظر سوئے لو کان بعدی نبی

خیال اقتدوا بالذین کی جانب (حدیث)

منقبت غوث الاعظم جیلانی کا مطلع

واہ کیا مرتبہ اے غوث ھے بالا تیرا

اونچے اونچون کے سرون سے قدم اعلیٰ تیرا (فرمودہ غوث الاعظم)

مولانا کے کلام منقبت مین وہ قصیدہ[۱] خاص طور پر قابل ذکر ھے جو حضرت عمر فاروق کی شان مین لکھا گیا ھے۔ اس قصیدے مین ۲۱۶ اشعار ھین اور یون محسوس ھوتا ھے کہ یہ منقبت محض رسمی طور پر نہین لکھی گئی بلکہ جب عمر فاروق نے ان سے یہ اشعار لکھوائے ھین۔ پہلے حصے مین فضائل عمر بیان ھوئے ھین، دوسرے مین نعت و منقبت آل اصحاب ھے۔ تیسرے مین " تعریف تیغ حضرت عمر فاروق،، ھے۔ چوتھے مین عہد فاروقی مین غازیان اسلام کے جہاد کا ذکر ھے۔ پانچوین مین حضرت عمر کے اشہب تیزگام کا وصف ھے۔ چھٹے مین تعریف " سگ درگاہ،، ھے۔ ساتوین مین حضرت کے مخالفین کی مذمت ھے۔ آٹھوین مین بدعتیون کی ھجو ملیح ھے۔ نوین مین ان کے لئے بددعا" بطرز دعا،، ھے اور آخر مین متفرقات کے عنوان سے متفرق مضمون باندھے ھین۔ یہ قصیدہ چھوٹی بحر مین لکھا گیا ھے مگر آیات قرآنی، اقتباسات حدیث، تلمیحات، استعارات و تشبیہات کے علاوہ دیگر علوم و فنون کے حوالے مولانا کے بتحر علمی کی گواھی دیتے ھین۔ یہان الفاظ کا شکوہ اور طنطنہ موجود ھے جو مصنف کی قادرالکلامی

---

[۱] حدائق بخشش، حصہ سوم ص ۱۸

کا ثبوت ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اس قصیدے کی زبان اور خاص طور پر بعض قوافی مثلاً اکارب ، کواعب ، شوائب ، مآرب ، رکائب ، مشاغب ، ذوائب وغیرہ ایسے ہیں جو عام قاری کے لئے تفہیم مطالب میں رکاوٹ کھڑی کرتے ہیں۔ مولانا کو شاید خود بھی احساس تھا کہ ان کی زبان عام قاری کو ذہنی صلاحیتوں سے بہت بلند ہے لیکن ان کے علمی مقام اور مرتبے کے سامنے اس کی حیثیت روزمرہ کی سی تھی۔

اور ایسے تو بھاری لغت بھی نہیں ہیں
کہ کاہل کو ہوں سدِّ راہ مطالب
جیسے ہوں وہ خود اپنی دانش سے الجھے
ہمارا تو یہ روزمرہ ہے صاحب

مولانا کا یہ قصیدہ ایسے دلپذیر استعاروں سے مزین ہے کہ اردو کی پوری منقبتی شاعری اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ انہوں نے صحیح کہا ہے

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلّم
جس سمت آ گئے ہو سکّے بٹھا دیئے ہیں

عہد فاروقی میں غازیان اسلام کفار کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ اس کا بیان استعاراتی زبان میں دیکھیئے اور مولانا کے حسن بیان اور محاسن کلام کا اندازہ لگائیے۔

بڑھے جھومتے کالی وردی کے بادل
چھپی بادلہ پوش فوج کواکب
ہوئی کالے گھوڑے کی پلٹن میں بدلی
کہ بدلی کے آتے ہی تارے تھے غائب
طلا یہ ہٹا فوج جنگی بڑھ آئی
کہ خود حملہ کرنا ہی ٹھہرا مناسب
جلو ریز جاؤ، بہت خیز جاؤ
ابھی صاف کر لو مشارق مغارب

حضرت عمر فاروق کے تیز گام گھوڑے کا ذکر کر رہے ہیں۔ ذرا ندرت تشبیہہ ملاحظہ ہو

مچلنے مین بچپن کسی تند خو کا بکھرنے مین ناز بتان کواعب

دو اور مناقب جن کے بغیر مولانا کی منقبت نگاری کا تذکرہ مکمل نہین ہوتا وہ ہین جو انہون نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی شان مین لکھے ہین۔ پہلی منقبت ایک چہار غزلہ ہے جس کا تاریخی نام ذریعۂ قادریہ (۱۳۰۵) ہے۔ ہر غزل مین ۲۵، ۲۵ اشعار ہین۔ پہلی غزل نعتیہ ہے دوسری در منقبت آقائے اکرم حضور غوث اعظم ہے۔ تیسری " درحسن مفاخرت از سرکار قادریت ،، ہے اور چوتھی " در منافعت اعدا و استعانت از آقا ،، ہے ۔ اس چہار غزلے کو اگر قصیدہ قرار دیا جائے تو بجا ہے۔ پہلی غزل بطور تشبیب کے اس کا مقطع بطور گریز، دوسری اور تیسری بطور مدح اور چوتھی بطور دعا کے کام دے سکتی ہے۔ یہ نعتیہ تشبیب اردو قصیدہ نگاری کی تاریخ مین انوکھی اور منفرد ہے۔

اس کا آغاز یون ہوتا ہے۔

واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا

نہین سنتا ہی نہین مانگنے والا تیرا

نعت سرور کونین کے بعد شاعر گریز یون کرتا ہے

تیری سرکار مین لاتا ہے رضا اس کو شفیع

جو میرا غوث ہے اور لاڈلا بیٹا تیرا

اس کے بعد مدح کا مضمون شروع ہوتا ہے جس مین مولانا کی علمی استعداد کےعلاوہ ان کی شاعرانہ صلاحیت ، تخلیقی صنعت گری، قادرالکلامی اور زوربیان کے نمونے دیکھے جا سکتے ہین۔ اب تک مولانا ایک ممتاز عالم دین اور گستاخان رسول کے لئے ضرب کوہ شکن کے علاوہ اپنی نعت گوئی کے لئے مشہور ہین ۔ ان کی منقبت نگاری پر کسی نے غور کرنے کی زحمت گوارا نہین کی۔ انہون نے جس طرح حضور اکرم کی ہمہ جہت ہستی کے فضائل و برکات کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن و حدیث کو سامنےرکھا ہے اسی طرح بزرگان دین کے مناقب بیان کرتے ہوئے بھی انہون نے احتیاط کا دامن نہین چھوڑا اور اپنی وارفتگی اور شیفتگی کے باوجود آداب شریعت کو ملحوظ خاطر رکھا ہے ۔ انہون نے شریعت کا پاس کرتے ہوئے اشعار کی رنگینی، محاورات کی لطافت، مضامین کی دلکشی، تشبیہات کی عمدگی، استعارات کا حسن، دلکشی ،

صا مولانا احمد رضاخان بریلوی کی نعت گوئی = غیرمطبوعہ = از بشیراحمد قادری ص ۲۶۱

تشبیہات کی عمدگی، استعارات کا حسن، علمی اصطلاحات، آیات و احادیث کے اقتباسات، فرض شاعری کے تمام لوازم اکٹھے کر دیئے ھین۔ اسلئے کہتے ھین ـ

جو کہے شعر و پاس شرع دونون کا حسن کیونکر آئے
لا اوسے پیش جلوۂ زمزمۂ رضا کہ یون

انہون نے عقیدت اور محبت کے ھاتھون مرعوب ھو کر حمد، نعت اور منقبت کو گڈ مڈ نہین کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ھون۔

سر بھلا کیا کوئی جانے کہ ھے کیسا تیرا
اولیا ملتے ھین آنکھین وہ ھے تلوا تیرا
نبوی مینہ، علوی فصل، بتولی گلشن
حسنی پھول، حسینی ہے مہکنا تیرا
نبوی ظل، علوی برج، بتولی منزل
حسنی چاند، حسینی ھے اجالا تیرا
عرض احوال کی پیاسون مین کہان تاب مگر
آنکھین اے ابر کرم تکتی ھین رستا تیرا

سرکار غوثیت سے محبت و شیفتگی کا نقطۂ عروج دیکھیئے

تجھ سے در، در سے سگ اور سگ سے ھے مجھ کو نسبت
میری گردن مین بھی ھے دور کا ڈورا تیرا
اس نشانی کے جو سگ ھین نہین مارے جاتے
حشر تک میرے گلے مین رھے پٹا تیرا
میری قسمت کی قسم کھائین سگان بغداد
ھند مین بھی ھون تو دیتا رھون پہرا تیرا

مولانا نے حضور اکرم کے بعد جس شخصیت کو ٹوٹ کے چاھا ھے وہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی ذات گرامی ھے۔ یون محسوس ھوتا ھے کہ وہ شاعری نہین کر رھے بلکہ پیران پیر سے بالمشافہ ھم کلام ھو کر اپنے دل کی بات کہہ رھے ھین۔ دوسرا قصیدہ حدائق بخشش کے دوسرے حصے مین ھے۔ اس کے لئے

مولانا نے بڑی روان دوان بحر استعمال کی ہے۔

ترا ذرہ مہ کامل ہے یا غوث

ترا قطرہ یم سائل ہے یا غوث

فصل اول میں فضائل سرکار غوثیت بیان ہوئے ہیں۔ وصل دوم کا عنوان " فضائل غریبطرز دگر" ہے۔ وصل سوم " تفضیل حضور در غم ہر عدو و مقہور" ہے اور وصل چہارم استعانت از سرکار غوثیت ہے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وہ حمد ، نعت اور منقبت کے فرق کو سمجھتے ہیں اور اسے ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرتے۔ اس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں۔

الوہیت ، نبوت کے سوا تو

تمام افضال کا قابل ہے یا غوث

صحابیت ہوئی پھر تابعیت

بس آگے قادری منزل ہے یا غوث

استعارے کا حسن اور تشبیہ کا کمال دیکھئے

تری چڑیاں ہیں تیرا دانہ پانی

تیرا میلہ تیری محفل ہے یا غوث

قمر پر جیسے خور کا یوں تیرا قرض

سب اہل نور پر فاضل ہے یا غوث

مولانا کا دور مسلمانوں کے سیاسی ، معاشرتی اور مذہبی زوال کا دور تھا۔ برصغیر میں انگریزی استعمار کے پنجے مضبوطی سے گڑ چکے تھے اور وہ مسلمانوں کو دبانے کے لئے دیگر ہتھکنڈوں کے علاوہ غیر مسلم اقوام کو بھی ان کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے اس دور ابتلا میں حالی نے سب سے پہلے ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ایک دعائیہ اس انداز میں پیش کیا

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے

امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے

پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

مولانا سرکار غوثیت سے اعانت کے طلبگار ہوتے ہین اور انفرادی یا ذاتی مسائل کے حل کی بجائے مسلمانون کی اجتماعی بہتری کے لئے درخواست گزار ہوتے ہین۔ اس دور مین اجتماعی شعور بیدار ہو رہا تھا اور مسلمانون کو خواب غفلت سے جگانے کے لئے اکابرین ملت اپنے اپنے انداز مین جدوجہد کر رہے تھے۔ یہ اشعار دیکھئے

طلب کا منہ تو کس قابل ہے یا غوث
مگر تیرا کرم کامل ہے یا غوث
دوہائی یا محی الدین دوہائی
بلا اسلام پر نازل ہے یا غوث
جلا دے دین، جلا دے کفر و الحاد
کہ تو محی ہے تو قاتل ہے یاغوث
رہی ہان شامت اعمال یہ بھی
جو تو چاہے ابھی زائل ہے یاغوث

جن مناقب کا اوپر ذکر ہوا ہے ان کے علاوہ مولانا کے معروف سلام

مصطفی جان رحمت پہ لاکھون سلام

مین بھی خلفائے راشدین اور دیگر بزرگان دین کی منقبت مین اشعار موجود ہین

حضرت صدیق اکبر کی شان مین کہتے ہین

سایہ مصطفی مایۂ اصطفا، عز و ناز خلافت پہ لاکھون سلام
یعنی اس افضل الخلق بعد الرسل، ثانی اثنین ہجرت پہ لاکھون سلام

حضرت فاروق اعظم کی مدح مین لکھتے ہین

فارق حق و باطل امام الہدی، تیغ مسلول شدت پہ لاکھون سلام
ترجمان نبی، ہم زبان نبی جان شان عدالت پہ لاکھون سلام

حضرت عثمان کی تعریف مین رقم طراز ہین

در منثور قرآن کی سلک بہی زوج دو نور عفت پہ لاکھون سلام
یعنی عثمان صاحب قمیص ہدی حلہ پوش شہادت پہ لاکھون سلام

حضرت علی کی منقبت مین یون گویا هین

مـرتضـلی شیر حق الشجع الاشجـعـین
ساقیٔ شیر و شربت پہ لاکھـون ســلام
اصل نسل صـفا ، وجہ وصــل خـــدا
بـاب فصل ولایت پـہ لاکھـون ســلام

دیگر اهل بیت کا ذکر یون کرتے هین

اور جتنے هین شہزادے اس شاہ کے
ان سب اهل مکانت پہ لاکھون سلام
ان کی بالا شرافت پہ اعـلٰی درود
ان کی والا سیادت پہ لاکھون سلام

اس کے بعد فقاکے آئمہ امام ابو حنیفہ ، امام شافعی ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے علاوہ غوث الاعظم جیلانی اور دیگر بزرگان دین کو بھی سـلام کا هدیہ پیش کـیا هے۔ مولانا جس طرح نعتیہ شاعری مین ایک خاص مقام کے حامل هین اسی طرح منقبت نگاری کی تاریخ مین انہین ایک بلند مرتبۂ حاصل هے ۔

حسرت موهانی (١٨٧٨ء تا ١٩٥١ء)

حسرت موهانی غزل کے شاعر هین۔ انهین رئیس المتغزلین کہا جاتا هے۔ محبت کا ذکر ان کے هان رسمی اور روایتی طور پر نهین آیا۔ تصوّراتی اور افلاطونی عشق ان کا موضوع نهین رها۔ ان کا عشق مادی اور حقیقی هے۔ اس مین کامیابی کی چهل پهل اور همه همی محسوس کی جا سکتی هے۔ لیکن غزل گو اور محبت کے گیت گانے والے حسرت کے ساتھ هم زیادہ دیر تک سفر نهین کر سکتے۔ همارا تعلق اس حسرت کے ساتھ هے جو اس حسرت کے اندر مذهب کی چادر لپٹ کر چهپا هوا هے۔ جو اولیائے کرام کا مدح خوان هے، جو شیخ عبدالقادر کو اپنے غمون اور دکھون مین پکارتا هے اور جو اهل بیت کا والا و شیدا هے۔ همین یه دیکھنا هے که جب اس کی روح مذهب کی پهوار مین بهیگتی هے تو اس کی کیفیت کیا هوتی هے اور اپنے ان خصوصی لمحات مین محبت کے عمومی مجاز کو چهوڑ کر وہ اپنی جهت کس طرح تبدیل کرتا هے۔

حسرت صاحب نسبت تهے۔ اپنے مرشدین سے اکتساب فیض بهی کرتے تهے۔ ان کے سلسلہ طریقت مین صفائے باطن اور تهذیب و اخلاق کے ساتھ ساتھ شریعت کی کامل پابندی لازمی تهی۔ وہ وحدت الوجود اور وحدت الشهود کی بهول بهلیون مین نهین الجهے۔ انهون نے اپنا سلوک دو مصرعون مین بیان کر دیا هے۔

پڑهیئے اس کے سوا نه کوئی سبق   خدمت خلق و عشق حضرت حق

مولانا نے انٹرنس کا امتحان فتح پور هسوہ سے پاس کیا تها۔ فتح پور هسوہ کا ذکر کرتے هوئے سید سلیمان ندوی لکھتے هین ۔

" فتح پور هسوہ کی آب و هوا حسرت کی ادبی و ذهنی و دینی تعلیم کے لئے بهت راس آئی۔ یهان مولانا سید ظهورالاسلام صاحب ایک نهایت متقی و پرهیزگار اور باصفات بزرگ تهے ۔ حضرت قطب الوقت مولانا شاہ فضل الرحمان صاحب گنج مرادآبادی کے مرید و خلیفه تهے۔ ندوة العلماء کے ارکان خاص مین سے تهے۔ اس لئے خاکسار کو بار بار ان کی زیارت کا موقع ملتا رها بلکه میرے بچپن مین وہ مولانا محمد علی صاحب مونگیری کے ساتھ خاکسار کے وطن دلینه ضلع پٹنه تشریف لائے تهے تو پهلے پهل وهین ان کی زیارت هوئی تهی۔ حسرت مرحوم کو انهی پاک مشرب و پاک نهاد اور پاکباز

بـزرگ کی صحبت حاصل ھوئی تھی۔ ان کے علاوہ مولانا نورمحمـد اور مولانا حبیب الدین صاحب جیسے
بزرگون کا فیض بھی نصیب ھوا۔" [1]

مولانا کو عہد طفولیت ھی سے حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی سے نسبت خاص تھی۔ وہ ان کے معتقد اور ارادت مند تھے۔ چنانچہ انوار رزاقیہ (سوانح مولانا شاہ عبدالرزاق) پر تبصرہ کرتے ھوئے لکھتے ھین۔

" ھمارے حضرت کا ولی کامل، امام وقت اور غوث دوران ھونا ارباب نظر اور اھل تحقیق کے نزدیک مسلم ھے۔ خوش قسمت ھین وہ لوگ جن کو حضور کی زیارت نصیب ھوئی۔ جن کو یہ دولت نصیب ھوئی انھین بھی کم سے کم اس کتاب کے مطالعے سے فیض یاب ھونا لازم ھے"۔ [2]

مولانا عبدالرزاق کے وصال کے بعد ان کے جانشین مولانا عبدالوھاب صاحب سجادہ ھوئے۔ حسرت نے ان سے باقاعدہ بیعت کی اور وہ خود راوی ھین کہ یہ بیعت بعض قلبی شکوک دور ھو جانے کی وجہ سے کی گئی۔ اس مقطع مین اسی واقع کی طرف اشارہ ھے۔

کـیا چیز تھی وہ مـرشد وھاب کی نـگاہ
حسـرت کو جس نے عـارف کامـل بـنادیـا

اور اسی سلسلہ سے سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللّٰہ علیہ سے ان کو عقیدت خاص تھی اور بزرگان فرنگی محل سے بھی ان کو نسبت حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ھزارون انقلابات کے باوجود حسرت اپنی زندگی اور صوفیانہ مشرب مین ھمیشہ غیر متـزلزل رھے۔

حسرت موھانی نے اپنے بزرگان طریقت کی مدح مین جو اشعار لکھے ھین وہ تکلف اور تصنع سے پاک ھین اور ان کے اسلوب خاص کے نمائندہ اشعار ھین۔ ان مین زیادہ تر ان کیفیات کا ذکر ھسے جو خود ان پر وارد ھو چکی ھین مثلاً قید کے دوران انھین بلا اطلاع فیض آباد جیل سے سنٹر جیـل لایا گیا ۔ مولانا قیـد تنھائی مین تھے اور بندگاڑی مین لکھنـؤ لائے گئے۔ انھین کسی طرح بھی یہ معلوم نہ ھو سکا کہ وہ کس جگہ ھین۔ پہلی ھی شب کو انھون نے خواب مین حضرت شاہ عبدالرزاق کی

---

[1] مضمون حسرت کی سیاسی زندگی= نگار پاکستان حسرت موھانی ص ٤٧

[2] اردوئے معـلّی [1۲] اگست ۲۸ء

زیارت کی۔ حضرت نے تسلی دی اور پھر فرمایا کہ وہ قریب ہیں اور جتنے دن وہ لکھنؤ جیل میں رہے ہر روز زیارت حضرت سے مشرف ہوتے رہے۔ حسرت نے انہیں دنوں یہ غزل لکھی :۔

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزل جاناں کے قریب

حشر میں اپنے گناہوں سے مجھے خوف ہو کیا
ان کی رحمت بھی تو ہے منزل عصیاں کے قریب

لکھنؤ آنے کا باعث یہ کھلا آخر کار
کھینچ لایا ہے دل اک شاہد پنہاں کے قریب

وہ جو ہیں پاس تو محبس بھی ہے اک باغ ہمیں[1]
کامرانی بھی نمودار ہے حرماں کے قریب

روز ہو جاتی ہے رویا میں زیارت حسرت
آستان شہہ رزاق ہے زنداں کے قریب

حسرت کو غوث الاعظم جیلانی سے والہانہ شیفتگی تھی اور ان کا عقیدہ تھا کہ جو بھی خواہش دربار غوثیت میں کرتے ہیں وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ جب وہ زمانہ جنگ میں بغداد شریف دربار غوث الاعظم میں حاضری کے لئے گئے تو دعا کی کہ روس کو شکست نہ ہو۔ لڑائی کے خاتمے پر کہا کرتے تھے کہ ان کی یہ دعا بھی قبول ہوئی۔ حضرت غوث پاک کی شان میں ایک ایسی غزل ہے جو بعض قادری سلسلوں میں وظیفے کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔

دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للّٰہ
میر بغداد میں بیمار ہوں شیئاً للّٰہ

حال دل شرم سے اب تک نہ کہا تھا لیکن
آج میں درپئے اظہار ہوں شیئاً للّٰہ

کرم خاص کے لائق تو نہیں ہوں پھر بھی
آپ کا حاشیہ بردار ہوں شیئاً للّٰہ

---

[1] درگاہ شریف "باغ مولوی انوار"، کے نام سے مشہور ہے

مجھ سے اب دین کی پستی نہین دیکھی جاتی
غلبۂ کفر سے بیزار ہون شیئاً للہ

کیا کرون میری دعا بھی تو نہین ہے قبول
مین کہ اک ذرّہ گنہگار ہون شیئاً للہ

غوث اعظم سے جو مانگو گے ملے گا حسرت
بس کہ حاضر دربار ہون شیئاً للہ

یہان مقطع مین انہون نے اپنے مستحکم عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ اہل اللہ اپنے وصال کے بعد بھی لوگون کی امداد کرتے ہین اور انہین صحیح راستہ دکھاتے ہین۔ ان کے رشد و ہدایت کا سلسلہ ان کے انتقال کے بعد ختم نہین ہو جاتا۔ غوث الاعظم کی مدح حضور اکرمؐ، امام حسنؑ، اور امام حسینؑ کے حوالے سے کرتے ہین۔

علی کے لال زہرہ کے دلارے
رسول اللہ کی آنکھون کے تارے

نمو ہے شیوۂ خلق حسنؑ کے
نمایان ہین تیری سیرت مین سارے

حسین ابن علی کی شان تسلیم
تیری جانب کو کرتی ہے اشارے

ایک اور غزل مین اولیائے کرام کی عموماً اور شہزادۂ گلگون قبا حضرت امام حسین کی خصوصاً توصیف اس طرح کی ہے۔

آئی ہوئی رضائے الٰہی کی ہے برات
سب کربلا مین جمع ہین مہمان اولیاء
گلگون لباس خون شہادت پہن کر آج
دولہا بنے گا وہ شہہ خوبان اولیاء

زنجیر و طوق ظلم کا عابد کو غم نہین
ہم رنگ بزم عیش ہے زندان اولیاء
جانین عوض ہین جن کی رہ شوق مین نثار
حاشا جو ہون فدا و تن آسان اولیاء
حضرت حسین ابن علی کا ہون مین غلام
حاصل ہے مجھ کو فضل نمایان اولیاء

کچھ اور غزلون کے مطلع یون ہین :-

وہ ہون جیلان سے آ کر میر بغداد
رہے قسمت خوشا تقدیر بغداد

ہوس اچھی ہے اپنے سر کی ہوس
غوث الاعظم کے سنگ در کی ہوس

کرو کچھ تو ارشاد یا غوث اعظم
سنو میری فریاد یا غوث اعظم

میسر ہے شاہ نجف کی غلامی
زہے کامرانی، زہے شادمانی

گرہون کی رہنمائی کیجئے   یا علی مشکل کشائی کیجئے

مولانا نے اپنی نعتون مین بھی منقبتیہ اشعار کہے ہین۔ منقبت مین نعت کا رنگ تو کئی دوسرے شاعرون کے یہان بھی مل جاتا ہے لیکن اردو کے نعتیہ اشعار مین منقبت کا رنگ انہین سے مخصوص ہے۔

رهنمائے گمرہان و سرگروہ مقبلان
عاشق و معشوق یزدان ، جان و جانان رسول

مقتدر کے مالکان و مخزن اسرار حق
پادشاہ عاشقان و گنج عرفان رسول

نور چشم فاطمہ ، مہر درخشان علی
غوث اعظم شاہ جیلان ماہ تابان رسول

حسرت محروم ہے امیدوار التفات
اس طرف بھی اک نظر اے میر سامان رسول

علی آگاہ جس سے ہو کے باب علم کہلائے
وہ راز عشق ہم کو بھی بتا دو یا رسول‌اللہ

حسین ابن‌علی کے صبر نے جس کے مزے لوٹے
ہمین بھی اس بلا کا حوصلہ دو یا رسول‌اللہ

تمنائے محبت کو لقائے غوث اعظم کی
ہمین بغداد کا رستہ دکھا دو یا رسول اللہ

حسرت نے منقبت لکھتے ہوئے غزل کی ہیئت استعمال کی۔ غزل جو شوخ و سنگ، ظالم اور ستم گر محبوب کی کج ادائیوں اور بے‌اعتنائیوں کے ذکر سے بھرپور تھی۔ منقبت نگاری مین غزل کا آئینہ وہی ہے لیکن اس مین خود‌بین و خود آراٗ محبوب کی تصویر غائب ہو جاتی ہے اور ایک محترم اور مقدس شخصیت ابھرتی ہے جس کے اشارے سے مایوسیان اور محرومیان کافور ہو جاتی ہین۔ جس کی نگاہ کرم سے بگڑے کام سنور جاتے ہین اور آسودگی کے دروازے کشادہ ہو جاتے ہین۔ تصویر بدلنے کے ساتھ ساتھ شاعر کا زاویۂ نگاہ بدلتا ہے اور اس کا لب و لہجہ ایک نیا رنگ اختیار کرتا ہے ۔

لطف کی ان سے التجا نہ کرین
ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کرین

اب ان کا انداز ملتجیانہ ہو جاتا ہے۔

دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للّٰہ
میر بغداد میں لاچار ہوں شیئاً للّٰہ

پہلے وہ حسن محبوب کی تعریف یوں کرتے تھے

چاندنی رات میں پھولوں کا ہے زیور کیا خوب
رنگ لائے گا تیرا حسن معطر کیا خوب

اب وہ اولیاء کی شان میں مختلف زاویئے سے بات کرتے ہیں ۔

روشن ہے نور صبر و سکون سے سواد شام
تاباں ہے صبح عشق درخشان اولیاء

پہلے محبوب سے عرصہ تک ملاقات نہیں ہوتی تھی تو باد صبا سے پیغام رسانی کا کام لیا جاتا تھا ۔

ہماری داستان بے قراری بھی سنا دیجئو
گزر تیرا تو اے باد صبا ان کے مکاں تک ہے

اور اب یہ صورت ہے

روز ہو جاتی ہے رویاً میں زیارت حسرت
آستان شہ رزاق ہے زندان کے قریب

حسرت نے منقبت نگاری میں بھی غزل کی زبان کو استعمال کیا ہے۔ ان کی علامتیں اور استعارے وہی ہیں جو غزل کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس سے تغزل کی فضا قائم رہتی ہے۔ استعارے کا حسن و جمال برقرار رہتا ہے لیکن ان میں تقدس اور احترام کی فضا جاری و ساری نظر آتی ہے جو غزل سے الگ اور منقبت کے ساتھ ہی مخصوص ہے ۔

عـلامـہ اقـبـال (۱۸۷۷ء تا ۱۹۳۸ء)

عـلامہ اقبال نے مذھب کی آغوش مین آنکھ کھولی۔ ان کے والد اھل اللہ مین سے تھے۔ عطیہ فیضی اپنی انگریزی کتاب " اقبال ،، مین لکھتی ھین کہ

" ان کے والد نے ایک ولی اللہ کی ھدایت کے مطابق مضمون ریاضت اور چلہ کشی کی تھی اور اقبال کو لڑکپن ھی مین علوم باطن خود سکھائے تھے،، ص[1]

جن اساتذہ سے اقبال نے کسب فیض کیا ان مین سے سید میر حسن ایک ممتاز علمی شخصیت تھے۔ صوفی منشی ان کا وصف خاص تھا۔ چنانچہ صوفیاء سے عقیدت علامہ اقبال کی شخصیت کا جزو بن گئی۔ وہ بیعت کی اھمیت کے بھی قائل تھے چنانچہ انھون نے مہاراجہ سرکش پرشاد کو اپنے بیٹے آفتاب اقبال کے بارے مین لکھا

" لـڑکا دھلی کالج مین پڑھتا ھے۔ ذھین و طباع ھے مگر کھیل کود کی طرف زیـادہ راغب ھے۔ آج کل اس فکـر مین ھون کہ اس کو کہین مرید کرا دون یا اس کی شادی کر دون کہ اس کے ناز مین نـیاز پیدا ھو جائے،، ص[2] عـلامہ خود بھی اپنے والد سے قادری سلسلے مین بیعت تھے۔

سرکار دوعالم ص سے علامہ کو بےپناہ محبت تھی۔ وہ حضور کی ذات گرامی کو تمام کمالات ظاھر و باطن کا مجموعـہ تصور کرتے تھے اور تمام مظاھرہ حقیقت و مجاز کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ وہ کہتے ھین

بمصطـفےٰ برسان خویش را کـہ دین ھمـہ اوست

اگـر بہ او نـرسـیدی تـمام بـولہبـی سـت

عـلامہ کی طبیعت مین اس قدر سوز و گداز تھا اور وہ حب رسول سے اسقـدر سرشار تھے کہ جب کبھی حضور کا ذکر خیر ھوتا تو دیر تک روتے رھتے ۔ حضور رسالت مآب سے انھین جـو وابستگی تھی اس کی وجہ سے انھین اولیائے کرام سے بھی خاص عقیدت تھی اور وہ ان کے مزارات پر اکثر

ص[1] بحوالہ سیـرت اقبـال : طاھـر فـاروقی ص ۹۷

ص[2] ایضـــــــــاً ص ۹۹

حاضر ہوا کرتے۔ لاہور مین حضرت داتا صاحب اور شاہ محمد غوث کے مزارات پر اکثر جاتے اور اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے۔ علامہ بزرگون کے روحانی فیوض کے قائل تھے اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ صاحب مزار اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے سوالیون کی امداد فرماتے ہین۔ چنانچہ انگلستان جانے سے قبل وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر دعا کے لئے حاضر ہوئے۔ اس وقت ان کے جومحسوسات تھے ان کا ذکر انہون نے اپنی نظم " التجائے مسافر،، مین کیا ہے۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتاہے۔

فرشتے پڑھتے ہین جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تیری، فیض عام ہے تیرا

پہلے بند مین حضرت نظام الدین اولیاؒ کی مدح کرنے کے بعد اپنی معروضات پیش کرتے ہین کہ شراب علم کی لذت مجھے وطن کے نگارخانے سے دور لے جا رہی ہے۔ مین کبھی کسی انسان کا محتاج نہین رہا۔ میری مثال اس درخت صحرا کی ہے جو صرف ابرکرم پر انحصار کرتاہے۔ پھر حضرت سے دعا کی درخواست کرتے ہوئے کہتے ہین کہ مجھے دنیا مین بلند مقام عطا ہو۔ مین اپنےہم سفرون سے آگے نکل جاؤن۔ میرے قلم سے کسی کے جذبات مجروح نہ ہون اور دنیا مین کوئی شخص میرا گلہ گزار نہ ہو۔ مین بخیریت واپس آؤن اور اپنے والدین کے قدمون مین جبین سائی کر سکون۔

اپنے ذکر کے بعد وہ اپنے استاد سید میر حسن کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہین

وہ شمع بارگہ خاندان مصطفوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستان مجھ کو
نفس سے جس کے کھلیمیری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ دان مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمین
کرے پھر اس کی زیارت سے شادمان مجھ کو

پھر اپنے بھائی کے لئے دعا کے طالب ہوتے ہین۔

وہ میرا یوسف ثانی وہ شمع محفل عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرار جان مجھ کو

ریاض دہر میں مانند گل رہے خنداں

کہ ہے عزیز تر از جان وہ جان جان مجھ کو

یہ نظم " التجائے مسافر " اپنے دور کی ایک فکری تبدیلی کا پتہ دیتی ہے۔ سرسید اور ان کے رفقاؑ کی کوششوں سے مسلمانوں میں اجتماعی شعور بیدار ہو رہا تھا اور ذاتی اور انفرادی سوچ کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اقبال اس نظم میں جہاں اپنے لئے دعا کے طالب ہوئے ہیں وہاں اپنے والدین، اپنے استاد اور اپنے بھائی کو بھی نہیں بھولے اور انہوں نے والدین اور استاد کی درازیٔ عمر اور بھائی کی مسرت و بہجت کے لئے بھی دست دعا دراز کیا ہے۔

دنیا کے عظیم فلسفیوں کی طرح اقبال نے بھی مثالی معاشرے کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ مثالی معاشرہ ایک مثالی انسان کے ہاتھوں معرض وجود میں آئےگا جسے اقبال مرد مومن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ فقر اور عشق مرد مومن کی دو بنیادی خوبیاں ہیں۔ مدارج عشق طے کرنے اور فقر کی حقیقت پہچاننے اور مرد مومن بننے کے لئے اتباع رسول لازم ہے۔ کوئی شخص محبت رسول کے بغیر نہ دنیاوی ترقیات حاصل کر سکتا ہے اور نہ روحانی مدارج پر فائز ہو سکتا ہے۔ اہل بیت اطہار، اصحاب رسول اور اولیائے امت سے زیادہ رسول اللہ سے محبت کرنے والا اور ان کی اتباع کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ چنانچہ اقبال نے ان تینوں جماعتوں سے اپنی گہری محبت اور شیفتگی کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے دو نظمیں حضرت بلال پر اور ایک نظم حضرت صدیق اکبر پر لکھنے کے علاوہ دیگر صحابہ کرام حضرت علی، امام حسین، مجدد الف ثانی، داتا گنج بخش اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کی مدح و ستائش میں آبدار شعر کہے۔ حضرت بلال کی سب سے بڑی خوبی اقبال کے نزدیک " عشق رسول " تھی۔ وہ لوگ خوش نصیب تھے جنہیں حضورؐ کا زمانہ نصیب ہوا اور جنہوں نے اس باعث تخلیق کائنات کو جی بھر کر دیکھا۔

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری

کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اذان ازل سے تیرے عشق کا ترانہ بنی

نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا

خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

یہی ذات گرامی مسلمان کا واحد مقتدا اور نصب العین ہے اور اسی کی محبت کامیابیون اور کامرانیون کی ضامن ہے۔ بلال عشق رسول کی بڑی عمدہ مثال ہین۔ ایک نظم بلال پر لکھ چکنے کے بعد اقبال محسوس کرتے ہین کہ وہ جو بات کہنی چاہتے تھے وہ نہین کہہ پائے لہذا ایک دوسری نظم لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

وہ کہتے ہین کہ سکندر جیسا عظیم فاتح تاریخ عالم کے اوراق مین دفن ہو کر رہ گیا

آج ایشیا مین اس کو کوئی جانتا نہین

تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہین

لیکن ایک حقیر حبشی‌زادہ جس کی فطرت نور نبوت سے مستنیر تھی لوگون کے دلون کی دھڑکن بنا ہوا ہے اور اس کا سبب رسول اکرم کی محبت کے سوا اور کچھ نہین

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے

رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے!

حضرت ابوبکر صدیق اگر دنیا مین محترم ہوئے تو اسی وجہ سے کہ ان کے دل مین عشق رسول کا دریا موجزن تھا اور اس کی خاطر انہون نے اپنی جان اور مال سب کچھ قربان کر رکھا تھا ایک موقع پر سرور دو عالم نے اصحاب سے فرمایا کہ جو تم مین سے مالدار ہین وہ راہ حق مین اپنا اپنا مال دین۔ حضرت‌عمر اپنا نصف مال لے آتے ہین۔ اتنے مین حضرت ابوبکر صدیق تشریف لاتے ہین۔ ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کہتے ہین

اتنے مین وہ رفیق نبوت بھی آ گیا

جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

لے آیا اپنے ساتھ وہ مرد وفا سرشت

ہر چیز جس پہ چشم جہان مین ہواعتبار

ملک یمین و درہم و دینار و رخت و جنس
اسپ قمر سم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضور چاہیئے فکر عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعث تکوین کائنات
پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

علامہ اقبال نے حضرت بلال اور ابوبکر صدیق کے علاوہ دیگر خلفائے راشدین ، صحابہ کرام اور اہل بیت پر کوئی خصوصی نظم نہیں کہی۔ لیکن ان کے نام بلیغ علامتیں بن کر ان کے کلام میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں اور ان کی شاعری کی فضا کو مذہبی رنگ میں رنگ رہے ہیں -

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

جسے نان جوین بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

دل بیدار فاروقی ، دل بیدار کراری
مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا ؟ زور حیدر ، فقر بوذر ، صدق سلمانی

کمال عشق و مستی ظرف حیدر

زوال عشق و مستی صرف رازی

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود

فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق

معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری

میراث مسلمانی، سرمایۂ شبیری

علامہ دعا کے لئے حضرت مجدد کے مزار پر حاضر ہوئے تو صاحب مزار کی پوری شخصیت ان کے سامنے ابھر آئی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر

وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار

اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے

اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے

جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان

اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

عـلامہ کا مولانا روم سے بڑا گہرا روحانی رشتہ ہے۔ چنانچہ مولانا سے استفاضہ اور ان کی تعلیمات سے استفادہ کے تذکرے سے تو علامہ کی تصنیفات بھری پڑی ہین۔ اپنی نظم " جـاوید سے،، مین اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہین کہ اگر کوئی مـرد باخدا نہ ملے تو جو تعلیمات تصوف تم تک باپ دادا کی معرفت پہنچی ہین ان پر کاربند رہو اور مولانا روم کے درس کو اپنا رہنما بنا لـو ۔

پیـر رومـی را رفیق راہ سـاز
تاخـدا بخشد تـرا سوز و گداز
زانکـہ رومی مغز را داند زپوست
پائے او محکم فتد دا کوے دوست

سـادگی اور صفائی علامہ کے کلام کی بنیادی صفت ہین۔ ندرت تشبیہہ و استعارہ ، حسن تراکیب ، موسیقیت اور ترنم، جدت طرز ادا اور بلندی فکـر ان کے خصوصی شعری محاسن ہین۔

ایک منقبـت گـو شاعـر کی حیثیت سے علامہ ایک منفـرد مقام رکھتے ہین۔ انہون نے مذہبی شخصیات کے لئے لمبی چوڑی نظمین نہین لکھین ۔ ان کے نزدیک ان شخصیات کی وہ خوبیان قابل صـد تحسین ہین جو حب رسول اور اتباع رسول نے ان مین پیـدا کر دی ہین۔ ان کے نزدیک کسی شخـص کی ذات محترم نہین ہے بلکـہ رسول اکـرم ؐ سے جس قـدر اس کا تعلق محکـم ہوگا اسی قـدر وہ عزت و تکریم کے لائـق ہو گا ۔

حفیظ جالندھری (۱۹۰۰ء تا ۱۹۸۲ء)

حفیظ کے آباؤاجداد مذھب سے گھری وابستگی رکھتے تھے۔ چنانچہ جس ماحول مین ان کی تربیت ھوئی اس نے مذھب کے گھرے نقوش ان کے دل و جان پر ثبت کر دیئے۔ وہ اپنے بزرگون کے مذھبی رجحانات کا ذکر کرتے ھوئے کھتے ھین۔

وظیفہ تھا کلام پاک ھی میرے جد و اب کا
دیا مجھ کو زبان مادری نے درس مذھب کا

ان کی تعلیم کا آغاز مسجد سے ھوا۔ یہان جس استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے وہ بھی مرد حق آگاہ تھا اور قرآن و سنت کی پیروی کرنے والا تھا۔ چنانچہ اس نے حب رسول اللہ حفیظ کی روح مین اتار دی۔ اس کا اظہار انھون نے اپنے ایک شعر مین یون کیا ھے۔

مری حب رسول اللہ کی بنیاد ھے مسجد
خدا آباد رکھے آج بھی آباد ھے مسجد

" شاھنامہ،، حفیظ کا سب سے بڑا کارنامہ ھے جو واقعہ نگاری اور بیانیہ شاعری کا عمدہ نمونہ ھے۔ تاریخ اسلام کو منظوم کرتے ھوئے انھون نے صحت مضامین کا خاص خیال رکھا ھے اور جب تک کسی واقعہ کی تصدیق معتبر کتب تاریخ سے نھین ھوئی انھون نے اس واقعہ ھاتھ نھین لگایا۔ وہ کھتے ھین ۔

تخیّل پر نھین بنیاد میری شاہ نامے کی
صداقت کی طرف جاتی ھے راہ راست خامے کی

حفیظ کو اپنے دور کی سیاسی، معاشرتی اور مذھبی صورت حال کا شدید احساس تھا۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر کے مسلمان بساط سیاست کے پٹے ھوئے مھرے تھے۔ معاشرتی اور معاشی انحطاط کا اژدھا انھین نگل رھا تھا اور مسلمان انگریزی تھذیب کے زیراثر مذھب سے بیگانہ ھو رھے تھے۔ اس دور ابتلا مین حفیظ نے اپنی ساری صلاحیتین اس بات پر صرف کر دین کہ بزرگان دین کی زندگیون کے ان پھلوؤن کو سامنے لایا جائے جو مسلمانون کی مردہ رگون مین زندگی کا خون دوڑائین، انھین جھنجھوڑین اور مسلمان اپنی توانائیون کو مجتمع کرکے ان کے فروغ سے اپنے گرد وپیش کو روشن کر سکین۔ حفیظ نےخلفائے

راشدین اور صحابہ کرام کی زندگیوں کے جو مرقع پیش کئے ہیں ان میں اتباع رسول کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ دنیا میں سربلندیوں سے اس لئے ہمکنار ہوئے کہ ان کے سینوں میں عشق رسول کے چشمے ابل رہے تھے۔ حفیظ کے سامنے صحابہ کرام کی سیرت کا یہ پہلو ہمیشہ قابل تحسین رہا کہ شمع نبوت کے یہ پروانے صرف ایک ہی مقصد کے لئے جی رہے تھے۔ وہ اپنا سب کچھ جان و مال، عزیز و اقارب، حضور ختمی مرتبت پر نچھاور کر دینا چاہتے تھے۔ ان کے جوش جہاد کے پس پردہ یہی جذبہ کارفرما تھا۔ ہر شخص کو ایک ہی دھن تھی۔ وہ حضور کی نظر کرم کا محتاج تھا۔

جنگ بدر، کفر اور اسلام کے درمیان فیصلہ کن جنگ تھی۔ جن مجاہدوں نے اس میں شرکت کی سعادت حاصل کی ان کا ذکر حفیظ اس طرح کرتے ہیں۔

سما سکتی ہے کیونکر حب دنیا کی ہوا دل میں
بسا ہو جب کہ نقش حب محبوب خدا دل میں

محمدؐ کی محبت دین حق کی شرط اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

محمدؐ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی
خدا کے دامن توحید میں آباد ہونے کی

محمدؐ کی محبت خون کے رشتوں سے بالا ہے
یہ رشتہ دنیوی قانون کے رشتوں سے بالا ہے

یہی جذبہ تھا ان مردان غیرت مند پر طاری
دکھائی جن کے ہاتھوں حق نے باطل کو نگوں ساری

شجاعت اور بہادری کی تاریخ میں حضرت علی المرتضٰی کے کارنامے ایک سنہرے باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک جنگ کے موقع پر جب ایک کافر نے میدان جنگ میں نکل کر کہا" کوئی ہے جو میرے مقابل آئے؟ تو شیر خدا میدان میں نکلے ۔

یہ سنتے ہی علی المرتضی نے دی صدا ، میں ہوں
فدا کار محمد مصطفٰی نام خدا ، میں ہوں

یعنی حضرت علی جیسے اسد اللہ کی پہچان بھی یہ تھی کہ وہ فداکار محمد مصطفٰی تھے۔ یہ وہ کمال تھا جس پر تمام صحابہ کرام فخر کرتے تھے۔

حضور اکرم کی صحبت کا فیضان یہ تھا کہ آپ کا ہر ساتھی خدائے واحد پر یقین محکم رکھتا اور اس کے پیغام توحید کو پھیلانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا۔ صحابہ کرام نے جتنے بھی جہاد کئے ان کے پس پردہ خدا کی وحدانیت اور حضور ختمی مرتبت کی رسالت پر ایمان کارفرما تھا۔

یہ اصحاب اور یہ ایمان اصحاب محمدؐ کا
کرشمہ تھا فقط مہر جہان تاب محمدؐ کا
خدائے واحد و قیوم پر محکم یقین ان کا
یہی دنیا تھی ان کی اوریہی دراصل دین ان کا
یہی محکم یقین تھا ان کے استقلال کا باعث
ہوا آخر یہی باطل کے استیصال کا باعث

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ حفیظ کے نزدیک ہر وہ شخص محترم ہے جس کا تعلق حضور کی ذات کے ساتھ ہے۔ سیدۃ النساء کی تعریف میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

وہ زہرا ہاں وہی زہرا رسول اللہ کی بیٹی
وہ زہرا شہنشاہوں کے شاہنشاہ کی بیٹی
وہ کملی اوڑھنے والے مجسم نور کی دختر
وہ عبداللہ کی پوتی ، آمنہ کے پور کی دختر
وہ صبح چشم نور رحمۃ للعلمین زہرا
نگین خاتم تمکین ختم المرسلین زہرا

سادگی اور اثرانگیزی کلام حفیظ کی بنیادی خوبی ہے لیکن وہ رموز موسیقی سے بھی آشنا ہین اور ان کے اشعار بلندپایہ شاعری اور روح پرور موسیقی کا خوبصورت امتزاج ہین۔ شہسوار کربلا کے نام سے ان کی ایک نظم کے دو بند ملاحظہ کیجئے۔

یہ مرد حق پرست ہے مئے رضا سے مست ہے
کہ جس کے سامنے کوئی بلند ہے نہ پست ہے
ادھر ہزار گھات ہے مگر عجیب بات ہے
کہ ایک سے ہزارہا کا حوصلہ شکست ہے
یہ بالیقین حسین ہے
نبی کا نور عین ہے

دلاوری مین فرد ہے بڑا ہی شیر مرد ہے
کہ جس کے دبدبے سے دشمنون کا رنگ زرد ہے
حبیب مصطفیٰ ہے یہ مجاہد خدا ہے یہ
جبھی تو اس کے سامنے یہ فوج گرد گرد ہے
یہ بالیقین حسین ہے
نبی کا نور عین ہے

وصف نگاری مین حفیظ کا فن اپنی انتہائی بلندیون پر نظر آتا ہے۔ کوثر و تسنیم مین دھلی ہوئی زبان، تشبیہہ و استعارے کی ندرت، الفاظ کا انتخاب، تخیّل کی پاکیزگی اور سب سے بڑھ کر حب رسول و اہل بیت و اصحاب رسول ان سب خوبیون نے مل کر کلام حفیظ کو سحر حلال بنا دیا ہے۔ ان کے بیان مین کہین الجھاؤ نہین۔ کہین دورازکار تشبیہات کا ابہام نہین۔ ان کے سادہ لفظ جذب و کیف کا طوفان برپا کر دیتے ہین ۔

جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸ء تا ۱۹۸۲ء)

جوش کو شاعری ورثے مین ملی تھی۔ ان کے ننھال اور ددھیال مین سبھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے والد نواب بشیراحمد خان بشیر، ان کے دادا نواب محمد احمدخان احمد اور پردادا نواب فقیر محمدخان گویا سب صاحب دیوان شاعر تھے۔ انہون نے ۹ سال کی عمر مین پہلا شعر کہا تھا

شاعری کیون نہ راس آئے مجھے
یہ مرا فن خاندانی ہے

جوش کے اب و جد سنّی مسلک رکھتے تھے۔ لیکن ان کی دادی شیعہ مسلک رکھتی تھی اس نے گھر مین امام باڑہ تعمیر کرا رکھا تھا اور باقاعدہ عزاداری کرتی تھی۔ جوش کی والدہ اگرچہ اصحابہ ثلاثہ کو مانتی تھی مگر تفضیلی تھی اور محرم مین عزاداری بھی کرتی تھی۔ اس ماحول کے علاوہ انہین ایسے اساتذہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا جو اہل بیت کے مداح اور معتقد تھے۔ کلب علی مانی جالسی ان کے اتالیق تھے اور عزیز لکھنوی سے جوش شاعرانہ تخلیقات کی اصلاح کراتے تھے۔ گھر سے نکلے تو لکھنو آئے اس ماحول مین ان کی شیعیت کے نقوش اور ابھر آئے ۔

سیاسی میدان مین جوش محمد علی جوہر سے متاثر تھے۔ چونکہ محمد علی جوہر اپنی سیاسی جدوجہد مین امام حسین کو اپنا قائد فکر و نظر اور دنیائے اسلام کا منفرد ہیرو سمجھتے تھے اور یہ موضوع جوش کے ماحول ، عقائد اور فکری نہج سے قریبی مناسبت بھی رکھتا تھا اس لئے انہون نے بھی حضرت علی اور امام حسین کو اپنا قبلہ گاہ بنا کر قوم کے سامنے بطور مثال پیش کرنا شروع کر دیا۔ ترکی مین خلافت کے خاتمے سے عالم اسلام مین مایوسی کی جو لہر دوڑ گئی تھی اس بھنور سے قوم کو نکالنے کی یہی صورت تھی کہ خانوادۂ اہل بیت کے مثالی کردار کو پیش کرکے مسلمانون کے دلون کو بیدار کیا جائے اور ان کو عزم و ہمت ، استقامت اور پامردی کا سبق دیا جائے۔

اس صورت حال مین جوش کی منقبت نگاری کا آغاز ہوا۔ انہون نے محض رسمی مناقب نہین لکھے بلکہ ان کے سامنے ایک واضح مقصد تھا ۔ وہ قوم مین حق و صداقت کے لئے قربانی دینے کا جذبہ پیدا کرناچاہتے تھے۔ انہون نے صرف اہل بیت کے فضائل ہی بیان نہین کئے بلکہ ان کے کردار کو سامنے رکھتے

عمل کی ترغیب بھی دی ہے۔ اردو منقبت نگاری کی تاریخ مین یہ ایک نیا انداز ہے اس لئے جوش کو ایک منفرد اور جداگانہ حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

منقبت نگاری مین ان کی نظم " حسین اور انقلاب " کو خصوصی شہرت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ " ذاکر سے خطاب ، اے مرتضی ، متولیان وقف حسین آباد ، سوگواران حسین سے خطاب، موت آل محمد کی نظر مین ، وغیرہ ——— مذہبی شاعری مین خوشگوار اضافہ ہین ۔ ان مین امام حسین کے محاسن بیان کرنے کے علاوہ درس تقلید حسین بھی دیا گیا ہے۔ ذاکر سے خطاب کے یہ بند ملاحظہ کیجئے ۔

جو دھکتی آگ کے شعلون پہ سویا وہ حسین
جس نے اپنے خون سے عالم کو دھویا وہ حسین
جو جوان بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسین
جس نے سب کچھ کھو کےپھرکچھ نہ کھویاوہ حسین
مرتبہ اسلام کا جس نے دوبالا کر دیا
خون نے جس کے دو عالم مین اجالا کردیا

درس تقلید حسین کا انداز دیکھئے

دیکھ تو کتنی مکدر ہے فضائے روزگار
کس طرح چھایا ہوا ہے حق و باطل کاغبار
بزم یزدانی مین روح اہرمن ہے گرم کار
میان سے باہر اہل پڑا علی کی ذوالفقار
نقش حق کو اب بھی اور غافل جلی کرتانہین
اب بھی تقلید حسین ابن علی کرتانہین؟

حسین اور انقلاب ۱۹۴۱ء مین لکھی گئی اور لکھنؤ مین آغائی صاحب کے امام باڑے مین پڑھی گئی جسے سننے کے لئے بقول جوش

" پورا ادبی لکھنؤ ٹوٹ پڑا تھا ۔ امام باڑے مین تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لکھنؤ کے تمام شعراء، تمام اساتذہ، یہان تک کہ مولانا صفی بھی تشریف لائے اور اس مجلس مین فقط شیعہ ہی

نہین اہل سنت اور ہندو بھی شریک ہوئے تھے۔ چونکہ اس مسدس مین آہ و فغان پر زور دینے کے بدلے ایثار اور کردار حسین پر عمل کرنے کی بالکل پہلی بار ترغیب دی گئی تھی اس لئے ارباب مجلس نےبالعموم اور اعیان سیاست نے بالخصوص بار بار کھڑے ہو کر اس جوش و خروش سے داد دی کہ ان کی آوازون کے تھپیڑون سے منبر مین جنبش پیدا ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامعین اپنے اپنے گریبان پھاڑ کر میدان جنگ مین کود پڑین گے۔" [۱]

یہ نظم اٹھتہر بندون پر مشتمل ہے۔ اس کے آغاز مین جو رباعیات پڑھی گئین ان مین سے ایک یہ ہے

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہین حسین
عرش نوع بشر کے تارے ہین حسین
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہین حسین

نظم کا آغاز تلخیٔ حیات کے شکوے سے ہوتا ہے۔ پھر زندگی کے تضادات اور اس کی سفاکیون اور شقاوتون کے تذکرے کے بعد شاعر کہتا ہے کہ جب کوئی مصلح قوم رشد و ہدایت اور تبلیغ حق کے لئے اٹھتا ہے تو بہت سی ان دیکھی مصیبتین اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہین۔ امام حسین کو بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا ۔ اس مقام پر پہنچ کر شاعر اس عظیم انسان کی صفات کا ذکر یون کرتا ہے

جو صاحب مزاج نبوت تھا وہ حسین
جو وارث ضمیر رسالت تھا وہ حسین
جو خلوتیٔ شاہد قدرت تھا وہ حسین
جس کا وجود فخر مشیت تھا وہ حسین

سانچے مین ڈھالنے کے لئے کائنات کو
جو تولتا تھا نوک مژہ پر حیات کو

---

[۱] یادون کی برات ص ۲۷۵

جو اک نشان تشنہ دہانی تھا ، وہ حسین
گیتی پہ عرش کی جو نشانی تھا وہ حسین
جو خلد کا امیر جوانی تھا ، وہ حسین
جو اک سن جدید کا بانی تھا وہ حسین
جس کا لہو تلاطم پنہاں لئے ہوئے
ہر بوند میں تھا نوح کا طوفان لئے ہوئے
جو کاروان عزم کا رہبر تھا وہ حسین
خود اپنے خون کا جو شناور تھا وہ حسین
اک دین تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسین
جو کربلا کا داور محشر تھا وہ حسین
جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا
جو روح انقلاب کا پروردگار تھا

اس مرد سرفروش کی ابدی روشنی کا دور شاعر اپنے ماحول تک میں محسوس کرتا ہے ۔

یہ صبح انقلاب کی جو آج کل ہے ضو
یہ جو مچل رہی ہے صبا پھٹ رہی ہے پو
یہ جو چراغ ظلم کی تھرا رہی ہے لو
در پردہ یہ حسین کے انفاق کی ہے رو
حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دوستو
یہ بھی اسی جری کی ہے آواز دوستو

اس کے بعد شاعر اس پیکر جدوجہد کے حضور اپنا سرعقیدت خم کرکے سلام پیش کرتے ہوئے اعتراف کرتا ہے کہ

تجھ سا شہید کون ہے عالم میں اے حسین
تو ہے ہر ایک دیدۂ پرنم میں اے حسین

زہاد ہی نہیں ہیں ترے غم میں اے حسین
ہم رند بھی ہیں حلقۂ ماتم میں اےحسین

آزاد جو خیال میں ہیں اور کلام میں
وہ بھی اسیر ہیں تیری زلفوں کے دام میں

ہاں اے حسین ابن علی رہبر انام
اے منبر خودی کے حیات آفرین پیام
اے نطق زندگی کے مقدس ترین نام
اے چرخ انقلاب کے ابر جوان خرام

غازہ ہے تیرا خون، رخ کائنات کا
ہر قطرہ کوہ نور ہے تاج حیات کا

اس ہدیہ کے بعد شاعر اپنے سامعین و قارئین سے مخاطب ہوتا ہے اور آٹھ بندوں میں انہیں یہ درس دیتا ہے کہ دوستو! اٹھو اور سیم و زر کے پہاڑوں کو کاٹ ڈالو ۔ سرمایہ و امارت کو زیر و زبر کر دو۔ عفریت ظلم اور دیو فساد کو ٹھکانے لگا دو اور شمر عصر اور یزید وقت کو دوزخ کا ایندھن بنا دو۔ اٹھو اور تسخیر مشرقین کرو اور اس کام کے لئے تقلید علی و حسین ضروری ہے۔

آئین کشمکش سے ہے دنیا کی زیب و زین
ہر گام ایک بدر ہو ہر سانس اک حنین
بڑھتے رہو یونہیں پے، تسخیر مشرقین
سینوں میں بجلیاں ہوں زبانوں پہ یا حسین

تم حیدری ہو، سینۂ اژدر کو پھاڑ دو
اس خیبر جدید کا در بھی اکھاڑ دو

اور آخر میں جانشین حیدرکرار سے اعانت کے طالب ہوتے ہیں ۔

اے جانشین حیدر کرار، المدد
اے منچلوں کے قافلہ سالار، المدد

اے ابـر حق کی گـرمیٔ بازار ، المـدد

اے جنس زندگی کے خـریـدار ، المـدد

دنـیا تـری نظـیر شہادت لئے ہوئے

اب تک کھـڑی ہے شمع ہدایت لئے ہوئے

جـوش کی یہ نظم زبان و بیان اور فکـر و فن کا حسین مرقع ہے اور اردو ادب مـین ندرت فن کا عمدہ نمونہ ہے۔ جوش کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو سوچ کے نئے گوشے منور کرنے مین صرف کیا ۔ ان کے ہاں تشبیہہ، استعارہ اور محاکات کا ایک طوفان موجزن ہے ۔ وہ شوکت الفاظ کے بادشاہ ہین۔ ان کے یہاں بقول ڈاکٹر محمد حسن

" الفاظ کی شوکت و جبروت سودا کے بعد ہمارے تمام تـر شعراٗ سے زیادہ ہے۔ ان کے الفاظ گونجتے، گرجتے، ناچتے اور وجـد کرتے آتے ہین"۔ [ص۱]

ص۱ رسالہ افـکار " جوش نمبر" ص ۵۳۵

جمیل مظہری (۱۹۰۵ء تا)

جمیل مظہری دور جدید کے منقبت نگارون مین اہم مقام رکھتے ہین۔ ان کے والد خورشید حسین خورشید اور دادا مولوی مظہر حسن مظہر بھی شاعر تھے اس طرح شاعری انہین ورثے مین ملی تھی۔ یہی نہین بلکہ ان کے والد نے ان کے شاعرانہ ذوق کی تربیت بھی کی تھی۔ موصوف کہتے ہین

" والد مرحوم نے شاعری ہماری گھٹی مین اس طرح ڈالی جیسے کبوتر اپنے بچے کو دانہ دیتا ہے۔ انہون نے بچپن ہی سے شاعری کا ذوق دیا، اس ذوق کی پرورش کی اور اس کی تربیت کی،، ؁۱

جمیل مظہری کے دادا مرزا دبیر کے تلامذہ مین سے تھے۔ لیکن والد انیس کے مداح تھے اور عمر بھر مجالس عزا مین انیس ہی کے مراثی تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ اس طرح خاندانی اثرات کے تحت جمیل مظہری کو دونون دبستانون سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا ۔ لیکن آغاز شعور ہی سے ان کے مذاق سلیم کی برداشت مین انیس کے رنگ کلام کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی خاندانی روایات نے بچپن ہی سے انہین مرثیہ کا پسندیدہ ذوق دیا تھا۔ ان کے ترقی پسند رجحانات نے ان کو جدید سیاسی شعور سے بہرہ ور ہی نہین کیا بلکہ انہین مفکرانہ انداز نظر بھی عطا کیا۔

لکھنؤ مرثیہ گوئی کا مرکز تھا لیکن ناصرالملت مولانا سید ناصر حسین کے ادبی ذوق نے لکھنؤ عوام و خواص و مذہبی قصائد کا ذوق بھی پیدا کر دیا تھا اور سرور کائنات اور آئمہ اہل بیت کے یوم ولادت کی تقریبات ذوق و شوق سے منعقد ہوتی تھین اور سوگواران حسین جو عزاداری سے زیادہ شغف رکھتے تھے ان کے لئے جذبات غم کے ردعمل کے باعث میلاد کے موقع پر قصیدہ خوانی خاصی دلکشی رکھتی تھی۔ لکھنؤ کی تقلید مین بیرون لکھنؤ بھی اس قسم کی تقریبات مقبول ہوئین۔ چنانچہ دہلی، بلگرام، حیدرآباد دکن، آگرہ وغیرہ ان تقریبات کی بدولت مذہبی قصیدہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔

جمیل مظہری نے پانچ مذہبی قصیدے لکھے ہین۔ ان مین سے تین نعتیہ ہین۔ ایک قصیدہ حضرت علی کی منقبت مین ہے اور ایک مین مرزا غالب اور ان کے ممدوح حضرت علی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ انہون نے غالب کے مشہور قصیدہ

؁۱ ماہنامہ سہیل، گیا جمیل مظہری نمبر حصہ اول ص ۱۷ بحوالہ دیباچہ عرفان جمیل، لاہور

دھر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہین

کو بطور مخمس تضمین بھی کیا ہے۔ اس طرح ان کے قصائد کی تعداد چھ ہو جاتی ہے۔ حضرت علی کی مدح مین جو قصیدہ لکھا گیا ہے اس کا عنوان " میخانۂ کوثری " ہے۔ اس کی تشبیب بہاریہ ہے لیکن شاعر بہار کے کیف پرور ماحول مین بھی افسردہ ہے ۔ وہ اس کا علاج یہ سوچتا ہے کہ ممدوح کے جشن میلاد مین شریک ہو جائے

علاج افسردہ طبعی کا نہین جز ساغر غفلت
ہے جس کے نشہ مین کیفیت عقل حکیمانہ
سنا ہے میکدے مین جشن ہے میلاد ساقی کا
چلین اور چل کے ہو جائین شریک دور پیمانہ

اس کے بعد شاعر ممدوح کے فیوض و برکات کا ذکر کرتا ہے جہان اس کی مضمون آفرینی قادرالکلامی اور استعارات کی خوبصورتی ملاحظہ کیجئے

عطا ہوتا ہے تیرے آستان فیض رحمت سے
ہوس کو ذوق استغنا جنون کو عقل فرزانہ
حجر کو قلب آئینہ، گہر کو سینۂ قلزم
زغن کو نغمۂ بلبل ، مگس کو سوز پروانہ
مصیبت کو تحمل ، غم کو لذت، سعی کو حاصل
ضعیفی کو عصا ، گتھی کو ناخن ، زلف کو شانہ
نظر کو جلوہ، جلوے کو نظر آنکھون کو کیفیت
صدف کو قطرہ، قطرے کو گہر، رندون کو پیمانہ

حضرت علی کی مدح کرتے ہوئے شاعر نے ممدوح شخصیت کو بڑی شاعرانہ مہارت کےساتھ لفظون مین ڈھالا ہے

بغل مین ذوالفقار اور دوش پر دلق فقیرانہ
دلون پر کی شہنشاہی بہ این وضع گدایانہ

معلم بزم حکمت مین، مجاهد پشت دلدل پر
جبین سجدے مین اور ہونٹون پہ اقوال حکیمانہ
فقیر و صاحب افسر حکیم و شاعر اکبر
فقیہہ محتسب پرور، وصئ پیغمبرانہ
یداللہ و ولی اللہ و وجہہ اللہ و عبداللہ
وہ عبداللہ خدا کی شان جس مین بےحجابانہ
شرار نور وحدت تو چراغ طور حکمت تو
نسیم باغ رحمت تو بہ انفاس مسیحانہ

مدح کے مضمون کے بعد شاعر نے سولہ اشعار مین مختلف قسمین کھائی ہین۔ یہ انداز عرفی کے ہان بھی ہے جس نے اپنے معروف منقبتی قصیدے مین ۶۵ اشعار صرف مختلف قسمون پر صرف کئے ہین۔ ان قسمیہ اشعار مین جمیل مظہری کے اندرکاترقی پسند شاعر انگڑائی لیتا ہے۔ ان کا طبقاتی شعور بیدار ہوتا ہے۔ ان کی باغی روح جاگتی ہے

قسم دولت کی ہے جو حسن کی قیمت لگاتی ہے
قسم ہے حسن کی مفلس کا دل ہو جس کا پیمانہ
قسم مزدور محنت کش کے اس بازوئے محنت کی
ہو لرزان جس کی ہیبت سے شکوہ قصر شاہانہ
قسم حسن غیور مفلسان کی جن کی قسمت مین
غبار رہگذر غازہ، نگاہ نظر بد شانہ

شاعر حرم سے وحشت زدہ ہے اور خدا کا بھی شاکی ہے لیکن علی المرتضیٰ کا دیوانہ ہے

حرم سے مجھ کو وحشت ہے خدا سے بھی شکایت ہے
مگر تجھ سے محبت ہے، مین دیوانہ ہون دیوانہ

اور آخر مین دعائیہ اشعار ہین

وہ مئے دے جس کے پیتے ہی خمار خود سری ٹوٹے
نکل جاؤں دیار عقل سے ہو کر کے مستانہ
سر شوریدہ کو بالین آسائش میسر ہو
جو سو جاؤں تری چوکھٹ پہ سر رکھ کر غریبانہ
غبار شوق بن کر تیرے دامن تک پہنچ جائے
جمیل کیف پرور خاک پائے اہل میخانہ

اس پوری منقبت پر مے خانے کی فضا محیط ہے جو ہماری صوفیانہ شاعری کا مرکز و محور ہے۔ صوفی شاعروں نے اور ان کے علاوہ صوفیانہ مضامین بیان کرتے ہوئے دیگر شاعروں نے مےخانے کے لوازمات کو اظہار بیان کا وسیلہ بنایا ہے ۔ بقول غالب

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

جمیل مظہری نے بھی اسی انداز کو اپنایا ہے اور اس اسلوب کو بڑی عمدگی سے نبھایا ہے۔

جیساکہ پہلے بیان ہوا کہ جمیل مظہری نے غالب کے منقبتی قصیدے کو مخمس میں تضمین کیا ہے۔ مروجہ دیوانوں میں غالب کے اس قصیدے میں ۳۳ اشعار ہیں جب کہ نسخہ حمیدیہ میں ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ جمیل مظہری نے تضمین کرتے وقت ۳۳ بند لکھے ہیں۔ ان کے فن کا کمال یہ ہے کہ ان کے مصرعے غالب کے مصرعوں کے ساتھ مل کر یک جان ہو جاتے ہیں ۔

عقل ہے محو تماشائے لب بام یقین
سر بسجدہ نگہ حیرت ارغان قرین
عالم غور میں سب چپ ہیں مکان ہوکہ مکین
دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبین

جمیل مظہری کی شاعری میں غالب اور اقبال کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ پہلے مصرعے میں اقبال کے اس شعر کی بازگشت سنائی دیتی ہے

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

مدح کے چند بند دیکھئے

آیت صدق و صفا، جان و دل ختم رسل
عبد معبود نما، جان و دل ختم رسل
پردہ و پردہ کشا، جان و دل ختم رسل
مظہر فیض خدا، جان و دل ختم رسل
قبلۂ آل نبی کعبۂ ایجاد یقین

اے تیرے نور کا چھینٹا مہ و انجم کی ضیا
ساغر جود کا چھلکا ہوا قطرہ، دریا
سوچتا ہوں کہ وہ کچھ نہیں جو کچھ کہ کہا
کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں

جمیل مظہری نے ایک اور قصیدہ مرزا غالب اور ممدوح غالب یعنی حضرت علی کی شان میں لکھا ہے۔ اس کی زمین بھی غالب ہی کی زمین ہے۔ غالب کی بلندئ فکر، حسن بندش اور مضمون آفرینی کی تعریف کے بعد گریز کا انداز باکمال ہے

مثنوی ہو کہ قصیدہ ہو بہر منزل فکر
ہے مسلم تیری یکتائی شان تمکین
منقبت میں بھی تیرا جوش بیان حاصل ذوق
جس سے گنجینۂ معنی ہے قصیدے کی زمین

اس قصیدے میں بھی شاعر کی رگ ترقی پسند پھڑکتی ہے۔ ان کا اشتراکی ذہن اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ وہ حضرت علی کی مدح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں

زر کے انبار سے جو جھاڑ کے دامن اٹھے
اپنا حصہ بھی بڑھا دے سوئے مرد مسکین

جس کا آئین قضا ، جس کا اصول تقسیم

اشتراکیت مطلق کے تصور سے قرین

یہ قصیدہ جس مین ۱۳۳ اشعار هین جمیل مظهری کی علمی وسعت ، حکیمانہ بصیرت، پختگیٔ فن اور شگفتگی بیان کا مظہر ہے۔ انہون نے اگرچہ مقدار کے اعتبار سے زیادہ مذہبی قصیدے نہین لکھے تاہم جو کچھ کہا ہے وہ مذہبی ادب کے اثاثے مین گران قدر اضافہ ہے۔ جمیل مظہری ، ابوالکلام آزاد سے متاثر تھے اور ان کی شاعری مین وہ شوکت الفاظ اور حسن معانی پایا جاتا ہے جو مولانا آزاد کی خطابت کا طرۂ امتیاز ہے۔

عصر جدید کی منقبت نگاری کا جائزہ

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمان میدان سیاست میں شکست خوردہ ہو کر مایوسیون اور محرومیون کا شکار ہو گئے۔ ان کو دوبارہ میدان حیات مین لانے اور ان مین جذبۂ مسابقت پیدا کرنے کے لئے جس جذباتی بحالی کی ضرورت تھی اس مین نعت رسول مقبول کے علاوہ منقبت نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ مولانا احمد رضاخان نے اگرچہ مسلمانون کی سیاسی بیداری مین عملی حصہ نہین لیا (انہون نے اپنی کوششین علمی محاذ تک محدود رکھین) لیکن ان کے مناقب مین گردوپیش کے مسائل کا گہرا شعور موجود ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے۔ سرسیّد اور ان کے رفقاء کی کوششون سے حقیقت پسندی کا دور شروع ہوا اور مسائل کو ان کے صحیح تناظر مین دیکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ حالی کی تحریک اصلاح شاعری نے شعروادب مین محض فنی کرتب دکھانے کے شوق کی حوصلہ شکنی کی اور شاعری اپنے فنی تقاضون کو ملحوظ رکھتے ہوئے حقیقت حال کے اظہار کا وسیلہ بنی۔ چنانچہ سادگی، اصلیّت اور جوش شاعری کے بنیادی لوازمات ٹھہرے ۔ اس دور کی شاعری کے پس منظر مین یہ جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ بھٹکے ہوئے مسلمانون کو ان کی بھولی ہوئی منزل یاد دلائی جائے اور عظمت رفتہ کے واقعات اور اسلاف کے کارہائے نمایان کے تذکرے سے ان کا لہو گرمایا جائے۔ ان کے اندر اعتماد پیدا کرکے انہین ایک ملت کے طور پر زندگی بسر کرنے اور آگے بڑھنے کا درس دیا جائے۔

برصغیر مین آزادی کی تحریک نشوونما پانے لگی تو اس کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے بھی اور ظالم حکمرانون سے ٹکر لینے پر ابھارنے کے لئے بھی منقبت کا ایک نیا انداز سامنے آیا۔ چنانچہ واقعات کربلا کو محض عزاداری اور گریہ و ماتم بنانے کی بجائے ان کو قوم مین صبر و استقلال اور جرأت وبہادری کا نمونہ بنا کر پیش کیا گیا اور ظلم و استبداد کے درخیبر کو اکھاڑنے کے لئے اپنے اندر قوت حیدری پیدا کرنے کا درس دیا گیا۔ انقلاب روس نے دنیابھر مین طبقاتی شعور پیدا کر دیا تھا اور امیر/ غریب ،سرمایہ دار و محنت کش کی تفریق ہونے لگی تھی۔ اس دور کے منقبت گو شاعرون کے ہان بھی یہ شعور موجود ہے اور انہون نے اس کے اظہار کے لئے مناسب مواقع بھی تلاش کئے ہین۔ اس دور مین جو اصناف سخن مقبول رہین ان مین مسدس، غزل، مثنوی اور مسمط خاص طور پر قابل ذکر ہین۔

اس دور کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ منقبت گو شاعرون نے قوم کو عمل پر ابھارنے کے لئے

حب رسول کو بنیاد ٹھہرایا ہے۔ حضور اکرم کے ساتھ والہانہ محبت ہی مسلمان کو کارزار حیات میں سرفراز کرتی ہے اور یہی وہ اسم اعظم ہے جو مشکلات کے غار پر پڑے ہوئے پتھروں کو ہٹاتا اور آسودگی کی روشنی سے ہمکنار کرتا ہے۔ ۔۔

بحیثیت مجموعی اس دور کی منقبت نگاری شاعری کی جملہ اصناف کے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہے۔ یہ دور منقبت نگاری کا سنہرا دور ہے کیونکہ اس دور کے شعراؑ کے ہاں شعور عصر نو بھی ہے اور بزرگان دین سے عقیدت و محبت کے جذبات بھی۔ ان دونوں کو ملا کر وہ جوہر بنتا ہے جو قوم کے لئے اکسیر اعظم کا درجہ رکھتا ہے۔

منقبت نگاری کا مستقبل

منقبت نگاری کے مستقبل پر اظہار خیال کرنے سے قبل اس کی ماضی اور حال کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے۔

جب مخالفین نے دین اور اکابرین دین کے خلاف دشنام طرازی کے دھانے کھولے تو ان سے محبت اور عقیدت رکھنے والے شاعرون نے ان کے تحفظ کے لئے لفظون کے حصار کھڑے کر دیئے۔ ان کے اس عمل کے پس منظر مین یہ تصور کارفرما تھا کہ رسول خدا نورخداوندی کی اولین جھلک ہین اور بزرگان دین ان سے کسب نور کرتے ہین لہذا محترم و مکرم ہین۔ ان کا ذکر، خدا اور رسول کے ذکر کے بعد سب سے افضل ہے جو اس دنیا مین خیر و برکت اور اگلی دنیا مین نجات کا سبب ہے۔ بزرگان دین اللہ تعالیٰ کے مقربین ہین ۔ ان کی دعا سے مشکلات مین آسودگی کے دروازے کھلتے ہین اور ان کی نظر عنایت زخمی انسانیت کے لئے مرہم کا کام دیتی ہے۔ ان کی زیارت باعث طمانیت قلبی ہے اور ان کی صحبت اختیار کرنے سے دین کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ ان کی پیروی روحانی سربلندیون کی ضامن ہے اور انسان بہتر انسان بن کر دنیا مین نیابت الہی کا فریضہ سرانجام دینے مین کامیابیان حاصل کرتا ہے۔

شاعرون نے اپنے جذبۂ محبت و عقیدت کی تسکین کے لئے سیدھے سادے الفاظ مین بزرگان دین کے اوصاف بیان کئے۔ یہ اوصاف وہی تھے جن کی طرف قرآن اور حدیث مین اشارے ملتے ہین۔ یہ ابتدائی ترقیات کا ابتدائی دور تھا۔ ابھی تصنع اور بناوٹ کے غلاف نے زندگی کو اپنی لپیٹ مین نہین لیا تھا۔ شاعر انہین خیالات و جذبات کا اظہار کرتے تھے جو اپنے اندر حق و صداقت کی روشنی رکھتے تھے اور جو مبالغے اور غلو کی آلائش سے پاک تھے۔

زمانہ تبدیل ہوا۔ شاعرون کی طبعی جولانیون نے اپنا رنگ دکھایا۔ جو بات سادگی کے ساتھ چند شعرون مین بیان کی جا سکتی تھی وہ مبالغے اور غلو کی رنگ آمیزی سے خوبصورت استعارون اور نادر تشبیہون مین طویل قصیدون مین بیان ہونے لگی۔ شاعری علمیت اور کمال فن کے اظہار کا ذریعہ بنی کھنکتے قافیے شاعر کی جولانگاہ قرار پائے۔ اس طرح منقبت نگاری کا ادبی معیار بلند ہوا اور وہ لوگ جو مذہبی شاعری سے گریزان تھے اور مذہب کی بات جن کی طبع نازک پر گران گزرتی تھی ادبی ذوق کی تسکین کے لئے ان محفلون مین شریک ہونے لگے جہان مذہبی قصائد پڑھے جاتے تھے۔ شاعرون نے صحابۂ کرام

اهل بیت رسول اور مشائخ طریقت کو اپنی شاعری کا موضوع بنانے کے لئے قرآن و حدیث اور کتب سیرت کا مطالعہ کیا۔ سامعین کو بھی شاعری سے پورا پورا لطف‌اندوز ہونے اور اشاراتی زبان کو سمجھنے کے لئے مطالعہ مذهب کی ضرورت کا احساس ہوا اور اس طرح منقبت نگاری مذهب کی تبلیغ و اشاعت کا وسیلہ بن گئی ۔

قصیدہ منقبت نگار شاعروں کی پسندیدہ صنف شاعری رہی ہے کیونکہ تعریف و توصیف بیان کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی صنف شاعری نہ تھی۔ یہ شاعر کے لئے ایک کھلا میدان تھا جہاں وہ اپنی فنی صلاحیتوں اور شعری کمالات کا کھل کر اظہار کر سکتا تھا۔ مثنوی کو فروغ حاصل ہوا تو خیر و برکت کے لئے اس کا آغاز حمد ، نعت اور منقبت سے کیا گیا۔ یہ طرز عمل مثنوی نگاری میں رچ بس کر اس کا ایک حصہ بن گیا اور مسلمان شاعروں کے علاوہ غیر مسلم شاعروں نے بھی اس روایت کی پاسداری کی اور حمد و نعت کے ساتھ ساتھ منقبت میں بھی عمدہ شعر نکالے۔

غزل داخلی جذبات کے اظہار کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ جن شاعروں کا اپنے ممدوحین کے ساتھ جذباتی لگاؤ زیادہ تھا انہوں نے غزل کے اشعار میں مدحیہ مضامین کے علاوہ اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کیا۔ بعض شاعروں نے اپنے ممدوحین کے ناموں کو بطور ردیف استعمال کیا جس سے ممدوح کا اندازہ لگانا آسان ہوگیا۔ بعض شاعروں کے ہاں تو یہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہو گیا کہ شاعر کا محبوب کوئی مذہبی شخصیت ہے یا کوئی پری پیکر معشوق اس پردہ زنگاری میں بول رہا ہے۔

قصیدہ، مثنوی اور غزل منقبت نگاروں کی مرغوب اصناف سخن تھیں۔ ان کے علاوہ مخمس، مسدس، ترکیب بند ، ترجیع بند ، قطعہ، رباعی میں بھی مناقب لکھے گئے اور سند قبولیت پائی۔ منقبت شاعری کی موضوعاتی صنف ہے۔ اس کا موضوع اور مضمون اس کی پہچان ہے۔ مذہبی شاعری کی عام طور پر یہی صورت ہے۔ حمد اور نعت بھی اپنا کوئی مخصوص شعری پیکر نہیں رکھتی۔ شاعر اپنی سہولت کے لئے جو صنف چاہتا ہے اختیار کر لیتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا چراغ بجھ گیا۔ ان کی حیثیت بساط سیاست پر پٹے ہوئے مہروں سے زیادہ نہ تھی۔ سیاسی زوال کے ساتھ معاشی، معاشرتی اور اخلاقی قدریں بھی دم توڑنے لگتی ہیں۔ مسلمانوں کو بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ قوم کو

اس دلدل سے باہر نکالنے کے لئے سرسید اور ان کے رفقا کی کاوشیں قابل صد تحسین ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو توہمات کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں لانے کی کوشش کی اور تعقل پسندی کے اس دور میں دین کی عقلی توجیہات پیش کرکے ضعیف الاعتقادی اور جہالت پر ضرب کاری لگائی۔ چنانچہ مذہبی حلقوں میں اس بات کو شدت سے محسوس کیا جانے لگا کہ بزرگان دین کے کشف و کرامات اور محیرالعقول کارناموں کی بجائے ان کے بشری پہلوؤں کو سامنے لا کر عوام کو درس تقلید دیا جائے کیونکہ وقت کا تقاضا بھی تھا۔ چنانچہ اقبال، جوش اور حفیظ منقبت نگاری کے اس نئے رجحان کے نمائندہ شعراء کی حیثیت سے سامنے آئے اور انہوں نے مذہبی شاعری کے حوالے سے عوام کو غیرملکی حاکموں کے خلاف ابھارنے اور حصول آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کی تلقین کی۔

زمانہ ماضی ہو یا حال منقبت نگار شعراء اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرتے رہے ہیں۔ جب بادشاہت کا سلسلہ قائم تھا۔ امراء و روساء کے دربار بھی لگتے تھے تو قصیدہ مقبول ترین صنف شاعری تھی۔ شاعر امرا و سلاطین کے قصیدے لکھ کر دنیوی دولت سمیٹتے تھے اور بزرگان دین کی مدح سرائی سے خیر و برکت اور نجات اخروی کے سامان خریدتے تھے۔ دربار ختم ہونے تو دنیوی ممدوحین کی قصیدہ نگاری کو زوال آ گیا۔ لیکن مذہبی قصیدہ نگاری اپنی جگہ قائم رہی۔ کیونکہ جو شخصیات اس قصیدہ نگاری کا موضوع تھیں وہ لازوال تھیں۔

جو لوگ اللہ تعالی کے ہو جاتے ہیں، اس کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں، اللہ تعالی ان کی یاد کو لوگوں کے سینوں میں زندہ رکھتا ہے۔ یہ شخصیات صرف مسلمانوں میں ہی قابل احترام نہیں سمجھی جاتیں بلکہ غیر مسلم بھی ان کی قدر و منزلت کرتے ہیں اور ان کے فیوض سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ لہذا منقبت نگاری ایک ایسی صنف شاعری ہے جو اپنے موضوع کی طرح لازوال ہے اس کی ہیئتیں بدلتی رہی ہیں۔ کسی شاعر نے اظہار عقیدت کو قصیدے کا رنگ دیا کسی نے قطعہ کا، کسی نے اپنے جذبات کو غزل کے آبگینے میں ڈھالا، کسی نے رباعی کے روپ میں، کسی نے مثنوی کا بیانیہ انداز اپنایا کسی نے مخمس یا مسدس کا غرض منقبت نگاری مختلف روپ اختیار کرتی رہی لیکن اس نے اپنے وجود کو برقرار رکھا۔ آج کے دور میں جب کہ آزاد نظم مقبول ہے اور نثری نظم کے چرچے ہو رہے ہیں بعض شاعروں نے نظم آزاد اور نثری نظم میں بھی مناقب لکھے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس

صدف شاعری مین زندہ رھنے کے کتنے قوی امکانات موجود ھین اور جب تک یہ دنیا بزرگان دین سے خالی نہین ھو جاتی اور جب تک مذھب انسانیت کی روحانی فلاح کا ضامن ھے اور جب تک شاعری کا فین زندہ ھے مناقب لکھے جاتے رھین گے -

----

اختتامیہ

اردو شاعری کے ہر دور میں مناقب لکھے گئے ہیں لیکن اردو منقبت نگاری کا عہد بہ عہد جائزہ لینے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اس مقالے میں اردو شاعری کی ابتدا سے لے کر عصر حدید تک کی منقبت نگاری کے اہم رجحانات پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور بطور صنف سخن اس کی حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں منقبت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم سے بحث کی گئی ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی سوراخ کرنے، پھاڑنے یا کرید اور جستجو کرنے کے ہیں اور وہ صفات جو چھان بین اور کرید کے بعد معلوم ہوں ان کو بھی منقبت کہتے ہیں۔ اس کے اصطلاحی معنی صحابہ کرام، اہل بیت اور اولیائے کرام کی مدح ہے۔ یہی عالی قدر ہستیاں منقبت کا موضوع ہیں۔ ان کی تعریف و توصیف قرآن مجید اور کتب احادیث میں بھی آئی ہے جب کہ بعض دوسرے شاعروں نے کسی خاص مقصد کے تحت مقصدی مناقب کہے ہیں۔ ان مناقب میں بزرگان دین سے عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے ذکر سے حصول ثواب اور نجات اخروی پیش نظر ہوتی ہے۔ اپنے مصائب میں ان سے اعانت طلب کی جاتی ہے ۔ بالواسطہ رسول اکرمؐ سے اظہار محبت کیا جاتا ہے کیونکہ تمام بزرگان دین صرف حضور اکرمؐ سے نسبت کی وجہ سے محترم و مکرم ہیں۔ بعض دفعہ مخالفین نے ان بزرگوں کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیا تو شعرا نے ان کے ناموس کے تحفظ کے لئے مناقب لکھے۔

(منقبت مذہبی شاعری سے پھوٹنے والی ایک اہم شاخ ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک مذہب شاعری کے دائرے کو محدود کر دیتا ہے اور اس قسم کی شاعری اعلیٰ درجے کی شاعری نہیں ہوتی کیونکہ اس میں شاعر ایک مبلغ کے روپ میں سامنے آتا ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ حمد ، نعت اور منقبت داخلی شاعری کے مختلف روپ ہیں جن کی بنیاد جذبۂ محبت ہے۔ یہاں شاعر نظریات کی تبلیغ نہیں کرتا بلکہ ذات حقیقی، صحابہ کرام، آئمہ عظام اور اولیائے ذی احتشام کے ساتھ اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتاہے۔ منقبت نگاری کے محرکات کے طور پر بزرگان دین کے اعراس ، محافل سماع، منقبتی مشاعرے، اور اخبارات و رسائل کے قومی اور ملی ایڈیشن قابل ذکر ہیں۔ منقبت ، سلام، قصیدہ اور مرثیہ سے مختلف

صنف سخن ہے ۔ سلام کا بنیادی مقصد حضور اکرمؐ ، شہدائے کربلا اور بزرگان دین پر درود وسلام بھیجنا ہوتا ہے۔ قصیدے میں درباری اور مذہبی مداحی ہوتی ہے۔ مرثیہ ایک ایسی نظم ہے جس میں شہدائے کربلا اور ان کے متعلقین کے مصائب کا بیان کرکے ماتم کا سامان پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ تینوں اقسام شعر اپنی مخصوص ہیئت رکھتی ہیں جبکہ منقبت کی اپنی کوئی خاص ہیئت نہیں ہے۔ یہ شاعری کی عروضی نہیں موضوعاتی تقسیم کا نتیجہ ہے۔ یہ غزل ، قصیدہ ، مخمس، مسدس، ترکیب بند ، ترجیع بند ، رباعی ، قطعہ کسی بھی پیکر میں ڈھل سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے زیادہ تر قصیدے ہی کے عروضی ڈھانچے کو اختیار کیا گیا ہے۔

اردو شاعری فارسی کے زیراثر پروان چڑھی اور فارسی نے عربی کے اثرات قبول کئے۔ چنانچہ اردو منقبت نگاری کے تفصیلی جائزے کے لئے عربی اور فارسی منقبت نگاری کی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے ـــ اس کی روشنی میں اردو منقبت نگاری کے رجحانات پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ باب دوم کا موضوع یہی ہے۔ عربی اور فارسی منقبت نگاری کا عہد بہ عہد ذکر اس مقالے میں ممکن نہیں تھا صرف چند ممتاز اور نمائندہ شاعروں کے خاص رجحانات اور اسالیب کے تعارف پر اکتفا کیا گیا ہے مگر اس نکتے کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ ان دونوں زبانوں کی منقبت نگاری کا ہلکا سا خاکہ ذہن میں آ جائے۔ عربی منقبت نگاری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ منقبت نگاری کا آغاز کب اور کن حالات میں ہوا اور اس کا رنگ ڈھنگ کیا تھا اور فارسی میں اس کی نشوونما پانے اور ارتقا کی منزلیں طے کرنے کے اسباب کیا تھے اور تصوف نے اس پر کیا اثرات ڈالے ۔

اردو منقبت نگاری کا دکنی دور اس مقالے کے تیسرے باب کا موضوع ہے۔ اس دور کی شاعری کا مجموعی رنگ مذہبی ہے۔ صوفیاء نے اپنے افکار کی تبلیغ کے لئے مقبول راگ راگنیوں سے بھی کام لیا اور اس طرح جکری معرض وجود میں آئی جو ذکری کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور اپنے اظہار اور ادائیگی کے اعتبار سے راگ کی ایک قسم ہے۔ اس کے علاوہ حقیقت کے نام سے صوفیانہ نظمیں بھی لکھی گئیں۔ خدا کی حمد بیان کرنے ، اہل بیت رسول کی توصیف اور بزرگان دین کی مدح کو کارثواب سمجھنے کے سبب حمد ، نعت اور منقبت کو فروغ حاصل ہوا۔ مثنوی اس دور کی مقبول صنف شاعری تھی۔ اس کا آغاز حمد خدائے ذوالجلال ، نعت رسول مقبول اور منقبت صحابہ کرام، آئمہ عظام اور اولیائے ذی شان سے ہوتا تھا۔

اس دور مین منقبت نگاری کے تین واضح رجحان ملتے ھین -

۱- خلفائے راشدین کی منقبت

۲- اھل بیت کی منقبت

۳- مشائخ طریقت کی منقبت

چوتھا باب شمالی ھند مین منقبت نگاری سے بحث کرتا ھے اور اس مین سودا- میر- قائم چاندپوری - میر حسن - مصحفی - جوشش عظیم آبادی- غالب - مومن - بہادرشاہ ظفر- امیر مینائی اور داغ کی منقبت نگاری کی روشنی مین دبستان دھلی کی منقبت نگاری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ھے- اس دور کے شاعرون نے منقبت نگاری کے لئے قصیدے کے علاوہ غزل ، مثنوی ،مخمس ،مسدس، ھفت بند سبھی اصناف مین طبع آزمائی کی- دکنی دور مین منقبت نگاری کے جو تین رجحانات واضح ھوئے تھے وہ اس عہد مین بھی موجود ھین- اس دور مین منقبت ایک واضح صنف سخن کے طور پر نمایان ھوئی-

اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے والون نے اردو ادب کو دو دبستانون مین تقسیم کر رکھا ھے- دبستان دھلی اور دبستان لکھنؤ - نظیر اکبرآبادی ان دونون مین سے کسی مکتبۂ فکر سے وابستہ نہین ھین- ان کی ایک انفرادی حیثیت ھے اسلئے ان کا ذکر پانچوین باب مین الگ کیا گیا ھے- وہ ایک خوش طبع انسان تھے- بزم آرائیون کو پسند کرتے تھے- مسلمان بزرگان دین کے اعراس ھون تو وھان موجود اور اگر ھندوؤن کے تہوار ھولی یا دیوالی ھون وھان بھی حاضر- اس لئے ان کے یہان مضامین و موضوعات کا بڑا تنوع پایا جاتا ھے- انہون نے حضرت علی کے علاوہ شہنشاہ اکبر کے دور کے صوفی بزرگ سلیم چشتی کی مدح مین اشعار کہے ھین اور کرشن جی کے بچپن کو بھی اپنا موضوع بنایا ھے-

-----

لکھنؤ کی شاعری کا اصل کمال مرثیہ گوئی مین کھلتا ھے- لکھنؤ کی مرثیہ گوئی محض آہ و بکا کا نام نہین بلکہ اس مین جملہ اصناف شاعری کی خصوصیات سمٹ آئی ھین اور اس طرح یہ داخلی اور خارجی شاعری کا خوبصورت امتزاج بن گئی ھے- میر ضمیر، انیس اور دبیر اس دبستان کے نمائندہ مرثیہ گو ھین- ان کے مرثیون مین مدح کا رنگ بڑا گہرا ھے- انہون نے اھل بیت اور ان کے متعلقین کے اخلاق کریمہ اور فضائل جمیلہ کا ھی ذکر نہین کیا بلکہ ان کے قد و قامت اور خد وخال

کو بھی مدح کا موضوع ٹھہرایا ہے اور اس طرح لکھنؤ نے منقبت نگاری کو ایک نیا انداز عطا کیا۔ مرثیہ گوئی کے علاوہ منیر شکوہ آبادی اور امیر مینائی اور عزیز لکھنوی کے قصائد بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ منیر کے مناقب مضمون آفرینی اور باریک بینی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ انہوں نے ان مناقب میں اپنے ذاتی حالات کے علاوہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کو بھی سمیٹ لیا ہے۔ امیر مینائی لکھنؤ کے پرتکلف ماحول میں رہتے ہوئے بھی تصنع اور بناوٹ سے بچے رہے۔ ان کی شاعری میں دہلوی شعرا کے رنگ و آہنگ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ عزیز لکھنوی کے مدحیہ قصیدوں میں قدما، متوسطین اور متاخرین کے رجحانات کی مجموعی جھلک ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے قصائد کے مخصوص نام رکھے۔ انہوں نے لکھنؤ کی خارجی شاعری میں داخلیت کا رنگ شامل کرکے لکھنوی شاعری کو نئی جہت سے آشنا کیا۔

آخری باب میں عصر جدید کی منقبت نگاری پر بحث کی گئی ہے۔ اس دور کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے ہوتا ہے۔ اس دور میں سرسیّد احمد خان اور ان کے رفقا نے مسلمانوں کو ایک نیا انداز فکر دیا اور وہ تصورات کی دنیا سے نکل کر حقائق کے میدان میں آ گئے۔ عقلیت پسندی کا آغاز ہوا۔ شعرا اپنے ممدوحین کے روحانی تصرفات اور کرامات کو چھوڑ کر ان کی بشری خوبیوں کو نمایاں کرنے لگے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے گرد و پیش کی ابتر صورت حال کو بھی اپنی نظموں میں سمونے لگے۔ یہ اس دور کا عمومی رنگ تھا جس کی ترجمانی علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری اور حفیظ جالندھری کر رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مولانا احمد رضا خان اور حسرت موہانی، منقبت نگاری کے پرانے رنگ کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ سیاسی اور سماجی انحطاط کے سبب ان کے ہاں ماحول سے بیزاری کا اظہار ہے اور اس سے نجات کے لئے اپنے ممدوحین سے اعانت طلبی کا رجحان بھی موجود ہے۔

عصر حاضر میں بھی مناقب لکھے جا رہے ہیں اور منقبت نگاری کے جو رجحانات دکنی دور کے شاعروں نے متعین کئے تھے وہ آج کے شعرا کے ہاں بھی موجود ہیں۔ اس دور میں جن شعرا نے منقبت نگاری کو اپنا شعار بنایا ان میں عبدالعزیز خالد، جعفر طاہر، قیصر بارہوی، محسن نقوی، عطا حسین کلیم، جوہر نظامی، حافظ مظہرالدین، حفیظ تائب، محمد افضل فقیر، حافظ لدھیانوی، نصیرالدین

نصیر، صائم چشتی، راجا رشید محمود اور سرور بجنوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے جعفر طاہر، قیصر بارہوی، جوہر نظامی، محسن نقوی اور عطاحسین کلیم نے مناقب اہل بیت پر اپنا زور قلم صرف کیا ہے اور عبدالعزیز خالد، حافظ مظہرالدین، محمد افضل فقیر، حافظ لدھیانوی، راجا رشید محمود، حفیظ تائب، صائم چشتی اور سرور بجنوری نے اہل بیت کے علاوہ خلفائے راشدین اور بزرگان دین کی مدح و ستائش میں بھی اشعار کہے ہیں ۔

کتابیات

سن طباعت	مطبوعہ	کتاب		مصنف / مرتب / مترجم
1955	المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ ایران	العمدہ	1	ابنِ رشیق
	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	مثنوی پھول بن	2	ابنِ نشاطی
	ترجمان القرآن	تفہیم القرآن	3	ابوالاعلیٰ مودودی
	ایچ ایم سعید کمپنی کراچی	التنبیہ والاشراف	4	ابوالحسن علی بن حسین بن المسعودی ترجمہ۔ مولانا عبداللہ العماری
	پاکستان	الرسائل القشیریہ	5	ابوالقاسم القشیری ترجمہ۔ ڈاکٹر پیر محمد حسن
1952	اردو مرکز لاہور	جرأت۔ اس کا عہد اور عشقیہ شاعری	6	ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر)
1957	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	نظیر اکبر آبادی۔ ان کا عہد اور شاعری	7	ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر)
	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	لکھنؤ کا دبستان شاعری	8	ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر)
	شیخ مبارک علی تاجران کتب لاہور	مصحفی اور ان کا کلام	9	ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر)
1957	دانش محل لکھنؤ	انیس کی مرثیہ نگاری	10	اثر لکھنوی
1982	مکتبہ میری لائبریری لاہور	انیس ایک مطالعہ	11	اعجاز نقوی (ڈاکٹر)
1951	اردو اکیڈمی لاہور	مرثیہ نگاری اور میر انیس	12	احسن فاروقی
1972	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	تاریخ ادب عربی	13	احمد حسن زیات (استاد) ترجمہ۔ عبدالرحمٰن طاہر سورتی
		الدمن والعلی	14	احمد رضا خان (مولانا)
		مسائل سماع	15	احمد رضا خان (مولانا)

مصنف / مرتب / مترجم		کتاب	مطبوعہ	سن طباعت
احمد رضا خان (مولانا)	16	حدائق بخشش کامل	مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی	
احمد فاروقی (ڈاکٹر، خواجہ)	17	میر تقی میر۔ حیات اور شاعری	انجمن ترقی اردو ہند	1954
ارسطو ترجمہ۔ عزیز احمد	18	بوطیقا	مکمل پاکستان انجمن ترقی اردو کراچی	1941
اشرف علی تھانوی (مولانا)	19	نشر الطیب	تاج کمپنی کراچی	
اعجاز حسین (ڈاکٹر)	20	مذہب و شاعری	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	1955
افسر صدیقی امروہوی، سرفراز علی رضوی (سید)	21	مخطوطات انجمن ترقی اردو (حصہ اول، دوم)	انجمن ترقی اردو پاکستان	1967
افسر صدیقی امروہوی	22	مصحفی۔ حیات و کلام	مکتبہ نیا دور کراچی	1975
آغائے رازی	23	مقدمہ و تصحیح منطق الطیر از عطار	ایم فرمان علی بک سیلرز موہن لال روڈ لاہور	
اقتدا حسن	24	کلیاتِ قائم اول، دوم	مجلس ترقی ادب لاہور	1965
اقبال	25	کلیاتِ اقبال	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	
الطاف حسین حالی	26	یادگارِ غالب	۔ ایضاً ۔	
الف ثانی (مجدد)	27	مکتوبات		
امداد امام اثر (سید)	28	کاشف الحقائق حصہ اول، دوم	مکتبہ معین الادب لاہور	
امیر خسرو	29	مثنوی شیریں و خسرو	مسلم یونیورسٹی علیگڑھ	1927
امیر خسرو	30	مطلع الانوار (مثنوی)	ایضاً	1926

نمبر	مصنف / مرتب / مترجم	کتاب	مطبوعہ	سن طباعت
31	امیر مینائی	١- محامد خاتم النبیین ٢- مرأۃ الغیب	نول کشور لکھنؤ — ایضاً —	1289ھ "
32	اے ڈی نسیم	اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر	مقالہ غیر مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور	
33	بندہ نواز گیسو دراز (خواجہ) مولانا حسن علی دہلوی	خاتمہ ترجمہ آداب المریدین	الکتاب لاہور	1977
34	تارا چند (ڈاکٹر) ترجمہ محمد مسعود احمد	تمدن ہند پر اسلامی اثرات	مجلس ترقی ادب لاہور	1964
35	جلال الدین احمد جعفری	تاریخ قصائد اردو	ادارہ مصنفین پاکستان کراچی	
36	جلال الدین سیوطی (علامہ)	خصائص الکبریٰ (اول دوم)	مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی	1978
37	جلال الدین سیوطی (علامہ)	تاریخ الخلفاء	نفیس اکیڈمی	
38	جمیل جالبی (ڈاکٹر)	تاریخ ادب اردو (اول دوم)	مجلس ترقی ادب لاہور	1982
39	جوش ملیح آبادی	آیات و نغمات	مکتبہ اردو لاہور	1944
40	جعفر طاہر	سلسبیل	حلقہ ارباب غالب جھنگ	
41	جوش	طلوع فکر	کراچی	1957
42	جمیل مظہری	عرفان جمیل	بارگاہ ادب لاہور	1969
43	چاند شیخ	سودا	مکتبہ اردو ادب لاہور	1972
44	حامد حسن قادری (پروفیسر)	داستان تاریخ اردو	آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ	1941
45	حمید احمد خان (پروفیسر)	دیوان غالب۔ نسخہ حمیدیہ	مجلس ترقی ادب لاہور	1969

مصنف / مرتب / مترجم		کتاب	مطبوعہ	سن طباعت
حسین سحر	46	باب العلم	مجلس اہلِ قلم ملتان	1980
حفیظ جالندھری	47	شاہنامہ اسلام	نوری پبلیکیشنز کراچی	1980
حسن ثانی نظامی (خواجہ)	48	تذکرہ نظامی	خواجہ اولاد کتاب گھر نئی دہلی	1973
حسرت موہانی	49	کلیاتِ حسرت موہانی	کتاب منزل لاہور	1956
خلیق انجم	50	مرزا محمد رفیع سودا	انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ	
خلیق نظامی	51	تاریخ مشائخ چشت	ندوۃ المصنفین دہلی	1953
خلیل الرحمٰن داؤدی	52	اُردو کی قدیم منظوم داستانیں	مجلس ترقی ادب لاہور	1967
رشید احمد صدیقی (پروفیسر)	53	غالب کی شخصیت اور شاعری	چوہدری اکیڈمی لاہور	
رضا زادہ شفق (ڈاکٹر)	54	تاریخ ادبیات ایران	ندوۃ المصنفین دہلی	1955
رفیع الدین اشفاق (ڈاکٹر سید)	55	اُردو میں نعتیہ شاعری	اُردو اکیڈمی سندھ کراچی	1976
رئیس احمد جعفری	56	بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد	کتاب منزل لاہور	
رئیس احمد جعفری	57	واجد علی شاہ اور ان کا عہد	— ایضاً —	
ریاض مجید (ڈاکٹر)	58	اُردو نعت	مقالہ غیر مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور	
رام بابو سکسینہ	59	ہسٹری آف اُردو لٹریچر	شرف پبلشنگ ہاؤس لاہور	
زبیدہ تسلیم یاسمین (ڈاکٹر)	60	میر شکوہ آبادی	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1970

مصنف / مرتب / مترجم		کتاب	مطبوعہ	سن طباعت
سجاد باقر رضوی	61	مغرب کے تنقیدی اصول	کتابیات لاہور	1966
سخاوت مرزا	62	قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض	مضمون مطبوعہ: رسالہ اردو کراچی	1950
سعدی شیرازی (شیخ)	63	بوستانِ سعدی		
سلام سندیلوی (ڈاکٹر)	64	اردو رباعیات	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1963
سلام سندیلوی (ڈاکٹر)	65	ادب کا تنقیدی مطالعہ	میری لائبریری لاہور	1963
سلیم عبداللہ	66	مثنوی سحر البیان	اردو اکیڈمی سندھ	1955
سنائی	67	دیوان سنائی غزنوی	کتابخانہ ابن سینا تہران	1341ھ
سید احمد خان	68	آثار الصنادید	نول کشور لکھنؤ	
سجاد ظہیر	69	ذکر حافظ	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	1956
سعید احمد سعید کاظمی (علامہ)	70	مقالات کاظمی	شرکت حنفیہ لمیٹڈ لاہور	1398ھ
شبلی نعمانی	71	شعر العجم جلد اول تا پنجم	مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ	1951
شبلی نعمانی	72	الغزالی	شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور	
شبلی نعمانی	73	علم الکلام اور الکلام	مسعود پبلشنگ ہاؤس کراچی	1964
شبلی نعمانی	74	موازنہ انیس و دبیر	عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور	
شمیم احمد	75	درسِ بلاغت	تالیف ترقی اردو بیورو نئی دہلی	

مصنف / مرتب / مترجم		کتاب	مطبع	سن طباعت
شہاب الدین سہروردی، ترجمہ شمس بریلوی	76	عوارف المعارف	مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی	1977
شہاب الدین (شیخ سید)، ترجمہ علامہ صارم ازہری	77	شاہد مقبول لفضل اولادِ رسولؐ	مکتبہ محمودیہ [illegible]	1979
شیخ عبدالقادر جیلانی، ترجمہ احمد صاحب مدراسی	78	غنیۃ الطالبین	مکتبہ رحمانیہ لاہور	1394ھ
شمس الدین صدیقی (ڈاکٹر)	79	کلیاتِ سودا (اول دوم)	مجلس ترقی ادب لاہور	1976
صابر علی خان (ڈاکٹر)	80	سعادت یار خان رنگین	انجمن ترقی اردو پاکستان	
صابر علی لودھی	81	اردو مثنوی کا دکنی دور	مقالہ غیر مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری	
صدیق حسن خان (نواب)	82	الشمامۃ العنبریہ من مولدِ خیر البریہ		
صفدر حسین (ڈاکٹر)	83	۱) رزم نگارانِ کربلا ۲) نادراتِ مرزا دبیر	سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ایضاً	1977 1975
ظہور الحسن شارب (ڈاکٹر)	84	دلی کے بائیس خواجہ	حامد اینڈ کمپنی اردو بازار لاہور	1980
عابد علی عابد (سید)	85	اصول انتقاد ادبیات	مجلس ترقی ادب لاہور	
عبادت بریلوی (ڈاکٹر)	86	مومن اور مطالعۂ مومن	شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور	1961
عبدالحق (ڈاکٹر)	87	قدیم اردو	کل پاکستان انجمن ترقی اردو کراچی	1961
عبدالحق محدث دہلوی	88	اخبار الاخیار فی اسرار الابرار (اردو ترجمہ)		1975
عبدالحق (مولوی)	89	اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ	انجمن ترقی اردو کراچی	1977
عبدالرحمٰن جامی (مولانا)	90	کلیاتِ جامی	شعاعِ ادب لاہور	1960

مصنف/مرتب/مترجم		کتاب	مطبع	سن طباعت
عبد الرحمٰن جامی (مولانا)	91	نفحات الانس مع سلسلۃ الذہب	شیخ الٰہی بخش محمد جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار لاہور	1927
عبد السلام ندوی	92	۱۔ شعر الہند حصہ اول دوم ۲۔ اقبال کامل	مطبع معارف اعظم گڑھ —— ایضاً ——	1949 1948
عبد العزیز شاہ ترجمہ محمد ایوب قادری	93	فضائل صحابہ و اہل بیت	قومی کتب خانہ لاہور	1967
عبد اللہ (ڈاکٹر سید)	94	اردو مثنوی کا دکنی دور (مضمون)	اورینٹل کالج میگزین لاہور	فروری 1953
عبد اللہ (ڈاکٹر سید)	95	نقد میر	اردو مرکز لاہور	1964
عبد اللہ (ڈاکٹر سید)	96	مباحث	مجلس ترقی ادب لاہور	1965
عبد اللہ (ڈاکٹر سید)	97	مقالہ:- اردو کی تعمیر میں خان آرزو کا حصہ	اورینٹل کالج میگزین لاہور	1942
عبد اللہ عباس ندوی (ڈاکٹر)	98	عربی میں نعتیہ کلام	میزان ادب کراچی	1978
عراقی	99	دیوانِ عراقی		
عزیز لکھنوی	100	صحیفۂ ولا	صدیق بک ڈپو لکھنؤ	
علی عباس جلال پوری	101	مقالات جلال پوری	آئینہ ادب لاہور	1979
علی ہجویری (داتا)	102	کشف المحجوب	اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور	1983
عبد العزیز خالد	103	ثانی لاثانی	ارمغان اکیڈمی لاہور	1980
عبد العزیز فرہاروی (مولانا)	104	احوال ابدال	مکتبہ بنوریہ گنج بخش روڈ لاہور	1396ھ
غالب	105	کلیاتِ غالب فارسی	شیخ غلام علی لاہور	1965

	مصنف/مرتب/مترجم	کتاب	مطبوعہ	سن طباعت
106	نعیم احمد فیصل	انتخاب احتشام حسین	لاہور اکیڈمی لاہور	
107	فخر دین نظامی (مرتبہ جمیل جالبی ڈاکٹر)	مثنوی نظام دکنی کدم راؤ پدم راؤ	انجمن ترقی اردو کراچی	1973
108	فیاض محمود	تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند جلد ہشتم	پنجاب یونیورسٹی لاہور	
109	کلب علی خان فائق	مومن حالات زندگی	مجلس ترقی ادب لاہور	1976
110	کلیم الدین احمد	اردو شاعری پر ایک نظر	اردو مرکز پٹنہ	
111	مارٹن لنگز ترجمہ چوہدری صفدر علی	تصوف کیا ہے	قرطاس فیصل آباد	1983
112	مالک رام (ڈاکٹر)	ذکر غالب	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی	1955
113	مبارز الدین رفعت (سید)	کلیات شاہی	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	1962
114	مجنوں گورکھپوری	ادب اور زندگی	مکتبہ دانیال	1969
115	محمد اقبال (پروفیسر)	فردوسی کا مذہب جزو اول	رسالہ اردو حیدر آباد	اکتوبر 1924
116	محمد اکرم (شیخ)	موج کوثر	فیروز سنز لاہور	1963
117	محمد اکرم (شیخ)	آب کوثر	فیروز سنز لاہور	1968
118	محمد اکرم (شیخ)	رود کوثر	فیروز سنز لاہور	
119	محمد باقر آگاہ	ہشت بہشت	مطبع حیدری بمبئی	
120	محمد بن سعد ترجمہ۔ عبداللہ العماری	طبقات ابن سعد	نفیس اکیڈمی کراچی	

	مصنف/ مرتب/ مترجم	کتاب	مطبوعہ	سن طباعت
121	محمد حسین آزاد	آبِ حیات	شیخ مبارک علی لاہور	
122	محمد رحیم بخش دہلوی (مولانا)	حیاتِ ولی	المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ لاہور	1955
123	محمود الٰہی (ڈاکٹر)	اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	1973
124	محمود بحری (قاضی)	مثنوی من لگن	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	
125	محمود شکری آلوسی	بلوغ الادب	مرکزی اردو بورڈ لاہور	1967
126	محمود شیرانی (حافظ)	پنجاب میں اردو	مکتبہ معین الادب لاہور	
127	محی الدین قادری زور	دکنی ادب کی تاریخ	اردو اکیڈمی سندھ	1969
128	مسعود حسن رضوی	ہماری شاعری		
129	مسلم ضیائی	غالب کا منسوخ دیوان	ادارہ یادگارِ غالب کراچی	1969
130	منظور حسن ملک (ڈاکٹر)	اردو مرثیے میں مرزا دبیر کا مقام	مقبول اکیڈمی لاہور	1976
131	مقبول بیگ بدخشانی	ادب نامہ ایران	یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور	
132	محمد فاروق خان سیدی	مناقب صدیق اکبر	ادارہ تبلیغ ملتان	
133	منیر شکوہ آبادی	کلیاتِ منیر شکوہ آبادی	مکتبہ نامی گرامی لکھنؤ	1264ھ
134	میر تقی میر	کلیاتِ میر	نول کشور لکھنؤ	
135	مصحفی	کلیاتِ مصحفی	قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری	

مصنف / مرتب / مترجم	نمبر	کتاب	مطبوعہ	سن طباعت
مولانا معنی اجمیری	136	ہمارے خواجہ	بزم معنی شرقی دروازہ اجمیر شریف	1979
محمد حیات خان سیال (پروفیسر)	137	احوال نقد غالب	نذر سنز لاہور	1967
محمد افضل	138	جانِ جہاں	لاہور	1403ھ
ملک شیر محمد خان اعوان	139	نعتیہ شاعری مولانا احمد رضا خان	مرکزی مجلس رضا لاہور	1395ھ
محمود فاروقی	140	میر حسن اور خاندان کے دیگر شعراء	مکتبہ جدید لاہور	1956
محمد ذکریا (مولانا)	141	چشت تاریخ مشائخ	مجلس نشریات کراچی	1335ھ
محمد علی فروغی	142	مواعظ سعدی	کتابفروشی و چاپخانہ بروخیم ایران	
مومن علی خان مومن	143	کلیات مومن اول دوم	مجلس ترقی ادب لاہور	
ناصر خسرو	144	دیوانِ قصائد و مقطعات ناصر خسرو	کتاب خانہ ایران	1307/1308ھ
نجم الدین سلیمانی ترجمہ۔ پروفیسر افتخار احمد چشتی	145	مناقب المحبوبین	اسلامک بک فاؤنڈیشن سمن آباد لاہور	1979
نصرتی (ملک)	146	مثنوی گلشنِ عشق	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	
نصیر الدین ہاشمی	147	دکنی کلچر		
نصیر الدین ہاشمی	148	دکن میں اردو	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	1960
نصیر الدین ہاشمی	149	مقالاتِ ہاشمی		
نظیر اکبر آبادی	150	کلیاتِ نظیر	نول کشور لکھنؤ	

مصنف/مرتب/مترجم		کتاب	مطبوعہ	سن طباعت
نور احمد خان فریدی	151	تذکرہ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی رح	مطبوعہ علما اکیڈمی لاہور	980
نور الحسن ہاشمی	152	دلی کا دبستانِ شاعری	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	966
نور الحسن ہاشمی	153	کلیاتِ ولی	انجمن ترقی اردو کراچی	954
نور بخش توکلی	154	شرح قصیدہ بردہ	نوری بکڈپو لاہور	977
وجہی (ملّا)	155	مثنوی قطب مشتری	انجمن ترقی اردو	
وحید مرزا (ڈاکٹر)	156	خسرو کی ہندی شاعری		
وزیر آغا (ڈاکٹر)	157	تخلیقی عمل	مکتبہ اردو زبان سرگودھا	
وزیر آغا (ڈاکٹر)	158	اردو شاعری کا مزاج	مکتبہ عالیہ لاہور	
ولی اللہ (شاہ) ترجمہ اصغر اطہر	159	انفاس العارفین	نوری بک ڈپو لاہور	
ولی اللہ (شاہ)	160	حجۃ اللہ البالغہ	امرتسر	
وحید قریشی	161	تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند جلد ششم	پنجاب یونیورسٹی لاہور	
وقار عظیم	162	تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند جلد ہفتم	پنجاب یونیورسٹی لاہور	
جوش ملیح آبادی	163	شعلہ و شبنم	اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد	
طاہر فاروقی	164	سیرت اقبال	قومی کتب خانہ لاہور	
قاآنی	165	قصائد قاآنی		
حالی	166	مقدمہ شعر و شاعری	کشمیر کتاب گھر لاہور	

کتبِ لغت

1 المنجد

2 لغات الحدیث

3 جمہرہ اللغۃ

4 تاج العروس

5 لسان العرب

6 فرہنگ آموزگار

7 غیاث اللغات

8 کشف اللغات

9 فرہنگ فارسی

10 لغات کشوری

11 جامع اللغات

12 نسیم اللغات

رسائل

1	نقوش لاہور	میر انیس نمبر
2	افکار کراچی	جوش نمبر
3	افکار کراچی	حفیظ نمبر
4	نگار پاکستان کراچی	حسرت موہانی نمبر
5	نگار پاکستان کراچی	مصحفی نمبر
6	نگار پاکستان کراچی	مومن نمبر
7	نقوش لاہور	میر تقی میر نمبر
8	سویرا لاہور	شمارہ ۱۵ - ۱۱
9	حریر خامہ سندھ یونیورسٹی	قصیدہ نمبر
10	اردو کراچی 1950	
11-	اوراق لاہور مئی جون 1983ء اپریل مئی 1982ء	

تفاسیر

1 تفسیر ابن عباس مع الدر المنثور

2 تفسیر کشاف

3 معالم التنزیل

4 تفسیر الخازن

5 تفسیر فتح البیان

6 تفسیر ابنِ کثیر

7 تفہیم القرآن مولانا مودودی

8 ضیاءُ القرآن پیر سید کرم شاہ

کتب احادیث

1 بخاری

2 ترمذی

3 مسند احمد بن حنبل

4 نسائیؒ

5 صحیح مسلم

6 ابنِ ماجہ

ENGLISH BOOKS

1 A.J. ARBERRY — Classical Persian literature

2 REUBEN LEVY — Persion literature

3 CARLYLE — Sartor Resartus on Heroes & Hero worship-

4 ABDUL GHANI — Life and works of Abdul Qadi

5 MARIE N. SCHEMIL — Mystical dimensions of Isla

6 BROWN — Literary history of Persia

7 Dr. UMAR DAUD POTA — The influence of Persian poe on the development of Persian Pre

8 T.S. ELIOT — Selected Essays

9 C.M. BOWRA — From Virgil to Milton

10 CASSELS Encyclopedia

11 Encyclopedia Britanica

12 The dictionary of English language.